فقہائے ہند

جلد پنجم ——— حصّہ دوم

بارھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹیؒ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

طبع اوّل:	۱۹۸۱
تعداد	۱۱۰۰
مطبع	آر۔ کیو پرنٹرز، داتا دربار لاہور
ناشر	محمد اشرف ڈار (معتمد)
	ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
	کلب روڈ، لاہور

انتساب

ہر اُس شخص کے نام جسے فقہائے ہند کے موضوع سے دلچسپی ہے اور اس نے فکر و تحریر کے ذریعے اس موضوع کو تابش و ضو عطا کی ہے۔

محمد اسحاق بھٹی

فہرست مضامین

م

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس سے قبل فقہائے ہند کی پانچویں جلد کا حصۂ اوّل شائع ہوا تھا، جو خطۂ ہند کے بارھویں صدی ہجری کے ۱۶۲ علماء و فقہا کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ حصّہ حروف تہجی کی ترتیب سے حرف الف سے شروع ہو کر حرف ک پر ختم ہوا تھا۔ اب بہ توفیق الٰہی پانچویں جلد کا حصّۂ دوم پیش کیا جا رہا ہے، جو حرف م سے شروع ہو کر حرف ی پر ختم ہوا ہے اور ۱۰۱ فقہائے کرام اور علمائے عظام کے علمی و فقہی کارناموں کو محیط ہے۔

کتاب کے حصّۂ اوّل کے مقدمے میں ہندوستان کے چھٹے مغل حکمران اورنگ زیب عالمگیر کی زندگی کے مختصر حالات بیان کیے گئے تھے اور علماء و فقہا سے اس کے تعلقات و روابط کی وضاحت کی گئی تھی، نیز بتایا گیا تھا کہ خود اورنگ زیب کے حدودِ علم کس قدر وسیع تھے اور مسائلِ فقہ میں اس کو کس درجے عبور حاصل تھا۔

اورنگ زیب نے قمری حساب سے اکانوے سال تیرہ دن عمر پائی اور پچاس برس دو ماہ ستائیس دن حکومت کی۔ وہ بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کا عدیم المثال بادشاہ تھا اور اس کا دورِ حکومت متعدد اعتبارات سے کامیابی اور کامرانی کا دور تھا۔ اس نے ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ ہندوستان کے اس شہنشاہ نے بسترِ مرگ پر اپنے بیٹوں کو مخاطب کر کے جو آخری الفاظ کہے، ان سے پتھر کا دل بھی موم ہو جاتا ہے اور جس پیرایۂ بیان میں دنیا کی ناپائیداری اور اپنی بے بسی اور حرماں نصیبی کا ذکر کیا ہے اس سے اس کے سخت سے سخت دشمن کا کلیجہ بھی شق

ہونے لگتا ہے۔ اس کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

جب میں پیدا ہوا تو میرے گرد لوگوں کا مجمع تھا اور اب موت کے وقت تنِ تنہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں زندہ ہوں اور کس لیے دنیا میں آیا تھا۔ افسوس کہ مجھ سے مخلوقِ خدا کی بھلائی کا کوئی کام نہ ہو سکا۔ نہیں معلوم کہ میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا اور اس عاصیِ سرتاپا اور آلودۂ گناہ کو بارگاہِ خداوندی میں کس سلوک کا مستحق ٹھہرایا جائے گا۔ اب میں دنیا سے رخصت ہوتا ہوں اور سب کو خدا کی حفاظت میں دیتا ہوں۔ میرے نامور اور سعادت مند بیٹوں کو آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے، نہ لوگوں کا جو بندگانِ خدا ہیں، قتل روا رکھنا چاہیے۔ میری تمام عمر رائیگاں گئی۔ اگرچہ خدا کی یاد ہمیشہ میرے دل میں رہی مگر میں اپنی تیرہ چشمی سے اس نورِ نظر کو پہچان نہ سکا۔ آئندہ مجھے اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں رہی۔ مجھ سے بخار نے مفارقت اختیار کر لی ہے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے۔ لشکریوں میں بدنظمی پھیل گئی ہے اور وہ اسی طرح مایوس و بے یار و مددگار ہیں جیسے کہ میں خود ہوں۔ میرے دل کو چین اور روح کو اطمینان نہیں۔ میں اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا سے دور سمجھتا ہوں۔ جب خود میں نے ہی آس توڑ دی تو دوسروں سے کیا امید رکھ سکتا ہوں۔ تم میری آخری وصیت پر عمل کرو۔ ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کا خون بہنے لگے اور ان کی موت کا وبال مجھ ناکارہ کی گردن پر رہے۔ میں بہت گناہ گار ہوں اور نہیں جانتا کہ کیا کیا عذاب میرے مقدر میں ہیں۔ دنیا میں آتے وقت کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لایا تھا، اب جانے لگا ہوں تو گناہوں کے بوجھ کی بھاری گٹھڑی سر پر لیے جا رہا ہوں۔ میں تم کو اور تمھارے بچوں کو خداوندِ عالم کی حفاظت میں دیتا ہوں اور تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام علیکم۔[1]

اورنگ زیب نے ایک وصیت نامہ لکھا تھا، جس کے چند الفاظ یہ ہیں:

بےکس آمدیم و بےکس رفتیم، خبرے ہمینہ آمدیم و دستیم رفتیم، ہمراہ تابوت نشان و عمود چالی وغیرہ لوازمۂ شاہانہ نمانند۔ حمید الدین خاں کہ صادق الاعتقاد است،

---

[1] واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول ص ۸۵۔

تابوتِ مرا بہ درگاہ شاہ برہان رسانند وجائے قبر بہ دستورِ درویشاں دفن کنند۔[۲]

یعنی اکیلے آئے اور اکیلے جارہے ہیں، ننگے سر آئے اور ننگے سر جارہے ہیں۔ لوازمِ بادشاہی اور علمِ شاہانہ کوئی چیز ساتھ نہیں ہے۔ حمید الدین خاں جو کہ ہمارے ساتھ مخلصانہ تعلقات رکھتا ہے، شاہ برہان کی درگاہ میں جنازہ پہنچادے اور درویشوں کی طرح لوگ مجھے قبر میں دفن کردیں۔

اورنگ زیب کی وفات کے وقت اس کے تین بیٹے زندہ تھے۔ سب سے بڑا محمد معظم، اس سے چھوٹا محمد اعظم اور سب سے چھوٹا کام بخش۔ باپ نے ایک وصیت کے ذریعے سلطنتِ ہند کو ان تینوں بیٹوں میں تقسیم کردیا تھا۔ بڑا بیٹا اس وصیت پر عمل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا بھائی محمد اعظم اس کے لیے تیار نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جاجو کے مقام پر دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق بیٹے بیدار بخت اور والا جاہ مارے گئے۔ محمد معظم سب سے چھوٹے بھائی کام بخش کو بھی باپ کی وصیت کے مطابق اس کا علاقہ دینے پر آمادہ تھا، بلکہ کچھ زیادہ بھی دینے پر رضامند تھا، مگر بدقسمتی سے اس نے بھی یہ بات منظور نہ کی۔ بالآخر معرکۂ کارزار گرم ہوا اور کام بخش شدید زخم کھانے کے بعد وفات پاگیا۔

آگے چل کر مغل بادشاہوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر پیہم خوں ریزیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، بہت سے لائق امرائے سلطنت مارے گئے اور رفتہ رفتہ ملک کے نظم ونسق کے تمام رشتے ایک ایک کرکے ٹوٹ گئے، اور آخر کار اس ملک سے مغل حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ - ۱۷۰۷ء) کے بعد جو دور شروع ہوا، اسے مغل حکومت کے دورِ زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

[۲] واقعاتِ دارالحکومت دہلی حصہ اول ص ۵۸۶

سلسلۂ فقہائے ہند کی پہلی دو جلدوں میں ہم سلطنتِ مغلیہ کے عہدِ عروج کا مشاہدہ کر چکے ہیں، آئیے اب اس کے زمانۂ زوال اور دورِ انحطاط کے بعض افسوس ناک واقعات کا بھی مطالعہ کریں کہ تاریخ، قوموں کے اسی اتار چڑھاؤ کا نام ہے، آج ایک قوم دادِ حکمرانی دے رہی ہے تو کل دوسری اورنگِ سلطنت پر قبضہ جما لیتی ہے۔ تاریخ کے بے رحم ہاتھوں سے کبھی کوئی محفوظ نہیں رہا۔ مغلوں پر بھی تاریخ کا یہ عمل جاری ہوا، اور وہ اس کے خونی پہیوں کی گردش میں آکر رہے۔ ذیل کی سطور میں اختصار کے ساتھ اسی الم انگیز اور اذیت ناک داستان کی بعض تفصیلات بیان کرنا مقصود ہے۔

اورنگ زیب کی وفات یعنی ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۰۶ء تک، سو سال کے عرصے میں مندرجۂ ذیل مغل حکمران تختِ ہندوستان پر بیٹھے:

۱۔ محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اوّل: ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک۔

۲۔ معز الدین جہاں دار شاہ: ۱۷۱۲ء سے ۱۷۱۳ء تک۔ یہ فرخ سیر کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۳۔ فرخ سیر: ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک۔ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ لاولد مرا۔

۴۔ رفیع الدرجات: ۱۷۱۹ء میں صرف چھ ماہ حکمرانی کر کے مرضِ دق سے وفات پائی۔

۵۔ رفیع الدولہ: ۱۷۱۹ء میں صرف تین مہینے حکمران رہا اور وفات پائی۔

۶۔ نیکو سیر: چند روز حکومت کی۔

۷۔ ابو الفتح نصیر الدین روشن اختر محمد شاہ عرف رنگیلا: ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک حکمران رہا۔ (محمد شاہ رنگیلا کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد یکم اکتوبر ۱۷۲۰ء سے ۸ نومبر ۱۷۲۰ء تک صرف ایک مہینہ آٹھ دن ابراہیم بھی تخت نشین رہا۔ اس مختصر مدت میں اس نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کرا لیا تھا)

۸۔ مجاہد الدین ابو النصر احمد شاہ: ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء تک حکومت کی،

اور پھر معزول و مکحول ہوا۔

۹۔ ابو العادل عزیز الدین محمد عالم گیر ثانی: ۱۷۵۴ء سے ۱۷۵۹ء تک تک بادشاہ رہا۔ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

۱۰۔ مرزا عبداللہ عالی گوہر شاہ عالم ثانی: ۱۷۵۹ء سے ۱۸۰۶ء تک حکومت کی۔ ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں نے اس کی سلطنت کو درہم برہم کر دیا تھا اور یہ مغل بادشاہ انگریزوں کی حفاظت میں رہتا تھا۔

یہ دس (بلکہ ابراہیم سمیت) گیارہ مغل بادشاہ ہیں جو ۱۷۰۷ء سے ۱۸۰۶ء تک کے سو سال کے عرصے میں تخت نشینِ ہند ہوئے۔ یہ نہایت افراتفری اور انتہائی بدامنی کا زمانہ تھا۔ بادشاہ بے بس اور مجبورِ محض تھے۔ امرائے سلطنت جو چاہتے کرتے تھے، بادشاہ انھیں کچھ کہنا بھی چاہتے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ بادشاہوں کی کمزوری اور عدم جرأت کی وجہ سے ہندوستان کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم ہو گیا تھا اور مغل حکمرانوں کے تاج کی قدر و منزلت باقی نہ رہی تھی۔ اب تاریخی ترتیب کے ساتھ اس دور کے ضروری واقعات معرضِ تحریر میں لائے جاتے ہیں تاکہ پچھلا سلسلہ بھی قائم رہے اور آئندہ کے حالات بھی سامنے آجائیں۔

شاہ عالم بہادر شاہ اوّل

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول تختِ ہند پر متمکن ہوا۔ یہ ہندوستان کا ساتواں مغل حکمران تھا۔ ۳۰ رجب ۱۰۵۳ھ (۱۴ اکتوبر ۱۶۴۳ء) کو برہان پور میں پیدا ہوا، اور سلطنت و حکومت کی گود میں پرورش پائی۔ کچھ دور اپنے جدِ نام دار شاہ جہان کی حکومت کا دیکھا اور پورا زمانہ باپ کی حکمرانی کا آنکھوں کے سامنے گزرا۔ اس طرح باپ اور دادا دونوں کے زیرِ تربیت رہنے کے مواقع میسر آئے۔ سلطنتِ مغلیہ کی تاریخ میں اسے بہادر شاہ اول کہا جاتا ہے۔

بہادر شاہ نے کچھ ہوش سنبھالا تو قرآن مجید حفظ کیا اور مختلف اساتذہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ فنونِ حرب سے بہرہ ور ہوا، اور آدابِ سلطنت میں دسترس حاصل کی۔ مجموعی اعتبار سے بہادر شاہ اوّل، بلند اخلاق، عمدہ خصال، نرم خو اور حلیم الطبع تھا۔

اورنگ زیب کی وفات کے وقت بہادر شاہ کابل کی ولایت پر متعین تھا اور اس کا چھوٹا بھائی محمد اعظم دکن کی صوبے داری پر مامور تھا۔ محمد اعظم ۱۲ شعبان ۱۰۶۳ھ کو پیدا ہوا تھا اور محمد معظم یعنی بہادر شاہ سے عمر میں دس برس چھوٹا تھا۔ محمد اعظم، اورنگ زیب کی وفات سے بارہ روز بعد ۱۰ ذی الحجہ ۱۱۱۸ھ (۱۴ مارچ ۱۷۰۷ء) کو اعیانِ سلطنت کے فیصلے سے احمد نگر میں باپ کی جگہ سریرِ سلطنت پر بیٹھا۔ بہادر شاہ کو اس کی تخت نشینی کی اطلاع ہوئی، تو ۱۸ ذی الحجہ ۱۱۱۸ھ (۲۲ مارچ ۱۷۰۷ء) کو بھاری لشکر کے ساتھ کابل سے روانہ ہوا، لاہور کے قریب پہنچ کر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور ۱۲ جون ۱۷۰۷ء کو آگرے کے قریب جاجو کے مقام پر آ کر خیمہ زن ہوا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں اس کے باپ اورنگ زیب نے اپنے بھائی دارا شکوہ کو شکست دی تھی۔

ادھر محمد اعظم بھی فوج لے کر احمد نگر سے روانہ ہوا، اور امرائے سلطنت اور ارکانِ حکومت کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ بہادر شاہ کے قریب آ کر پڑاؤ کیا۔ اب دونوں طرف کی فوجیں آگرے اور دھول پور کے درمیان ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑی تھیں اور وہی ساموں گڑھ کا میدان تھا، جہاں ٹھیک اکیاون برس پہلے اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہوا تھا۔

بہادر شاہ طبعاً نرم مزاج اور صلح جو تھا، اس نے ہر چند بھائی کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا اور جنگ سے بچنے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش

تھی کہ باپ کی وصیت پر عمل کیا جائے اور لڑائی سے محفوظ رہا جائے لیکن محمد اعظم اس پر آمادہ نہ تھا، وہ پورے ملک کا خود بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ بالآخر لڑائی ہوئی اور سخت خون ریزی کے بعد بہادر شاہ فتح یاب ہوا اور ہندوستان کا تاج شاہی سر پہ رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ فریقین کی فوج ساڑھے چھ لاکھ کی کثیر تعداد پر مشتمل تھی۔ جنگ کے نتیجے میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق اور شجاع بیٹے بیدار بخت اور والا جاہ مارے گئے، اور بہت سے امرائے مملکت اور ماہرین جنگ قتل ہو گئے، یہ واقعہ اتوار کے دن ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ (۱۸ جون ۱۷۰۷ء) کو پیش آیا۔ یعنی اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے صرف چار مہینے بعد۔

بہادر شاہ کا سب سے چھوٹا بھائی کام بخش تھا اور باپ کے زمانے میں بیجاپور کا والی تھا۔ اس نے اپنے نام کا سکّہ جاری کیا اور خطبے میں بھی اپنا نام شامل کیا۔ بہادر شاہ لشکر کثیر کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا اور حیدرآباد کے قریب جا پہنچا۔ ادھر کام بخش بھی اپنی سپاہ کے ساتھ نمودار ہوا۔ لڑائی کے شعلے بلند ہوئے اور کام بخش کو میدانِ جنگ میں شدید زخم آئے۔ اسی حالت میں گرفتار کر کے اسے شاہی کیمپ میں لایا گیا۔ بہادر شاہ نے اپنے بیٹے معز الدین کو کام بخش کے استقبال کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ اسے اعزاز و اکرام کے ساتھ لایا جائے۔ جب اس کو سخت زخمی حالت میں خیمے میں لایا گیا اور اس کے مرتبے کے مطابق جگہ دی گئی تو وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ بہادر شاہ بھائی کی ملاقات کے لیے آیا اور رقت آمیز لہجے میں کہا:

نمی خواستم کہ شما را چنیں ببینم[۴۳]

یعنی میں آپ کو ایسی حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

---

۴۳ سیر المتاخرین، ج ۲ ص ۳۷۹

کام بخش نے بھی سرد آہ بھر کر بہادر شاہ کو انہی الفاظ میں جواب دیا اور وفات پاگیا۔ "جان بجان آفرین سپرد"۔ ؎

یہ واقعہ ۳ ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ (۱۳ جنوری ۱۷۰۹ء) کو رونما ہوا، اور بہادر شاہ کابل سے لے کر کلکتے کے آخری سرے تک ہندوستان کے وسیع ملک کا بادشاہ بنا۔

شاہ عالم بہادر شاہ اوّل بہت متحمل مزاج بادشاہ تھا۔ وہ علما و صوفیا کی مجالس میں بھی حاضر ہوتا اور ان سے مستفید ہوتا تھا۔ اگر اس قسم کی کسی مجلس میں مزاجِ شاہانہ کے خلاف بھی کوئی بات ہو جاتی تو خاموشی اختیار کر لیتا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ اردو کے مشہور شاعر اور صوفی خواجہ میر درد کے ہاں ہر مہینے اربابِ تصوف کا اجتماع ہوتا تھا۔ اس میں ایک مرتبہ شاہ عالم بلا اطلاع چلا آیا۔ اس روز اس کے پاؤں میں تکلیف تھی اور درد ہو رہا تھا۔ اس لیے ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ میر درد نے بادشاہ کو اس حالت میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا۔ "یہ حرکت فقیر کے آدابِ محفل کے خلاف ہے"۔ بادشاہ شرمندہ ہوا، اور کہا، "معاف کیجیے پاؤں میں عارضہ ہے، اس لیے معذور ہوں"۔ میر درد نے کہا، "عارضہ تھا تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی"۔

یہ ایک مثال ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ دورِ زوال کے مغل بادشاہ بھی علما و صوفیا کی انتہائی قدر کرتے اور ان کے سامنے زبان کو حرکت نہ دیتے تھے۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہو جاتی تو فوراً معذرت طلب کر لیتے تھے۔

مغل دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ بہادر شاہ عالم و فاضل، با مروّت، خوش اخلاق عمدہ کردار کا مالک، عبادت گزار، صاحبِ عزم اور جرأت مند بادشاہ تھا۔ مطالعۂ کتب کا شائق اور علما کا عقیدت مند تھا۔ اصحابِ فضل اور اربابِ کمال

؎ سیر المتاخرین ج ۲ ص ۳۷۹۔

کا احترام کرتا تھا۔ فیاض دل اور نیک طینت تھا۔ عادل و منصف اور غریب پرور تھا۔ فریادی کی دادرسی کرتا اور درخواست گزار اس کے دربار سے مایوس نہ جاتا تھا۔ لیکن تدبّر سے محروم، سیاسی معاملات میں غور و فکر سے عاری اور قوت فیصلہ سے تہی دامن تھا، یعنی اس تلاطم خیز زمانے میں جس چیز کی اصل ضرورت تھی وہ اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کے ان عیوب نے آگے چل کر مغل سلطنت کو بے حد نقصان پہنچایا اور اس کے نظم و نسق کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ بہادر شاہ کی بے بصیرتی اور بے تدبیری کی وجہ سے زیادہ تر تین قومیں اس کی پریشانی کا باعث بنیں:

۱۔ مرہٹے۔

۲۔ سکھ ـــــ اور

۳۔ راجپوت۔

مرہٹوں نے بہادر شاہ کے باپ اورنگ زیب عالمگیر کو بھی ہمیشہ پریشانی میں مبتلا کیے رکھا۔ اگرچہ اس نے بہت حد تک مرہٹوں کو زیر اور ان کے بڑے بڑے ٹھکانوں پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن وہ ان کی جمعیت اور طاقت کو جو بڑا زور پکڑ چکی تھی کلیتہً ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ اس کی وفات کے بعد انھوں نے پھر سر اٹھایا اور میدان میں نکل آئے۔ یہ نہایت بے رحم اور لٹیرے لوگ تھے جو صرف مسلمانوں ہی کے مخالف نہ تھے اور فقط انہی کو ہدفِ ستم نہ بناتے تھے، ہندوؤں کو بھی تنگ کرتے اور ان پر کئی قسم کے ظلم ڈھاتے تھے۔ یعنی بلا استثنا وہ سب کے دشمن اور ہر طبقے کے لیے مصیبت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ان کے بے پناہ مظالم کی وجہ سے تمام لوگ ان سے پریشان تھے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ بہادر شاہ کو ان کے سامنے جھکنا اور مجبوراً علاقۂ دکن کے خراج سے انھیں

حصہ ادا کرنا پڑا۔ یہ پہلی بہت بڑی کمزوری تھی جس کا مرہٹوں کے مقابلے میں بہادر شاہ نے عملاً اظہار کیا۔ ایک مغل تاج دار اور اورنگ زیب عالم گیر کے وارث کا اس طرح مخالف کے سامنے سرنگوں ہو جانا انتہائی افسوس ناک بات تھی۔ آگے چل کر اس کے نہایت تکلیف دہ نتائج نکلے اور ہندوستان کی مغل سلطنت کے اسبابِ زوال میں اسے ایک اہم سبب قرار دیا گیا۔

دوسرا گروہ سکھوں کا تھا جو مغلوں کے لیے سخت پریشانی کا موجب بنا۔ سکھوں کی تاریخ کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں گرو نانک سے ہوتا ہے۔ وہ توحید کی تبلیغ کرتے اور لوگوں کو اللہ کی عبادت کا درس دیتے تھے۔ ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی ان کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ فقیر طبع اور درویش منش آدمی تھے۔

گرو نانک کی وفات کے بعد جو شخص ان کی گدی پر بیٹھا، اس کا نام انگد تھا۔ انگد، گرو جی کا ایک مخلص خادم اور پیروکار تھا۔ وہ تیرہ سال تک لوگوں میں گرو نانک کی تعلیم کا پرچار کرتا رہا۔ انگد کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے ایک ارادت مند امرداس کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ امرداس نے بائیس برس تک اس سلسلے کو چلایا اور اپنے داماد رام داس کو اپنا خلیفہ بنایا، جو سات سال اس مسند پر فائز رہے۔ بعد ازاں ان کے بیٹے گرو ارجن نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ وہ پچیس برس تک اپنے گروؤں کی تعلیم کو پھیلاتے رہے۔ انھوں نے اپنے فرقے کی جتھہ بندی کی۔ پھر ان کے بیٹے گرو ہرگوبند وارث ہوئے اور اڑتیس ۳۸ سال اس مسند پر متمکن رہے اور سکھوں میں فوجی روح پھونکی۔ گرو ہرگوبند نے اپنے بعد اپنے نواسے ہررائے کو اس تعلیم کے فروغ کے لیے مقرر کیا۔ ہررائے سترہ سال اپنے عقیدت مندوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ پھر ان کے بیٹے ہرکشن گدی نشین ہوئے۔ وہ صرف تین سال ہی اپنے فرقے کی قیادت کر پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ ان کے بعد گرو ہرگوبند کے بیٹے گرو

تیغ بہادر سکھ پنتھ کی خدمت کے لیے میدان میں نکلے۔

گرو تیغ بہادر کے زمانے میں اس فرقے کے لوگوں نے صرف بھگتی اور درویشی پر ہی قناعت نہ کی، بلکہ سیاست کے میدان میں اتر آئے۔ ان کے پیرو باقاعدہ مسلح ہو کر وسیع تعداد میں باہر نکلتے اور پوری آزادی سے گروہ کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں گھومتے پھرتے۔ اس طرح یہ لوگ حصول اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور حکومت پر قبضہ کرنے کی غرض سے منظم ہونے لگے۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ لوگوں سے اپنی ضرورت کی چیزیں جبراً وصول کرتے اور ملک میں بدامنی پھیلاتے تھے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسی زمانے میں ایک مسلمان فقیر بھی جس کا نام حافظ آدم تھا، پنجاب میں لوٹ کھسوٹ کرتا پھرتا تھا۔ یہ شخص مسلمانوں کو پریشان کرتا اور گرو تیغ بہادر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو مختلف طریقوں سے ہراساں کرتا تھا۔ شاہی وقائع نگاروں نے اورنگ زیب عالم گیر کو اطلاع دی کہ دو شخص درویشوں اور فقیروں کے بھیس میں رعایا میں خوف و ہراس پیدا کر رہے ہیں اور کچھ لوگ ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اگر ان کے خلاف کارروائی نہ کی گئی اور ان کی سرگرمیوں کو فوری طور پر بند نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر یہ ملک اور حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائیں گے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے ادھر توجہ کی اور لاہور کے صوبے دار کو لکھا کہ اس فتنے کو جس طرح ممکن ہو ختم کیا جائے۔ صوبے دار نے بادشاہ کے حکم پر عمل کیا اور باغیوں کو سزا دی۔ ظاہر ہے جب بادشاہ نے خود اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی بغاوت کو برداشت نہیں کیا تو ان کی بغاوت کو جس کا دائرہ فقر و درویشی کی شکل میں روز بروز وسیع ہو رہا تھا اور امن پسند رعایا جن کے مظالم سے سخت تکلیف میں مبتلا تھی، کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے مسلمان فقیر حافظ آدم کو ملک بدر اور سکھ گرو کو باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان

کی جمعیت منتشر ہو گئی۔

اس کے بعد دسویں گرو گوبند سنگھ کا زمانہ آیا۔ ان کا دور ۱۶۷۵ء سے شروع ہو کر ۱۷۰۸ء تک چلتا ہے۔ انھوں نے دوبارہ سکھ پنتھ کو مسلح اور منظم کیا۔ وہ مذہب جس کی ابتدا فقر و درویشی سے ہوئی تھی، گرو گوبند سنگھ کی کوششوں سے خنجر و شمشیر کا مذہب بن گیا اور اس کے ماننے والے "خالصہ" کا روپ دھار کر تلوار و کرپان ہاتھ میں پکڑ کر میدان میں نکل آئے۔ جب ان کا باغیانہ رویہ حد سے بڑھ گیا تو مجبوراً شاہی فوج حرکت میں آئی، گرو جی بھاگ کر پہاڑی علاقے میں روپوش ہو گئے، لیکن ان کے دو لڑکوں کو گرفتار کر کے بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ وفات سے پہلے گورو گوبند سنگھ مغل فوج میں عہدے دار مقرر ہو گئے تھے اور پھر جب بہادر شاہ کے زمانے (۱۷۰۸ء) میں ایک پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر دکن میں انھیں زخمی کیا تو بہادر شاہ نے ان کے علاج کے لیے شاہی طبیب بھیجا تھا۔

گرو گوبند سنگھ کے بعد ایک اور شخص سامنے آیا، جس نے مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کیے۔ اس کو تاریخ میں بندہ بیراگی، یا بندہ بہادر یا بندہ سنگھ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ شخص در اصل ہندو تھا اور اس کا نام لچھمن داس تھا۔ گورو گوبند سنگھ کے قیام دکن کے زمانے میں یہ ان کے پاس گیا! انھوں نے پوچھا "کون ہو؟" کہا "بندہ"! اس کے بعد یہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

یہ بہادر شاہ اول کا عہد تھا اور مغل حکومت رو بہ زوال ہو چکی تھی۔ بندہ بیراگی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلموں کی ایک جمعیت فراہم کر لی جو سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی، پھر ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور اپنے آپ کو سکھوں کے گروؤں کا خیر خواہ ظاہر کر کے مسلمانوں کو انتہائی ظلم و ستم کا شکار بنایا۔ ان کے بچوں کو قتل کیا، جوانوں کو مارا، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک

کر دیے، بوڑھوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور ان کے گاؤں کے گاؤں جلا ڈالے۔ یہ انتہائی سفاک اور درندہ صفت آدمی تھا۔ اس کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ اس نے متعدد قصبات کو تاراج کیا اور کئی شہروں میں غارت گری کی۔ بے شمار زندہ لوگوں کو آگ میں جھونک دیا۔ ترس اور رحم نام کی کسی چیز سے یہ آشنا نہ تھا۔ سکھوں کا ایک فرقہ اس ستم گر کو گرو مانتا ہے۔

بندہ بیراگی اور اس کے گروہ کی دل خراش اور جگر فگار داستانیں سن کر خود بہادر شاہ اس کی گوشمالی کے لیے دہلی سے لاہور پہنچا، لیکن وہ اس کے قابو میں نہ آیا۔ اس کے بعد فرخ سیر نے اس کو ختم کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے نامور امیر عبدالصمد خاں نے اسے گرفتار کر لیا اور پھر اسے قتل کر دیا گیا۔

تیسرا اہم مسئلہ جس سے مغل حکمران دو چار ہوئے، راجپوتوں کا تھا۔ ان کے بارے میں مختصر طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دہلی سے بجانب جنوب کم و بیش ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ان کے مشہور قصبات واقع تھے جو آج بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جے پور، جودھ پور وغیرہ علاقوں میں یہ لوگ بڑی تعداد میں آباد تھے اور کسی نہ کسی شکل میں ان کی حکومتیں قائم تھیں۔ ان کے مشہور ٹھکانوں اور اہم قصبوں میں سے بیانہ، کامہ، ڈیگ قابلِ ذکر ہیں، ان کا مرکزی مقام بھرت پور تھا، جو ریاست بھرت پور کا دارالخلافہ تھا۔ آزادی کے بعد ریاستوں کی حیثیت باقی نہ رہی تو بھرت پور اس ضلعے کا صدر مقام ہو گیا۔ اس علاقے کی سرحدیں آگرہ اور متھرا سے ملتی ہیں۔ آگرے سے بھرت پور زیادہ سے زیادہ پینتیس میل کے فاصلے پر ہو گا۔ ہندوؤں کے نزدیک اس علاقے کو تاریخی عظمت بھی حاصل ہے اور مذہبی تقدس بھی، کیوں کہ سری کرشن جی کی ولادت اسی علاقے میں ہوئی تھی اور ان کا خاندان اسی علاقے میں سکونت پذیر تھا۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ بھرت پور کرشن جی کے چچا کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ نیز کہا جاتا ہے کہ وہاں کے

قصبے "کامہ" میں سری کرشن کے نانا اقامت گزین تھے۔

مغل بادشاہوں کے عہدِ عروج میں یہ علاقہ شاہی خاندان کے بعض افراد کو جاگیر کے طور پر عطا ہوا کرتا تھا۔ نور جہاں کو جو مغلوں کے زمانۂ عروج کی مشہور و ممتاز ملکہ تھی، جاگیر میں یہی علاقہ دیا گیا تھا۔ اس علاقے میں راجپوتوں کی آبادی تعداد میں تو شاید زیادہ نہیں ہوگی لیکن قوت و طاقت میں یہ لوگ ہمیشہ نمایاں اور غالب رہے ہیں۔ ان میں سے متعدد خاندانوں نے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا ہے اور وہ اب میواتی کہلاتے ہیں، ان میواتیوں میں سے کچھ لوگ تو قیامِ پاکستان کے بعد نقل مکانی کر کے پاکستان آگئے ہیں اور کچھ وہیں آباد ہیں۔

جب مغلیہ سلطنت کی مرکزی طاقت میں زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے اور ملک میں طوائف الملوکی پھیلنے لگی تو علاقہ بھرت پور کے راجپوتوں میں بھی اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان کے سردار کا نام بدن سنگھ تھا۔ ۱۷۲۳ء میں ڈیگ کے مقام پر اس کو راج تلک دیا گیا۔ اس نے بھرت پور کو اپنی راج دھانی بنایا اور ایک بااختیار راجے کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ اس کے بائیس لڑکے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا سورج مل تھا، جو بہت خردمند، بااستعداد اور سیاست کے نشیب و فراز سے آگاہ تھا۔ بدن سنگھ نے اس کو ولی عہد بنایا اور حکومت کا کاروبار اس کے سپرد کیا۔ بدن سنگھ نے تینتیس ۳۳ برس دو ماہ دس دن حکومت کر کے ۱۷۵۶ء (۱۱۷۰ھ) کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ اس کے بعد سورج مل نے مستقل فرماں روا کی حیثیت سے ریاست کی زمامِ اختیار ہاتھ میں لی۔ وہ راجپوتوں کا اس قدر بلند حوصلے اور مضبوط عزم و ارادے کا حکمران تھا کہ اس دور کے ہندوستان کی ہر حکومت اس کی سیاسی طاقت کا وزن محسوس کرتی اور معاملہ فہمی سے متاثر تھی۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے خلاف محاذ آرائی کی اور ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے میدان میں اترا تو

مرہٹوں نے سورج مل کے دروازے پر دستک دی اور طالب امداد ہوئے۔ یہ بڑا نازک موقع تھا، لیکن سورج مل نے نہایت عقل مندی کا ثبوت دیا اور سیاسی بصیرت کی بنا پر اس جنگ میں ملوث ہونے سے بھی بچ گیا اور اپنی ریاست کو بھی محفوظ رکھا۔ اس نے مرہٹوں کو یہ دانشمندانہ مشورہ دیا کہ وہ چوں کہ گوریلا جنگ لڑنے کے عادی ہیں، اس لیے ابدالی کے مقابلے میں بھی جنگ لڑیں۔ بھاری اسلحۂ جنگ، شاہانہ خیمے اور حرم سرائیں اس موقعے پر ان کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ یہ سب چیزیں ان کے لیے مصیبت بن جائیں گی۔ مناسب یہ ہے کہ یہ ساز و سامان ریاست بھرت پور کے قلعوں میں محفوظ کر دیا جائے اور صرف خالی گھوڑوں پر سوار ہو کر ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔ مرہٹہ سرداروں نے سورج مل کی اس تجویز کو سراہا اور اس کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن سداشیو راؤ بھاؤ جو مرہٹوں کا کمانڈر انچیف اور جنگ کا انچارج تھا، اس رائے سے متفق نہیں ہوا، اس نے یہ کہہ کر سورج مل کی تجویز رد کر دی کہ سورج مل ایک بڑا زمیندار ہے جس نے آرام و راحت کی زندگی اختیار کر لی ہے، اس کو لڑائی سے کیا واسطہ اور یہ کیا جانے کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ سورج مل کو لڑائی سے محفوظ رہنے اور فریق جنگ نہ بننے کا بہترین موقع میسر آ گیا۔

لیکن سورج مل نے سیاسیات میں انتہائی زیرک ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی غلطی بھی کی جو بالآخر اس کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ نجیب الدولہ اس کا پرانا اور مخلص دوست تھا، اس نے اس کو اپنا مخالف بنا لیا۔ وہ اس طرح کہ اس کی بیماری کے زمانے میں کسی معمولی سی بات پر سورج مل نے دہلی کی طرف یلغار کی اور اس پر حملہ کر دیا، مگر نتیجہ سورج مل کی توقع کے خلاف نکلا۔ مخالف فوج میدان میں نکلی تو سورج مل مقابلے میں مارا گیا۔ یہاں یہ بات بھی لائق مطالعہ ہے

کہ جب سورج مل زخمی ہو کر گر پڑا تو اس کے مخلص محافظوں میں سے ایک مسلمان پیرزادہ بھی تھا، جس کا نام شیخ احمد تھا اور فتح پور کا رہنے والا تھا، اس پر سورج مل بہت اعتماد کرتا تھا۔ یہ بھی سورج مل کی حفاظت اور مدافعت کرتا ہوا اس کے ساتھ ہی قتل ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۴ء (۱۱۷۷ھ) میں پیش آیا۔ سورج مل نے آٹھ سال دو ماہ پندرہ دن حکومت کی۔

بہر حال اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں بھی اور اس کی وفات کے بعد بالخصوص مغل بادشاہوں کو جن خطرناک اور بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑا، اُن میں مرہٹوں، سکھوں اور راجپوتوں کا ذکر بہت اہم ہے۔ آگے چل کر اس سلسلے میں جو واقعات رونما ہوئے اور جو طاقتیں ان کے لیے اذیت کا باعث بنیں، موقع و محل کی مناسبت سے اس کا مناسب الفاظ و اسلوب میں ذکر کیا جائے گا۔

اورنگ زیب عالم گیر کے جانشین محمد معظم بہادر شاہ اوّل کے حالات میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ مسلکاً شیعہ تھا اور شیعیت کی تبلیغ بھی کرتا تھا۔ جب وہ لاہور آیا تو علما کو حکم دیا کہ وہ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں علی ولی اللہ وصی رسول اللہ کے الفاظ کا اضافہ کریں۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور علما نے جن میں مولانا محمد مراد لاہوری اور مولانا یار محمد لاہوری پیش پیش تھے، بادشاہ کے حکم کے خلاف سخت احتجاج کیا اور ماننے سے انکار کر دیا۔ لاہور کے عوام نے علما کا ساتھ دیا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد میں لوگ ایک ہجوم کی شکل میں خطبۂ جمعہ میں شامل ہوتے اور بادشاہ کے اس حکم کی شدید مخالفت کی۔ بادشاہ نے علما کو طلب کیا اور فقہا و مجتہدین کے اقوال پیش کر کے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس کا حکم مبنی بر صحت ہے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور بحث و مناظرے میں علما کے دلائل وزنی ثابت ہوئے۔ بعض علما کو اس موقعے پر گرفتار بھی کیا

گیا۔ لیکن اس کا بیٹا عظیم الشان جو سنی العقیدہ تھا، درمیان میں پڑا۔ اس نے علما کے موقف کی حمایت کی اور باپ کو اپنا حکم واپس لینے پر مجبور کیا۔ یہ واقعہ دیگر مورخین کے علاوہ منشی غلام حسین طبا طبائی نے بھی سیر المتاخرین میں بیان کیا ہے، چوں کہ یہ مورخ خود شیعہ ہے، اس لیے اس کے اسلوبِ بیان میں بادشاہ کی تائید اور علما کی مخالفت صاف نظر آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ علما نے نہایت "عصبیت" سے کام لیا۔ "بلوائے عام" پر اتر آئے اور وہ ناصبی تھے۔ "ناصبی شعار بند"[۵]

مجموعی طور پر بہادر شاہ اچھا آدمی تھا اور علم و علما سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ ہمدرد و خیر خواہ اور رحم دل تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ تخت نشینی کے سلسلے میں یہ بھائیوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا اور مخلوقِ خدا کی خوں ریزی سے گریزاں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ باپ کی وصیت کے مطابق سلطنتِ ہند کو تینوں بھائیوں میں تقسیم کر لیا جائے لیکن دوسرے دونوں بھائیوں نے اس سے اتفاق نہ کیا اور باپ کی وصیت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، تو مجبوراً اسے تلوار سے کام لینا پڑا۔ مگر اس کے باوجود مقتول بھائیوں کے بیٹوں سے نہایت اچھا سلوک روا رکھا اور ان کو برابر مستحقِ محبت والفت گردانتا رہا۔

بہادر شاہ کے زمانے میں کوئی اہم کام نہیں ہوا، بلکہ ملک میں کئی سیاسی الجھنیں پیدا ہوئیں اور سلطنت مغلیہ ترقی کے بجائے زوال سے روشناس ہوئی اور متعدد ایسے گروہ عالمِ وجود میں آگئے جن میں سے آگے چل کر ہر گروہ مستقل خطرے کا نشان بن گیا۔

ہندوستان کے اس بادشاہ کو "شہِ بے خبر" کہا جاتا تھا۔[۶] یہ لفظ اس کے

---

۵ اصل فارسی الفاظ کے لیے دیکھیے سیر المتاخرین ج ۲ ص ۳۸۱

۶ منتخب اللباب حصہ دوم ص ۶۳۰

لیے کیوں استعمال ہوتا تھا؟ مورخین اس کی کوئی توجیہ نہیں بیان کرتے۔ اس زمانے کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے یہ لقب اسے اس لیے دیا تھا کہ وہ امور سلطنت میں اتنی دلچسپی نہیں لیتا تھا، جتنی اس کے آباو اجداد دیتے تھے اور یہ کہ اس کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے سلطنت میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ نہایت نازک دور تھا اور ہر طرف مخالفت کی مہیب گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور اس دور میں مغلیہ سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے انتہائی جدو جہد اور مستعدی کی ضرورت تھی، لیکن بہادر شاہ اس صفت سے بہرہ مند نہ تھا۔

بہادر شاہ کے آخری دور میں پنجاب سکھوں کے شدید مظالم کی زد میں آگیا تھا اور ان کے لیڈر بندہ بیراگی نے اس پورے علاقے کو بے پناہ مصائب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کے سدِ باب کے لیے بہادر شاہ دہلی سے لاہور پہنچا، وہ کوشش کے باوجود باغیوں پر تو قابو نہ پا سکا لیکن اس اثنا میں خود بیمار پڑ گیا اور ۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ (فروری ۱۷۱۲ء) کو وفات پا گیا۔ اس کی میت لاہور سے دہلی لے جائی گئی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرقد کے جوار میں اسے دفن کیا گیا۔

بہادر شاہ نے ستر سال چھ مہینے عمر پائی اور پانچ سال ایک مہینہ بائیس دن حکومت کی۔

معزالدین جہاں دار شاہ

بہادر شاہ کی وفات کے بعد تخت نشینی کے مسئلے پر پھر اس کے بیٹوں کے درمیان جھگڑا ہوا، اور آتشِ جنگ مشتعل ہوئی۔ اب مغلیہ خاندان کے نا اہل اسلاف نے لاہور کو میدانِ جنگ بنایا۔ پہلی جنگوں کی طرح یہ جنگ بھی نہایت ہولناک اور شدید تھی۔ اس جنگ میں بہادر شاہ کے بیٹوں میں سے جہاں دار شاہ، رفیع الشان اور جہاں شاہ ایک طرف تھے اور عظیم الشان ایک

طرف ا جنگ کے نتیجے میں عظیم الشان مارا گیا۔ لیکن اس کے تین دن بعد جہاں دار شاہ، رفیع الشان اور جہاں شاہ کے درمیان پھر معرکۂ قتال گرم ہوا اور رفیع الشان اور جہاں شاہ قتل ہوئے، ان کے بیٹے بھی مارے گئے اور معز الدین جہاں دار شاہ اورنگِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ یہ بادشاہ بالکل نا اہل اور بعض وزرا و امرا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، وزیر جو چاہتے کرتے تھے۔ اس نے اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی جہاں تک ممکن ہوا مغل خاندان کے ان تمام شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جن سے کوئی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

فرخ سیر

بہادر شاہ اوّل کے بیٹے عظیم الشان کا ایک بیٹا فرخ سیر تھا جو اس جنگ میں بارہہ کے سیّد حسین علی خاں (صوبے دار بہار) کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ اس نے جہاں دار شاہ سے باپ اور بھائی کے خون کا بدلہ لینے کا عزم کیا اور بنگال سے بھاری لشکر کے ساتھ آگرے کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں دار شاہ کو اس کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی اپنے بڑے بیٹے اعز الدین کی معیت میں لشکرِ عظیم کے ساتھ مقابلے کو نکلا۔ اس وقت بارہہ کے سادات (دونوں بھائی) سیّد حسین علی خاں (صوبے دار بہار) اور سیّد حسن علی خاں (صوبے دار الہ آباد) بھی فرخ سیر کے ہم رکاب تھے۔ ۲۸ دسمبر ۱۲ ۱۷ء کو آگرے کے قریب دونوں طرف کی فوجیں مقابلے میں اتریں اور سخت لڑائی ہوئی، جس میں فرخ سیر جیت گیا۔ ۷ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ کو جہاں دار شاہ جان بچا کر میدانِ محاربہ سے فرار ہوا اور دہلی کا رخ کیا۔ فرخ سیر فتح یاب ہونے کے بعد ۱۸ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ (یکم جنوری ۱۷۱۳ء) کو آگرے میں تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ چند روز وہیں مقیم رہا۔ اس کے بعد دہلی کو لوٹا اور حالات کا جائزہ لیا۔ ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ کو جمعے کے روز فرخ سیر کے حکم سے معز الدین جہاں دار شاہ کو قتل کر دیا

گیا، اور اس کے ساتھ ہی اس کے امیر الامرا ذوالفقار خاں کا سر بھی تلوار سے اڑا دیا گیا۔

جہاں دار شاہ ۱۰۷۲ھ کو پیدا اور ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ کو قتل ہوا۔ ۵۲ سال نو مہینے عمر پائی۔ اپنے والد بہادر شاہ اول کی وفات سے لے کر آگرے میں فرخ سیر کے ہاتھوں شکست کھانے تک دس مہینے حکومت کی۔ دہلی میں مقبرۂ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے قریب دفن ہوا۔

فرخ سیر نے ساداتِ بارہہ یعنی سید حسین علی خاں اور سید حسن علی خاں کی مدد سے تاجِ شاہی سر پہ رکھا تھا۔ مغلیہ عہد کے امرائے مملکت میں یہ دونوں بھائی بہت اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ حسین علی خاں صوبہ بہار کا اور حسن علی خاں صوبہ الٰہ آباد کا والی تھا۔ دونوں بھائی نہایت مغرور اور خودسر تھے۔ انھیں مغلوں کے دورِ زوال میں عملاً "بادشاہ گر" کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جس کو چاہتے تخت سے اتار دیتے اور جس کو چاہتے بٹھا دیتے۔ فرخ سیر بھی انھی کی مدد اور کوشش سے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ فرخ سیر ایک محتاط اور معاملہ فہم حکمران تھا۔ رعایا کا خیال رکھتا تھا۔ علمائے دین سے بھی اس کے مراسم و روابط تھے۔ اس نے جب دیکھا کہ پنجاب میں بندہ بیراگی نے لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے اور سکھ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو پریشان کر رہے ہیں تو اس کی رگِ حمیت جوش میں آئی اور ظالموں کو وہ سزا دی جس کے وہ واقعی مستحق تھے۔

پھر اس نے جب یہ محسوس کیا کہ بارہہ کے سید برادران اس پہ چھا گئے ہیں اور وہ ان کی گرفت میں ہے تو ان سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا نتیجہ اس کے حق میں نہایت اذیت ناک نکلا اور وہ ان کی قید میں بری طرح پھنس گیا۔ انھوں نے اس کو گرفتار کر کے آنکھوں میں لوہے کی سلائی پھیر دی اور بصارت سے محروم کر دیا۔ بعد میں انتہائی ذلت

کے ساتھ اسے قتل کر دیا گیا۔

فرخ سیر ۱۰۹۸ھ کو پیدا ہوا۔ ۸ ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ کو بادشاہ بنا۔ ۱۱۲۸ھ کے شروع میں جسونت سنگھ راٹھور کے بیٹے مہاراجہ اجیت سنگھ کی لڑکی سے شادی کی۔ ۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ (مارچ ۱۷۱۹ء) کو بارہہ کے سید بھائیوں نے اس کو دہلی کے قلعے میں گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

فرخ سیر کو ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اس کی مدتِ حکومت ساڑھے چھ سال کے قریب بنتی ہے۔

رفیع الدرجات

فرخ سیر کو قتل کرنے کے بعد سادات بارہہ نے ۹ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ کو رفیع الشان کے بیٹے اور بہادر شاہ کے پوتے شمس الدین محمد ابوالبرکات رفیع الدرجات کو تخت نشین کیا۔ اس سے قبل یہ قلعہ سلیم گڑھ میں محبوس تھا، وہاں سے نکال کر حکومتِ ہند کی باگ ڈور اس کے سپرد کی گئی، لیکن یہ سِل اور دق کا مریض اور نہایت نحیف و کمزور آدمی تھا۔ دو مہینے دس دن ۱۹ رجب ۱۱۳۱ھ کو وفات پا گیا۔

رفیع الدولہ

رفیع الدرجات کی وفات کے بعد سادات بارہہ نے اس کے بھائی شمس الدین محمد رفیع الدولہ شاہ جہان ثانی کو بادشاہ بنایا۔ ۲۰ رجب ۱۱۳۱ھ کو تاج شاہی اس کے سر پہ رکھا۔ چند روز بعد یہ بھی دنیا سے کوچ کر گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان سیّدوں نے ہندوستان کی مغل بادشاہت کو کھیل بنا رکھا تھا، جس کو چاہتے بادشاہ بنا دیتے اور جب جی چاہتا اس کو موت کی نیند سلا دیتے۔ رفیع الدولہ کے بعد نیکو سیر کو بادشاہت عطا کی۔ کچھ عرصے کے لیے ایک شخص ابراہیم کو بھی اس اعزاز سے سرفراز کیا یعنی ۱۸ فروری ۱۷۱۹ سے ۲۷ اگست ۱۷۱۹ تک انھوں نے یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات

رفیع الدولہ اور نیکوسیر تین شخصوں کو ہندوستان کے تختِ سلطنت کا مالک بنایا۔

اس سے آگے محمد شاہ کا دَورِ حکومت شروع ہوتا ہے جو خاصا طویل اور کئی سال کو محیط ہے۔ نیز بہت سے سنگین حوادث و واقعات کو اپنے دامنِ تاریخ میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا آغاز کرنے سے پہلے ساداتِ بارہہ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ مغلوں کے اس دَور کے حالات میں بار بار ان کا ذکر آتا ہے۔

ساداتِ بارہہ

ساداتِ بارہہ سیّد ابوالفرح کی اولاد سے تھے جو بغداد کے قریب شہر واسط کے رہنے والے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب سترھویں پشت میں زید شہید کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں سیّد ابوالفرح اپنے بارہ بیٹوں کے ساتھ واسط کی سکونت ترک کر کے ہندوستان آئے اور صوبہ دہلی کی سرہند سرکار میں پٹیالے کے قریب اس خاندان کے لوگ الگ الگ چار گاؤں میں آباد ہو گئے۔ بعد ازاں یہ سادات اس علاقے سے نکل کر گنگا اور جمنا کے دوآبے میں ضلع مظفر نگر (یوپی) چلے گئے اور مختلف مقامات میں اقامت اختیار کر لی۔

اکبر کے زمانے میں ساداتِ بارہہ نے کئی مہموں میں حصہ لیا اور اپنی جواں مردی کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ اکبر کی وفات کے بعد تخت نشینی کا مسئلہ سامنے آیا تو سیّد خان بارہہ نے انتہائی کوشش کی کہ جہانگیر کے بجائے اس کے بیٹے خسرو کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا جائے، مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے تک اگرچہ یہ سادات مغل فوج میں ملازم تھے لیکن ان کو کبھی کوئی اعلیٰ منصب عطا نہیں ہوا۔

مغل تاریخ کے دو سیّد برادران حسن علی اور حسین علی اسی خاندان

سے تعلق رکھتے تھے اور ضلع مظفر نگر (یو پی) کے قصبہ بارہہ کے باشندے تھے۔ انھوں نے اٹھارھویں صدی کے ابتدائی بیس سالہ دور میں "بادشاہ گر" کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کے والد کا نام سید عبداللہ خاں تھا، جس نے اورنگ زیب عالم گیر کے بخشی ممالک روح اللہ کے زیر نگرانی ترقی کی منزلیں طے کی تھیں۔

سید عبداللہ خاں کے بیٹے حسن علی خان اور حسین علی خان حسینی واسطی مملکتِ تیموریہ کے معروف اور سخت مزاج امرا و وزرا میں سے تھے حسین علی بڑا اور حسین علی چھوٹا تھا۔ حسن علی نے پہلے پہل اورنگ زیب عالم گیر سے تقرب حاصل کیا اور مدت تک اس کی سرکار میں خدمت انجام دیتا رہا۔ عالم گیر کی وفات کے بعد دونوں بھائیوں نے اس کے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ سے وابستگی اختیار کی اور جاجوہ کی لڑائی میں محمد اعظم کے خلاف دادِ شجاعت دی۔ بہادر شاہ نے فتح یاب ہونے کے بعد تاجِ شاہی سر پر رکھا تو حسن علی کو الہ آباد کا اور حسین علی کو پٹنے کا والی مقرر کر دیا اور اعزاز و اکرام کا مستحق گردانا۔ بہادر شاہ نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو ان سید بھائیوں نے اس کے جانشین معزالدین جہاں دار شاہ کو شکست دی اور فرخ سیر کو تخت پر بٹھا دیا۔ فرخ سیر نے اس کے صلے میں ان کو بہت سے اعزازات سے نوازا۔ حسن علی کو "قطب الملک، یمین الدولہ، سید عبداللہ خاں بہادر، ظفر جنگ، سپہ سالار، یارِ وفادار" کے القاب سے سرفراز کیا اور اپنا وزیر اعظم بنایا۔ حسین علی کو "عمدۃ الملک بہادر، فیروز جنگ، سپہ سالار، امیر الامرا" کے القاب کے علاوہ میر بخشی کا منصب عطا فرمایا۔ لیکن اس کے بعد ان سیدوں نے فرخ سیر کو بھی بہت بڑی سزا دی، اس کی آنکھیں بے کار کر دیں اور پھر قتل کر دیا۔ اس کے بعد رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، نیکو سیر، ابراہیم اور محمد شاہ کو تختِ حکومت پر بٹھایا، اور بادشاہت کو ایک کھلونے کی حیثیت دے دی۔ لیکن محمد شاہ نے عقل مندی اور چال بازی سے ۶ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ کو اثنائے سفر میں حسن علی خان کو قتل کرا دیا۔ حسین علی

خاں اس وقت دہلی میں تھا۔ اسے بڑے بھائی کے قتل کی اطلاع ملی تو نہایت برافروختہ ہوا، جو شہزادے اور امرائے مملکت اس وقت اس کی سخت گیری کی وجہ سے محبوس تھے، انھیں رہا کیا اور ان سے محمد شاہ کے خلاف سازش کر کے ایک فوج تیار کی، اور جنگ کے لیے روانہ ہوا۔ شاہی فوج اور حسین علی کے ساتھیوں کے درمیان لڑائی ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ حسین علی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ مگر گرفتار کر کے قید خانے میں ڈالا گیا اور اسی حالت میں ذی الحجہ ۱۱۳۵ھ کی آخری تاریخ کو موت کی آغوش میں چلا گیا۔ بعد ازاں ۱۷۳۷ء میں جب روہیلوں نے مخالف قوتوں کو تاراج کیا تو ان سید برادران کی اولاد و احفاد کو بھی قتل یا منتشر کر دیا گیا اور پھر ان کا کہیں کوئی اثر باقی نہ رہا۔

یہ دونوں بھائی نہایت شجاع، جرأت مند، بہادر، جنگ جو اور دلیر تھے۔ شجاعت و مردانگی میں کوئی ان کا حریف نہ تھا، لیکن حسن علی خاں جاہل، متکبر، انتہائی خود سر اور مغرور تھا۔ سیاسی فہم و فراست سے عاری اور معاملاتِ ملکی میں فکر و تدبر سے ناآشنا تھا۔ اس کے برعکس حسین علی عاقل و فہیم، صاحبِ جود و کرم اور بہت سے اوصاف کا مالک تھا۔ اہلِ علم سے تعلق رکھتا، ان کی مجالس میں بیٹھتا اور علمی مسائل میں ان سے بحث و مذاکرہ کرتا تھا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغل دربار میں ایک عرصے سے کئی قسم کے جھگڑے چل رہے تھے اور امرائے مملکت اور ارباب حل و عقد ان میں ملوث تھے۔ پھر ان کے نتائج کا سلسلہ دور تک چلتا تھا۔ ان جھگڑوں میں ایک جھگڑا ایرانی اور تورانی امرائے حکومت کا تھا، جو ابتدا میں خالص مذہبی نوعیت کا تھا اور چند لوگوں تک محدود تھا یعنی امرا کی شیعہ سنی کشمکش۔ تورانی امرا اہلِ سنت سے تعبیر تھے اور ایرانی امرا شیعہ سے! امرا کی یہ باہمی کشمکش پرانی تھی جو اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ لیکن چوں کہ وہ مغل حکومت کا دورِ شباب تھا اور حکمران ذاتی طور پر خاص وجاہت و شہامت کا مالک اور اپنا ایک دبدبہ و طنطنہ رکھتا تھا، اس

لیے بات باہر نہیں نکلتی تھی اور اس زہر کے نتائج محسوس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن عالمگیر کے انتقال کے فوراً بعد اندر کی تمام کمزوریاں سامنے آگئیں، عناصرِ حکومت میں ضعف یہاں تک بڑھ گیا کہ کہیں اعتدال باقی نہ رہا اور ان دو متضاد نظریوں کے اندرونی تصادم نے ایک مستحکم حکومت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ ساداتِ بارہہ وطناً ایرانی نہ تھے ہمسلکاً ایرانی تھے۔ ان کے زمانۂ اقتدار میں ایرانی امرا کو تورانی امرا پر اتنی برتری حاصل ہوئی کہ بعض بڑے بڑے تورانی امرا امورِ حکومت سے دست کش ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے اور کسی معاملے سے کوئی تعلق باقی نہ رکھا۔

ساداتِ بارہہ کے عہدِ اقتدار میں یہ پرانا مسئلہ بہت افسوس ناک طریقے سے ابھر کر سامنے آیا اور اس کا انجام نہایت ہولناک ہوا۔ یکے بعد دیگرے کئی مغل حکمران تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے آتے اور گئے۔ کسی کو استحکام نصیب نہ ہوا، اور کوئی بادشاہ ان سادات کی ذلت آمیز سازشوں کی بدولت اطمینان سے ملک کے نظم و نسق کی طرف توجہ نہ دے سکا۔

محمد شاہ

ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ غازی، اس کا نام روشن اختر تھا۔ جہان شاہ کا بیٹا اور شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کا پوتا تھا۔ ۲۳ ربیع الاول ۱۱۱۴ھ کو جمعۃ المبارک کے روز پیدا ہوا۔ دیگر شہزادوں اور بیگماتِ شاہی کے ساتھ اس کو اور اس کی والدہ کو سید حسن علی خاں نے اس وقت سے قید کر رکھا تھا، جب اس کے والد جہاں شاہ کی وفات کے بعد جہاں دار شاہ کو تختِ حکومت پر بٹھایا تھا۔ اب نئے بادشاہ کی ضرورت پڑی تو ماں بیٹا دونوں کو قید خانے سے نکالا اور ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ (اکتوبر ۱۷۱۹ء) کو آگرے میں تختِ ہند پر متمکن کیا۔ تخت نشینی کے وقت محمد شاہ کی عمر سترہ سال تھی۔ آگے چل کر یہ "محمد شاہ رنگیلا" کے نام سے مشہور ہوا۔

محمدؐ شاہ کے زمانے میں سلطنت مغلیہ کئی حصوں میں بٹ گئی اور مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ دکن کا صوبے دار نظام الملک آصف جاہ برائے نام بادشاہ کا ماتحت تھا، درحقیقت اس نے حیدرآباد میں الگ حکومت قائم کر لی تھی۔ لکھنؤ میں بھی اودھ کی ایک جداگانہ سلطنت وجود میں آ گئی تھی۔ غرض ہندو، مسلمان اور غیر ملکی طاقتیں اس کے عہد میں میدان میں نکل آئی تھیں اور طوائف الملوکی پھیل گئی تھی، جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ پوری سلطنت انگریز کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

محمد شاہ کے کارناموں میں ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بارہہ کے سید بھائیوں حسین علی اور حسن علی کو ختم کیا۔ لیکن یہاں اس کی متحمل مزاجی کی بھی داد دینی چاہیے کہ حسین علی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے اس کا بڑا بھائی حسن علی بادشاہ کے مقابلے میں آیا تو متھرا کے شمال میں تقریباً تیس بتیس میل دور شبیر گڑھ کے مقام پر گرفتار کر کے قید کر لیا گیا اور اسی حالت میں اس کو دہلی لایا گیا۔ لڑائی میں چوں کہ وہ زخمی ہو گیا تھا، لہٰذا دہلی آنے کے کچھ عرصہ بعد انہی زخموں کی وجہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔ محمد شاہ کو متعدد سرکردہ لوگوں نے کہا کہ حسن علی کو حالتِ قید میں قتل کر دینا چاہیے کیوں کہ اس نے کئی بادشاہوں، شہزادوں اور امیروں پر سخت مظالم ڈھائے ہیں، لیکن محمد شاہ نے وسعتِ قلب کا ثبوت دیا اور اس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ کہا کہ ایک بھائی پہلے ہی قتل ہو چکا ہے اور ان کا زور ختم ہو گیا ہے، اب اس کو قتل کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

محمد شاہ کے دور کو تاریخ ہند میں ابتری اور خون خرابے کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ بادشاہ ملکی معاملات میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیتا تھا۔ دکن کا صوبے دار نظام الملک آصف جاہ ایک زیرک اور دور اندیش امیر تھا۔ وہ دکن میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کے لیے فضا ہموار کر رہا تھا اور دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی اپنا اثر

اقتدار بحال رکھنا چاہتا تھا۔ دکن کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ وہاں مرہٹوں سے بنا کر رکھنا اور تعلقات استوار کرنا ضروری تھا، اور اس نے یہی کیا۔ اپنی اس سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لیے، جس کے مستقبل قریب میں قیام کا نقشہ وہ اپنے ذہن میں ترتیب دے رہا تھا، اس نے مرہٹوں سے دوستی گانٹھی۔

نظام الملک نے اپنے علاقے کو مرہٹوں کی دست بُرد سے بچانے اور بادشاہِ دہلی کو پریشانی میں مبتلا کرنے کے لیے ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) میں مرہٹوں کو اکسایا اور انھیں دہلی کی طرف متوجہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باجی راؤ پیشوا نے دہلی پر یلغار کر دی اور شاہی لشکر کو اس کے گھر جا کر شکست دی۔ مرہٹوں کو اس سے یہ فائدہ پہنچا کہ ان کا "چوتھ" (یعنی ۲۵ فی صد) دینے کا مطالبہ جو ایک عرصے سے جاری تھا، مان لیا گیا۔ بادشاہ کو علم تھا کہ مرہٹوں کو دہلی کا راستہ نظام الملک نے دکھایا ہے، مگر خاموش رہا، بلکہ اس کے عہدہ و منصب میں اضافہ کیا۔

پھر اسی نظام الملک نے نوابانِ اودھ کے مورثِ اعلیٰ برہان الملک نواب سعادت خاں سے ساز باز کر کے ایران کے بادشاہ قلی خاں کو جسے تاریخ میں نادر شاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ہندوستان پر حملے کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ ۱۷۳۸ء میں وہ چھتیس ہزار کے لشکرِ جرار کے ساتھ ایران سے روانہ ہوا۔ محمد شاہ کی فوج بھی دہلی سے نکلی اور کرنال کے قریب جا کر پڑاؤ کیا۔ فریقین کے لشکر چند روز تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے مگر کوئی مقابلہ نہ ہوا۔ پھر لوٹ مار شروع ہوئی، جس نے آگے چل کر جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ محمد شاہ کی فوج دو لاکھ افراد پر مشتمل تھی، لیکن شکست کھائی۔ تاہم رزم گاہ میں موجود رہی۔ کچھ دن تذبذب اور پریشانی کی حالت میں گزرے، بالآخر جب امرائے سلطنت نے دیکھا کہ نظام الملک کا رجحان نادر شاہ کی طرف ہے تو مجبوراً محمد شاہ کو نادر شاہ کے حضور سرِ اطاعت خم

کرنا پڑا۔

نادر شاہ نے محمد شاہ کو اسی عزت و احترام کا مستحق گردانا جو ایک بادشاہ ذی جاہ کے شایانِ شان تھا، لیکن ساتھ ہی امورِ سلطنت سے بے اعتنائی اور پست ہمتی کا طعنہ بھی دیا، یہ بھی کہا کہ میرا مقصد آپ سے سلطنت چھیننا نہ تھا، فقط انتظامِ مملکت کی طرف توجہ دلانا تھا۔ تاہم جب تک آپ مجھے تاوانِ جنگ ادا نہ کریں گے، دارالسلطنت دہلی پر میرا قبضہ رہے گا۔ ۹ مارچ ۱۷۳۹ کو پہلے محمد شاہ شہر میں پہنچا۔ اس کے پیچھے نادر شاہ قلعے میں داخل ہوا، نادر شاہ نے اپنی فوج کو سختی سے حکم دے دیا تھا کہ باشندگانِ دہلی سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے لیکن بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ نادر شاہ نے قتلِ عام کا حکم دے دیا اور چند گھنٹوں میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی موت کا لقمہ بن گئے۔ محمد شاہ نے اپنا سفیر نادر شاہ کی خدمت میں بھیجا، جس نے صاف لفظوں میں نادر شاہ سے معذرت کی، پھر کہیں قتل سے ہاتھ رکا۔

نادر شاہ نے سلطنتِ ہند پہ قبضہ تو نہیں کیا، البتہ محمد شاہ سے چار کروڑ روپے تاوانِ جنگ کے طور پہ طلب کیے، نیز صوبہ کابل، دریائے سندھ کا مغربی علاقہ اور پنجاب کے کچھ محالات (اضلاع) سلطنتِ ایران میں داخل ہوئے۔ اورنگ زیب کی پوتی نادر شاہ کے بیٹے کے حبالۂ عقد میں دی گئی۔ جاتے ہوئے نادر شاہ تختِ طاؤس بھی ساتھ لے گیا۔ پورے ملک سے جو مال و دولت اس نے سمیٹا اس کا تخمینہ اسّی کروڑ روپے لگایا جاتا ہے۔

نادر شاہ کئی مہینے ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد ۵ مئی ۱۷۳۹ کو دہلی سے ایران روانہ ہوا۔ تب جا کر دہلی کے لوگوں نے کہیں سُکھ کا سانس لیا۔

نادر شاہ نے قتل و غارت کے بعد محمد شاہ کو کچھ نصیحتیں بھی کیں، جن میں ایک یہ بھی تھی کہ نظام الملک سے خبردار رہنا اور اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نادر شاہ نے بانیِ سلطنتِ اودھ برہان الملک سعادت خاں

اور موسیٰ حکومتِ آصفیہ نظام الملک آصف جاہ کو طلب کیا اور انھوں نے اس کو محمد شاہ کے خلاف دعوتِ جنگ دے کر جس ذلیل حرکت کا ارتکاب کیا تھا، اس پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ نادر شاہ کے تلخ و تند لہجے سے دونوں بہت نادم ہوئے اور مارے شرم کے اس کے سامنے سے ہٹ گئے۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئے کہ اس بے عزتی سے تو زہر کھا لینا بہتر ہے۔ چنانچہ نظام الملک نے تو جھوٹ موٹ زہر کھایا اور تھوڑی بہت تکلیف کا اظہار کر کے کھڑا ہو گیا۔ لیکن سعادت خاں نے سرطان کے شدید حملے سے انتقال کیا، تاہم کہا جاتا ہے کہ اس پر زہر کی علامتیں نمودار تھیں۔[1] ممکن ہے یہ سرطان کا اثر ہو۔

اب بادشاہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ اعتماد شخص اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خاں تھا، اس کو وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا۔ یہ بہت لائق اور جرأت مند امیر تھا، لیکن حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کر لیا تھا کہ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا اور نظم و نسق کی ساری چولیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ صوبہ بنگال، بہار، اڑیسہ، اور روہیل کھنڈ سب اپنی اپنی جگہ خود مختار ہو گئے تھے۔ روہیل کھنڈ کے باغی سردار کو تو بادشاہ نے شکست بھی دی، لیکن پھر بھی اس کا علاقہ قبضے میں نہ آسکا۔

نادر شاہ کے قتل و غارت گری کے بعد ایک آفت یہ پڑی کہ محرم ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۷ء) میں درّانی افغان احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس کے مقابلے کو بُرہان الملک سعادت خاں کے بھانجے اور داماد نواب منصور علی خاں صفدر جنگ کو سپہ سالارِ فوج بنا کر بھیجا گیا۔ نواب قمر الدین خاں وزیرِ اعظم بھی میدانِ جنگ میں موجود تھا اور اپنے خیمے میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ناگاہ غنیم کی جانب سے توپ کا ایک گولہ اس کے قریب آکر گرا، اور اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ حادثہ جمعے کے روز ۲۲ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ (۱۱ اپریل ۱۷۴۸ء) کو پیش آیا۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے واقعات دار الحکومت دہلی ج ۱ ص ۶۴۷ تا ۶۵۰

اس لائق وزیر اعظم کی موت کے سانحے کا علم بادشاہ محمد شاہ کو ہوا تو شدتِ غم سے بے ہوش ہو گیا اور غش کھا کر گرا۔ ساتھ ہی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ سانحہ جمعرات ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء) کو رونما ہوا۔

محمد شاہ نے ۴۷ سال عمر پائی اور ۲۹ سال پانچ مہینے ۲۳ دن حکومت کی۔ دہلی میں مقبرہ نظام الدین اولیا میں دفن ہوا۔

محمد شاہ کا عہد مغلیہ سلطنت کے مختلف النوع مصائب کا عہد تھا۔ اس کے زمانے میں پنجاب کے سکھوں نے بھی سر اٹھایا۔ چنانچہ کپور تھلہ کے جسّا سنگھ نے ۱۷۴۳ء میں لاہور پر حملہ کیا اور اس کے صوبے دار زکریا خاں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد جھگڑے اور تصادم کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ ۱۷۶۶ء میں وہ فوج لے کر آیا اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ دہلی کی طرف بڑھا۔ لیکن جسّا سنگھ، ابدالی کی آمد کی خبر سن کر دہلی سے رخصت ہو گیا اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ اس کے بعد اس نے دہلی کا رُخ تو نہیں کیا، البتہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں لوٹ مار جاری رہی۔ ۱۷۸۳ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

محمد شاہ بے شک "محمد شاہ رنگیلا" کے نام سے مشہور ہوا، اور عرفِ عام میں لفظ "رنگیلا" اس کے نام کا جز قرار پایا، لیکن اس کا اصل نام روشن اختر تھا اور اس "روشن اختر" کی زندگی کے کچھ روشن پہلو بھی ہیں، جن کو بہر کیف ملحوظ رکھنا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک تجدید و اصلاح کا آغاز اسی کے دور میں ہوا، جو اس ملک کا عظیم الشان اور عدیم المثال سلسلۂ دعوت و ارشاد ہے۔ شاہ صاحب کی ہمدردیاں بھی ہمیشہ اس بادشاہ کے ساتھ رہیں۔ اگر یہ فی الواقع اتنا ہی بدعنوان اور بدقماش ہوتا، جتنا کہ عام طور پر ظاہر کیا جاتا ہے تو شاہ صاحب ہرگز اس کو لائقِ اعتنا نہ گردانتے۔

یہاں یہ واقعہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے والدِ مکرم شاہ عبدالرحیم نے جس مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا، وہ ایک مختصر سی

جگہ تھی، اور اس زمانے کے حالات کے مطابق شاید اسے کافی سمجھا جاتا ہوگا لیکن جب شاہ ولی اللہ تکمیل علمِ حدیث کے بعد حرمین شریفین سے واپس آئے تو یہ جگہ طلبائے علم کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی، کیونکہ ملک کے اطراف و اکناف سے طلبا کھنچ کھنچ کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے لگے تھے۔

یہ اسی محمد شاہ رنگیلے کا عہد تھا، اس کے علم میں جب یہ بات آئی کہ مدرسہ رحیمیہ کی پُرانی جگہ شاہ ولی اللہ کے حلقۂ درس کے طلبا کے لیے کافی نہیں رہی تو اس نے بقول مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے ان کو نئی جگہ عطا کی:

"روشن اختر محمد شاہ کا زمانہ تھا۔ اس نے مولانا کو بُلا کر شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر آپ کو اندرونِ شہر رکھا۔ قدیم جگہ غیر آباد ہو گئی"۔[۸]

شاہ صاحب کے اس مدرسے کی عمارت کے بارے میں جو ان کو محمد شاہ نے تدریسِ حدیث کے لیے عطا کی تھی، مصنف مذکور مزید لکھتے ہیں:

یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوب صورت تھا اور بڑا دار العلوم سمجھا جاتا تھا۔[۹]

یہ مدرسہ کتنا وسیع اور کشادہ ہوگا اور اس کا پھیلاؤ کہاں تک ہوگا، اس کا اندازہ مصنف مذکور کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد اس وقت تحریر کیے، جب دہلی کے محلوں اور آبادیوں کا پرانا سلسلہ بالکل بدل دیا گیا تھا

اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ عبد العزیز صاحب کے مدرسے کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔[۱۰]

---

[۸] واقعاتِ دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۶۔

[۹] ایضاً ص ۱۷۳

[۱۰] ایضاً ص ۱۷۴

اس مدرسے کی وسعت کا اندازہ اس حقیقت سے کیجیے کہ اس میں شاہ ولی اللہ نے درسِ قرآن و حدیث دیا، ان کے بعد مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے الفاظ ہیں:

"ان کے چاروں صاحب زادوں نے وہی مشغلہ جاری رکھا اور اس مدرسے نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہوگیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحب زادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق (مہاجر مکی) نے مدرسے کی خدمت اپنے ذمے لی[11]

بہر حال یہ کوئی بہت بڑی عمارت ہوگی جو شاہ ولی اللہ کو مدرسے کے لیے محمد شاہ نے دی۔ ملاحظہ کیجیے شاہ ولی اللہ کو محمد شاہ رنگیلے کے اس عطیے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے کیسے دلچسپ الفاظ تحریر کیے ہیں۔ فرماتے ہیں:

خصوصاً شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تو اس رنگیلے نے وہ رنگین سلوک کیا ہے کہ اگر مسلمان اس غریب کو محض اس کی اسی خدمت کی بنیاد پر بخش دیں تو وہ اس کا مستحق قرار پاسکتا ہے[12]

محمد شاہ کے عہد میں دہلی کو بزرگانِ دین کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ بہ یک وقت بائیس ایسے علمائے کرام وہاں موجود تھے جو دعوت و ارشاد کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رقم طراز ہیں:

در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحبِ ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند، و ایں چنیں اتفاق کم می شود[13]

---

[11] واقعاتِ دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۷۳

[12] الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۱۶۴

[13] ملفوظات، عزیزیہ ص ۱۰۶

یعنی محمد شاہ کے زمانے میں دہلی میں ہر سلسلے اور طریقے کے بائیس صاحب ارشاد و دعوت بزرگ قیام پذیر تھے، اور یہ ایسا اتفاق ہے جو (کسی بادشاہ کے زمانے میں) کم ہی ہوتا ہے۔

محمد شاہ کے عہد میں اردو شاعری کو بھی نشو و ارتقا کے مواقع میسر آئے، اور یہ فن کافی آگے بڑھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے میں بادشاہ اخلاقی انحطاط اور عیش کوشی کا شکار ہو گئے تھے اور یہ مہلک مرض چند خاندانوں کو چھوڑ کر تقریباً پورے معاشرے میں سرایت کر گیا تھا، اور زوال سلطنت کا یہ ایک بنیادی سبب تھا۔ حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد آقا محمود بیگ راحت نے زوال سلطنت کے اسباب کا بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے اور اٹھارھویں صدی کے حالات کی عمدہ الفاظ میں تصویر کشی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ایک روز ابو نصر محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ذکرِ زوالِ سلطنت آ گیا۔ بخشی محمود نے عرض کی چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا۔

اوّل حکیموں نے۔ فرماں روایانِ بیدار مغز کو وہ مقویات کھلائیں کہ تابِ تحمل نہ ہو سکی، مزاج عشرت طلب ہو گیا۔

دوسرے کلاونتوں نے۔ ان کے گھر میں جو نوخیز ہوئی اس کو پیش کیا اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاطین کو رقص و سرود میں مائل رکھا۔ ڈوم ڈھاڑھی مدار المہام ہوئے، انتظامِ فرماں روائی میں خلل واقع ہوا، دشمنوں نے سر اٹھایا، بدخواہوں نے پیر پھیلائے، جا بجا خود سر ہو گئے، شرفا کو دربار میں مداخلت نہ ہوئی، ان کی بات کسی نے نہ سنی، وقت پر ان لوگوں نے طرح دی، غنیم کی بن آئی۔

تیسرے کثرتِ عیال نے۔ ادھر ازدواج کی کثرت ہوئی، ادھر اولاد کی ترقی ہوئی کہ نزاعِ خانگی سے خلش ہوئی۔

چوتھے مشائخ و پیرزادوں نے۔ جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکرِ سلطنت آیا، اپنے تیئں عرش پر پہنچا یا مسائلِ تصوف بیان کرنے لگے۔ کنجِ عزلت کی خوبیاں عرض

کرنے لگے، خونِ بندگانِ خدا سے ڈرانے لگے۔ جب شیخ جی شیخی بگھار چکے، پھر اپنی کرامت جتانے لگے، ہم دعا کرتے ہیں، دعاؤں کا لشکر حضور کی فتح و نصرت کو کافی ہے، دشمن ادھر منہ بھی نہیں کرنے کا۔ خود پامالِ سم سمندانِ لشکرِ دعا سے دولت و اقبال ہوگا۔

فرماں روا ان کے دام میں آگئے، پیر جی کی دعا پر تکیہ کیا، چار بالشِ عشرت پر تکیہ نشین ہوئے۔ اراکین گوشہ گزین ہوئے، غنیم نے قابو پایا، اقلیم پر زور لگایا، دعا کی فوج آتی رہی، حکومت جاتی رہی، لیکن زوالِ حکومت سے علومِ اسلامی کی اشاعت میں ضعف نہ آیا، بلکہ ان کا زیادہ فروغ ہوا[۱۲۱]۔

بہرحال وہ دور ہر اعتبار سے انحطاط کا دور تھا۔ صرف محمد شاہ ہی نہیں بہت سے لوگ اخلاقی برائیوں کا شکار تھے۔

محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ اورنگِ ہند پر متمکن ہوا، لیکن اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے درّانی حکمران احمد شاہ ابدالی کے بارے میں چند باتیں بیان کر دی جائیں، جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان پر اس کے حملوں کا سلسلہ محمد شاہ کے عہد آخر (۱۷۴۷) سے شروع ہو گیا تھا، جو ۱۷۶۹ تک جاری رہا۔

احمد شاہ ابدالی

۱۷۳۷ء میں جب نادر شاہ نے قندھار پر فوج کشی کی تو جنگی قیدی کی حیثیت سے ایک شخص احمد خاں کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ نادر شاہ نے اسے دیکھا تو بہت متاثر ہوا، اور اپنے ذاتی خدمت گاروں اور چوب داروں کی جماعت میں شامل کر لیا، جنہیں "یساول" کہا جاتا تھا۔ احمد خاں بڑی

---

[۱۲۱] رودِ کوثر ص ۶۰۲، ۶۰۳ بحوالہ نتائج المعانی ۱۷۵، ۱۷۶

صلاحیتوں کا مالک تھا، وہ بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا، نادر شاہ کے اعلیٰ اور قابلِ اعتماد فوجی افسروں میں گردانا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ نادر شاہ نے اس پر مزید اعتماد کیا اور اسے خزانے کا مہتمم بنا دیا۔ وہ نادر شاہ کی مجلسِ کارکُن کا رکن بھی مقرر ہو گیا تھا۔ نادر شاہ کھلے دربار میں سب کے سامنے اس کی تعریف میں کہا کرتا تھا کہ میں نے ایران، توران اور ہندوستان میں کوئی شخص ان خوبیوں اور صلاحیتوں کا حامل نہیں دیکھا جو احمد خاں کی ذات میں پائی جاتی ہیں۔ نادر شاہ اکثر جنگی مہموں میں احمد خاں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ فاتح کی حیثیت سے دہلی آیا اور محمد شاہ کے محل میں داخل ہوا تو احمد خاں اس کے ہم رکاب تھا اور دیوانِ عام میں نظام الملک آصف جاہ کے قریب بیٹھا تھا۔ نظام الملک نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے سے شہامت اور عظمت کے آثار نظر آئے، اور کہا کہ یہ شخص ضرور بادشاہ بنے گا۔ یہ بات نادر شاہ کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ اس نے احمد خاں کو بلایا اور جیب سے چاقو نکال کر اس کے کان تھوڑے تھوڑے کاٹ دیے، اور کہا "جب تم بادشاہ ہو جاؤ گے تو ان کو دیکھ کر میری یاد تازہ ہو جائے گی۔"

۲ جون ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ اپنے کیمپ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ملک میں انتشار پھیل گیا اور بدنظمی پیدا ہو گئی۔ یہ حالات احمد خاں کے لیے نہایت فائدہ مند ثابت ہوئے اور اس نے افغانستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہاں یہ واقعہ بھی لائقِ ملاحظہ ہے کہ نادر شاہ کے قتل کے بعد جب احمد خاں افغانستان کی طرف بھاگا تو لاہور کے ایک بزرگ شاہ محمد صابر کو اپنے ساتھ لیا۔ شاہ محمد صابر نے نادر شاہ کے قتل سے تین دن

پہلے پیشین گوئی کی تھی کہ احمد خاں بادشاہ ہوگا۔ ابھی یہ افغانستان بھی نہ پہنچے تھے کہ شاہ محمد صابر نے احمد خاں سے اصرار کیا کہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ احمد خاں نے اعلان کرنے میں تامّل کیا تو شاہ محمد صابر نے اس کو زبردستی مٹی کے ایک ڈھیر پر بٹھا دیا اور کہا "یہ تمھارا تخت ہے"۔ پھر گیہوں کا ایک خوشہ اس کے سر پر رکھا اور کہا "تم درّانی بادشاہ ہو"۔ بہر حال احمد خاں نے احمد شاہ درّانی کے نام سے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ ابدالی ایک معروف افغان قبیلہ ہے، جس سے احمد شاہ کا نسبی تعلق تھا، اس لیے احمد شاہ ابدالی کے نام سے مشہور ہوا۔

تخت نشینی سے قبل احمد شاہ کئی دفعہ ہندوستان آچکا تھا اور اس ملک کے حالات سے اچھی طرح باخبر تھا۔ اس کے مال و دولت، مرکزی حکومت کے ضعف و اضمحلال، امرائے مملکت کی رقابتوں اور فساد انگیز حرکتوں کا اسے علم تھا اور تمام معاملات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۴۷ سے ۱۷۶۹ تک اس نے ہندوستان پہ نو مرتبہ دھاوا بولا اور ہر مرتبہ اس کو زیر و زبر کیا۔ البتہ ان حملوں کے اسباب و وجوہ مختلف تھے۔ کبھی خود آیا اور کبھی اسے بلایا گیا۔

احمد شاہ ابدالی متعدد اعتبارات سے اپنے عہد کا ممتاز اور منفرد حکمران تھا۔ جہاں گیری و جہاں بانی، تدبر و سیاست، فوجی قابلیت اور عسکری صلاحیت میں بے مثل تھا۔ پھر اس کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ مذہب سے پورا تعلق رکھتا تھا۔ علما و مشائخ کی قدر کرتا اور ان سے مشورے لیتا۔ دینی مسائل میں ان سے مذاکرہ کرتا اور شرعی امور میں ان کی بات کو حتمی قرار دیتا۔۔۔ لاہور، پشاور اور بٹالہ کے مشائخ کی خدمت میں کئی دفعہ حاضر ہوا۔ دہلی، اجمیر اور پانی پت عقیدت کے جذبات کے ساتھ جاتا۔ پابند شرع اور سنی العقیدہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وسیع النظر، فراخ دل اور غیر متعصب تھا۔

شیعہ، ہندو، عیسائی، سب مذاہب کے لوگ پوری مذہبی آزادی سے اس کے ملک میں قیام پذیر تھے۔ حکمرانوں میں عام طور پر جو برائیاں پائی جاتی ہیں، احمد شاہ ان سب سے مبرا تھا۔ مے نوشی اور افیون وغیرہ کے استعمال سے اس کا دامن پاک تھا۔ شعائرِ مذہبی پہ عامل تھا۔ سادہ لیکن باوقار زندگی بسر کرتا تھا، جس کی وجہ سے اس کو ہر طبقے میں معزز و محترم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ہاں رسائی حاصل کرنا بہت آسان تھا۔ عدل و انصاف کے تقاضوں کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ اس نے ۲۰ رجب ۱۱۸۶ھ (۲۳ اکتوبر ۱۷۷۲ء) کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ہندوستان پر مسلسل نو حملے کیے اور اس ملک کو خوب پامال کیا۔ سات حملے شاہ ولی اللہ کی زندگی میں ہوئے۔

۱۔ ۱۷۴۷ء میں پہلا حملہ پنجاب پر ہوا۔ اس حملے میں وہ لاہور اور سرہند پر بلا کسی مقابلے کے قابض ہو گیا، لیکن جب آگے قدم بڑھائے تو مغل فوج سے آمنا سامنا ہوا، اور ابدالی ہزیمت اٹھا کر واپس چلا گیا۔

۲۔ ۱۷۵۰ء میں اس نے دوسری دفعہ پنجاب پر یلغار کی۔ صفدر جنگ نے مغل بادشاہ کے اصرار سے مجبور ہو کر مرہٹوں سے معاہدہ کیا، لیکن یہ معاہدہ ناکام رہا۔ اس زمانے میں معین الملک (میر منّو) لاہور کا والی تھا، اس نے ابدالی کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا اور پنجاب کا کچھ حصہ اس کے حوالے کر دیا۔ کہتے ہیں کہ معین الملک کو یہ علاقہ ابدالی کے حوالے کرنے کی ہدایت مغل بادشاہ نے کی تھی۔

۳۔ تیسرا حملہ ۱۷۵۱ء میں کیا۔ معین الملک کو حملے کی اطلاع ہوئی تو ۹ لاکھ روپے ابدالی کی خدمت میں ارسال کیے، تاکہ یہ رقم لے کر وہ واپس چلا

جائے، لیکن ابدالی نے پیش قدمی جاری رکھی۔ معین الملک نہیں چاہتا تھا کہ ابدالی سے برسرِ پیکار ہو، مگر پنجاب کے ایک با اثر امیر کوڑا مل نے حملہ آور ابدالی سے صلح کی شدید مخالفت کی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر جنگ کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں طرف کی فوجیں میدانِ محاربہ میں اتریں تو کوڑا مل لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے بعد معین الملک کی ہمت ٹوٹ گئی اور اس نے صلح کی پیش کش کی۔ احمد شاہ ابدالی نے جواب دیا کہ میں کوڑا مل سے نمٹنا چاہتا تھا، اب وہ مر گیا ہے تو لڑائی ختم ہے۔ جتنے روپے کا میں نے مطالبہ کیا تھا، وہ بھیج دو۔

۴۔ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چوتھی بار ہلہ بولا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے کشمیر کے گورنر سے اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ گورنر نے انکار کیا تو ابدالی نے حملہ کر دیا۔ اس وقت کشمیر کا راجہ رنجیت دیو تھا، جو ۱۷۳۵ سے ۱۷۸۱ء تک اس خطے کا حکمران رہا۔ اس نے بہادری اور بے جگری سے ابدالی کا مقابلہ کیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا، اور کشمیر ابدالی کے قبضے میں چلا گیا۔

۵۔ ۱۷۵۷ء میں ابدالی پانچویں مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، لیکن اس حملے کی نوعیت پہلے حملوں سے مختلف تھی۔ اب وہ خود نہیں آیا تھا بلکہ بلایا گیا تھا۔ بادشاہ عالم گیر ثانی کا وزیر عماد الملک غازی الدین نہایت نخوت پسند تھا۔ بادشاہ اس کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اس نے وزیر سے نجات حاصل کرنے کے لیے ابدالی کو دعوت دی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ عالم گیر ثانی نے ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت نجیب الدولہ کے ذریعے دی تھی — اس زمانے میں مغل حکومت اس درجے کمزور ہو گئی تھی کہ احمد شاہ ابدالی اس ملک کی سیاست اور انتظامی معاملات میں دخیل ہو گیا تھا۔ وہ دہلی گیا، بادشاہی محل میں قیام کیا اور ملک کے تمام علاقوں سے حکومت کے وکیلوں اور امیروں کو بلایا گیا، انھوں نے ابدالی کو نذریں پیش کیں اور سب

نے اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا۔ البتہ جاٹوں کے سردار اور نمائندے نہیں آئے۔ ابدالی نے عماد الملک غازی الدین کو وزارت سے علیحدہ کیا اور بادشاہ کے بڑے بیٹے علی گوہر کو نائب سلطنت مقرر کیا۔ خود اپنی شادی محمد شاہ بادشاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے رچائی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کا عقد عالم گیر ثانی کی بہن سے کیا۔

ان معاملات سے فارغ ہونے کے بعد ابدالی نے جاٹوں کی طرف توجہ کی اور ان سے معرکہ آزما ہوا۔ اس مہم میں عماد الملک غازی الدین اس کے ساتھ تھا، اس نے ابدالی کی بے حد مدد کی، جس سے ابدالی بہت خوش ہوا، اور عالم گیر ثانی کو لکھا کہ اس کو دوبارہ وزیر مقرر کر دیا جائے۔ عالم گیر ثانی نے ابدالی کی یہ بات ماننے سے نہایت ادب کے ساتھ انکار کیا، لیکن ابدالی اپنی بات پہ اڑا رہا، قلم دانِ وزارت غازی الدین کے حوالے کیا اور نجیب الدولہ کو امیر الامرا کا منصب عطا فرمایا، اور بادشاہ اس قدر مجبور تھا کہ ابدالی سے کچھ نہ کہہ سکا۔

۶- ۱۷۶۰ء میں ابدالی نے چھٹی مرتبہ ہندوستان پر چڑھائی کی۔ اب ملک کے حالات بہت نازک صورت اختیار کر گئے تھے اور مرہٹوں نے آفت مچا رکھی تھی۔ ہندو، مسلمان، ملک کے راجے اور امرا و وزرا سب ان سے نالاں تھے۔ ان تمام عناصر نے ابدالی کو دعوت دی۔ شاہ ولی اللہ اور نجیب الدولہ کے نام بھی انھی لوگوں میں شامل ہیں، جنھوں نے ابدالی سے مرہٹوں کے خلاف امداد کی درخواست کی تھی۔ اسی دعوت اور درخواستِ امداد کے نتیجے میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی جو تاریخ ہند کی ایک مشہور جنگ ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے بعد مغلیہ سلطنت کا نظام درہم برہم اور اس کا تمام تر ڈھانچا بے کار ہو گیا تھا۔

صوبے مرکز سے علیحدہ اور خود مختار ہو گئے تھے۔ چنانچہ نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں، علی وردی خاں نے بنگال میں اور سعادت علی خاں نے اودھ میں اپنی اپنی آزاد حکومتوں کی بنیاد رکھ دی تھی۔ پنجاب کی بساطِ سیاست پر سکھ قدم جما رہے تھے، ملک کے جنوبی اور مغربی حصوں میں مرہٹے تسلط ہو گئے تھے اور اتنی طاقت پیدا کر لی تھی کہ بہار، بنگال اور اڑیسہ کے علاقوں کو تاراج و پامال کرنے پر اتر آئے تھے۔ خود دہلی کی مرکزی حکومت کا یہ حال تھا کہ ایرانی اور تورانی جھگڑا زوروں پر تھا۔ امرائے سلطنت باہمی بغض و عناد کا شکار تھے اور مخالف فریق کو نیچا دکھانے کے لیے مرہٹوں کے دروازے پر دستک دیتے اور ان سے طالبِ امداد ہوتے تھے، جس کے نتیجے میں دہلی کے گرد و نواح میں مرہٹوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

۱۷۵۶ء میں ملہار راؤ ہلکر اور رگھوناتھ راؤ نے جو مشہور مرہٹے تھے، شمالی علاقے کو زیرِ نگیں کرنے کی غرض سے جاٹوں کی مدد حاصل کی اور اگست ۱۷۵۷ء میں دہلی پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ نجیب الدولہ ان کے سامنے جھکنے اور صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد مرہٹوں کی غضب ناک فوج نے پنجاب کو نشانہ بنایا اور اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قابض ہو گئی اور اپنی طرف سے لاہور کی ولایت آدینہ بیگ کے سپرد کی۔ آدینہ بیگ کی وفات کے بعد پنجاب میں پھر مخالفانہ ہنگامے ہونے لگے تو دتاجی سندھیا نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ پنجاب کا رخ کیا اور صورت حال پر قابو پایا۔ اب اس نے پنجاب کی حکومت ایک مرہٹے سباجی سندھیا کے سپرد کی۔ یہ ملک میں مرہٹوں کے نمو اور عروج کا زمانہ تھا اور ان کے حوصلے لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی طاقت کا مزید مظاہرہ کرنے کی خاطر روہیل کھنڈ پر یلغار کرنے کا عزم کیا۔

بہر حال تاریخ ہند کا یہ ایک نازک موڑ تھا۔ حالات اتنی تیزی سے بگڑ رہے تھے کہ مغل بادشاہ ان پر قابو پانے سے عاجز آگئے تھے اور امرا

کے آپس کے اندرونی جھگڑوں نے ان کو اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اس دور کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایک طرف تو نجیب الدولہ کو ہمّت اور جرأت سے مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کیا، دوسری طرف افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان کا قصد کرے اور اس ملک کے لوگوں کو مرہٹوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائے۔

۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب کا عزم کیا اور ۲۷ نومبر کو سرہند تک پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ دہلی کو روانہ ہوا۔ تھانیسر پہنچا تو مرہٹہ جرنیل داتاجی سندھیا اپنی فوج لے کر مقابلے کو آیا، لیکن شکست کھائی۔ یہ وہی داتاجی سندھیا ہے، جس نے ۶ جنوری ۱۷۶۰ء کو دہلی آکر نظام الدین اولیا کے مزار کو لوٹا تھا اور پھر اس سے تین دن بعد ۹ جنوری کو دہلی سے دس میل دور براری گھاٹ پر لڑائی میں مارا گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کی فوجیں آگے بڑھیں تو جنکوجی سندھیا اور ملہار راؤ ہلکر نے اپنے لشکر کے ساتھ اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ جب پیشوا کو اس ناکامی کا علم ہوا تو اپنے جنگ جو جرنیل سداشیو راؤ بھاؤ کو ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ یہ وہی مرہٹہ جرنیل تھا جس نے تھوڑا عرصہ پیشتر نظام دکن کو شکست دی تھی اور جس کی جواں مردی کی سارے دکن میں دھوم مچی تھی اور جس کی بہادری کی داستانوں سے یہ پورا علاقہ گونج رہا تھا۔ بھاؤ بلاشبہ بہادر جرنیل تھا۔ وہ مختلف شہروں اور قصبوں کو روندتا ہوا دہلی پہنچا اور ۳ اگست ۱۷۶۰ء کی صبح کو اس نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے کئی دیگر علاقوں کو پامال کیا اور ۲۹ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو اس کا لشکر پانی پت کے میدان میں اترا۔

احمد شاہ ابدالی پہلے ہی غصّے سے بھرا ہوا تھا، لیکن جب اس کو

سداشیو راؤ بھاؤ کے ان مظالم کا جو وہ راستے میں مظلوم رعایا پر توڑتا آیا تھا، پتا چلا تو اور طیش میں آگیا اور باغ پت کے قریب دریائے جمنا عبور کر کے یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت کے میدان میں آکر خیمہ زن ہو گیا۔

یہ وہی پانی پت کا میدان ہے جو اس سے پہلے دو عظیم اور ہولناک جنگوں کا تماشا دیکھ چکا تھا اور دودمانِ مغلیہ کے دو نامور بادشاہوں ـــــ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کے مقابلے میں ظہیرالدین بابر کی بہادری اور ۱۵۵۶ء میں ہیموں بقال کے مقابلے میں جلال الدین اکبر ـــ کی شجاعت کے نقش جس کے سینے میں ثبت ہو چکے تھے۔ اب دو سو سال بعد وہ تیسری جنگ کا نظارہ دیکھنے کو بے تاب تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے میدانِ جنگ میں قدم رکھتے ہی ایک باصلاحیت جرنیل کی حیثیت سے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور مرہٹوں کی رسد کے راستے بند کر دیے۔ اس جنگ میں روہیلوں کی فوج بھی ابدالی کے ہم عنان تھی۔ ڈھائی مہینے جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس اثنا میں کبھی صلح کی بات چیت بھی ہو جاتی۔ بالآخر مرہٹے صلح سے بالکل مایوس ہو گئے اور ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ کی تاریخ فیصلہ کُن ثابت ہوئی۔ شروع شروع میں مرہٹہ فوج کا پلّہ بھاری تھا اور ابدالی کی فوج کے دستے پسپا ہونے لگے تھے۔ مرہٹوں کا توپ خانہ اتنا مضبوط تھا کہ اس نے مسلسل گولہ باری سے قیامت بپا کر دی، لیکن روہیلوں نے بھی مقابلے میں جان کی بازی لگا دی اور نہایت بہادری سے توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جنگ میں ابدالی کو اپنی فوج میں شکست کے آثار نظر آنے لگے، وہ انتہائی نازک وقت تھا۔ اس نے اپنی محافظ فوج کے جوانوں کو حکم دیا کہ بھاگنے والوں کو روکو، جو نہ رکیں انھیں قتل کر دو۔ چنانچہ ابدالی کی محافظ فوج نے میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں کو سختی کے ساتھ روکا۔ اب ... زیادہ تیزی سے ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد

مرہٹے پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ سداشیو راؤ بھاؤ اور پیشوا کا بیٹا وشواس راؤ میدان میں مارے گئے اور بڑے بڑے سردار اور فوجی قتل ہوئے۔ مادھوجی سندھیا (جو لنگڑا ہو گیا تھا) اور ملہار راؤ ہلکر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بھاگتے ہوئے مرہٹوں کا ابدالی کی فوج نے، جس میں روہیلے بھی شامل تھے، دُور تک تعاقب کیا۔ میلوں تک مرہٹوں کی لاشیں نظر آتی تھیں۔ دیہات کی عورتیں بھی گھروں سے باہر نکل آئیں، انھوں نے مرہٹہ فوج کو خوب لُوٹا۔ مقتولین کی تعداد ۳۲ ہزار کے قریب تھی، اور جو لوگ قید ہوئے، وہ کم و بیش بائیس ۲۲ ہزار تھے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ مرہٹوں نے بھاگتے وقت میدانِ جنگ میں جو مال و دولت چھوڑا، اس کے علاوہ پچاس ہزار گھوڑے، دو لاکھ گائیں، کئی ہزار اونٹ اور پانچ سَو ہاتھی ان کے کیمپوں سے ابدالی کی فوج کے ہاتھ آئے۔ شکست کے بعد مرہٹوں کی بے چارگی کا یہ واقعہ قابلِ بیان ہے کہ سورج مل جاٹ نے بیس ہزار مرہٹوں کو ایک ایک کمبل اور دو دو روپے فی کس دے کر دکن روانہ کیا۔

بہر حال پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو ابدالی کے مقابلے میں اس ذلّت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا کہ ایک مصنف کے بقول "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی"۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے بعد مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو، مرہٹوں کے قومی رہنماؤں اور فوجی سرداروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکے میں صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی — لیکن اس کے باوجود تاریخ کے تسلسل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرہٹوں کی طاقت ختم نہیں ہوئی، ان کی تگ و تاز اس کے بعد بھی جاری رہی، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ خود بادشاہِ دہلی مرہٹوں کا محتاج ہو گیا۔

جنگ سے فارغ ہو کر ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی دہلی میں داخل ہوا۔

مرہٹوں کے ایام اقتدار میں اس شہر کی حالت نہایت خستہ اور خراب ہو چکی تھی۔

اگر مغلیہ سلطنت میں تھوڑی بہت رمق باقی ہوتی اور اس کے حکمران عقل و شعور سے کام لیتے تو اس جنگ کے نتائج اس کے لیے نہایت فائدہ مند ہو سکتے تھے اور اس کے اقتدار کا زمانہ ہندوستان میں طول کھینچ سکتا تھا۔ لیکن مغل حکومت کے جسم سے جان نکل چکی تھی اور خالی ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی جب پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے مصروفِ پیکار تھا وہ مغل حکمران شاہ عالم ثانی کا عہد تھا اور شاہ عالم ثانی اس زمانے میں بہار میں فروکش تھا۔ جنگ کے اختتام پر احمد شاہ ابدالی دہلی آیا تو اس نے شاہ عالم ثانی کو دہلی بلایا اور اپنا آدمی بھیجا کہ بعض ضروری مسائل کے متعلق اس سے گفتگو کرنا مقصود ہے مگر وہ نہیں آیا۔ پھر ابدالی نے شاہ عالم ثانی کی والدہ نواب زینت محل سے عرض کیا اور ان سے بیٹے کے نام خط لکھوایا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

احمد شاہ ابدالی قلعے میں آگئے ہیں .... آج رجب کی ۲۰ تاریخ تک میں ان سے کئی مرتبہ مل چکی ہوں۔ وہ تمہارے یہاں آنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں .... میرے بیٹے! تم آؤ اور یقین رکھو کہ تمہارے آنے پر سب معاملات طے پا جائیں گے ... (احمد شاہ ابدالی کے بیٹے) تیمور شاہ نے بڑے خلوص اور محبت سے مجھے تحفے بھیجے ہیں۔ تمہارے بدخواہ بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں گے، تم ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ میرے بیٹے! تم یہاں جلد پہنچو، اگر خدانخواستہ احمد شاہ ابدالی تم سے ملے بغیر چلے گئے تو پھر تم نئی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

شاہ عالم ثانی کو دہلی بلانے کی متعدد وجوہ میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزوں کے حلقۂ اقتدار سے نجات حاصل کرلے اور دہلی آکر احمد شاہ ابدالی کی موجودگی میں اپنی طاقت کا جائزہ لے اور اسے مستحکم کرنے کی طرف توجہ کرے۔

لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

احمد شاہ ابدالی ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ کو دہلی میں داخل ہوا تھا، ڈیڑھ مہینے سے کچھ اوپر دہلی میں رہا۔ اس نے ۲۰ مارچ ۱۷۶۱ کو اپنی فوج کو روانگی کا حکم دیا۔ اس کی فوج نے دہلی سے نکلتے وقت شہر میں خوب لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا اور تین دن تک لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کیے رکھا۔ واپسی پر ابدالی پنجاب پہنچا تو سکھوں نے اس پر یلغار کر دی۔ فوج کے سپاہی مالِ غنیمت سے لدے ہوئے تھے، بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی، نقصان اٹھا کر افغانستان پہنچے۔

۷۔ ہندوستان پر ساتواں حملہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۲ میں کیا۔ اس حملے کا سبب سکھوں کے ہنگاموں کو ختم کرنا تھا۔

۸۔ ۱۷۶۷ میں ابدالی نے ہندوستان پر آٹھویں مرتبہ دھاوا بولا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس حملے سے ابدالی کا مقصد انگریزوں کو سرزمینِ بنگال سے نکالنا ہے، چنانچہ انگریزوں نے اپنے دفاع کے لیے فوج کا ایک دستہ الہ آباد روانہ کر دیا تھا تاکہ اودھ کے علاقے میں ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔

۹۔ ۱۷۶۹ میں ابدالی نے ہندوستان کو پھر یاد فرمایا اور سکھوں کو نشانہ بنایا۔ یہ اس کا نواں حملہ تھا، لیکن اس نازک موقعے پر ابدالی کی فوج کے بارہ ہزار سپاہیوں نے اس سے غداری کی اور اسے مجبوراً کابل واپس جانا پڑا۔

احمد شاہ ابدالی بلاشبہ کئی بہتر اوصاف کا حامل تھا۔ مرہٹوں کی بپھری ہوئی اور بے لگام طاقت کو ختم کرنا اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بات بھی اس کے بہتر کارناموں کی فہرست میں شامل ہے کہ اس نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم نہیں کی، حالاں کہ چاہتا تو کر سکتا تھا۔ وہ نو مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بار بار حملے کر کے اس ملک کا کچومر نکال دیا۔ مغل

حکومت کے اس دورِ زوال میں کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ نادر شاہ نے صرف ایک دفعہ ہندوستان کا قصد کیا اور چند گھنٹے دہلی میں قتل و غارت اور لوٹ مار کی۔ دریبہ کا دروازہ جواب تک "خونی دروازہ" کے نام سے مشہور ہے، وہی دروازہ ہے جہاں سے نادر شاہی فوج نے باشندگانِ دہلی کے قتل کا آغاز کیا تھا، مگر یہ سلسلہ صبح کے آٹھ بجے سے دوپہر کے تین بجے تک جاری رہا تھا لیکن ابدالی نے مستقل طور پر یہ راستہ دیکھ لیا تھا۔ اس کے منہ کو لہو لگ چکا تھا اور انسانی خون کی لذت سے اس کی زبان آشنا ہو گئی تھی، اس لیے وہ بار بار یہاں آیا اور اس کی فوجوں نے دہلی میں جو چاہا کیا۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دیگر امور کے علاوہ مال و زر کی ہوس بھی ابدالی کو اس کمزور ملک کو تہ و بالا کرنے پر اکساتی رہی۔ وہ جب واپس جاتا، بے پناہ دولت سمیٹ کر جاتا۔ مالی لحاظ سے اس نے ہندوستان کو نچوڑ لیا تھا۔ ایک حملے میں تو اس کی فوج نے دہلی کو دل کھول کر لوٹا، بعض شریف گھرانوں کی عورتوں نے خودکشی کر لی، متھرے میں بھی لوٹ کھسوٹ اور قتل کا بازار گرم ہوا۔ دریائے جمنا میں لاشیں تیرنے لگیں اور اس کا پانی متعفن ہو گیا۔ جب ابدالی کی فوجوں میں ہیضہ پھوٹا تو مجبوراً واپسی کا ارادہ کیا۔ لیکن چلتے چلتے ابدالی نے اپنی شادی محمد شاہ کی دختر حضرت بیگم سے رچائی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کا نکاح عالم گیر ثانی کی بہن سے کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ابدالی مجموعی طور پر اچھا بادشاہ تھا، اسلام اور مسلمانوں کا درد اپنے دل میں رکھتا تھا، نادر شاہ کی طرح سفاک اور ستم گر نہیں تھا لیکن اس کی فوج نہایت اُجڈ، خودسر اور مغرور تھی۔ وہ حملہ آور کی حیثیت سے اس ملک میں وارد ہوتی، فاتح کی حیثیت سے لوٹ مار کرتی اور اس کے باشندوں سے وہی سلوک روا رکھتی جو مفتوح قوم سے رکھا جاتا ہے۔ اس نے بے شک پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کو زیر کیا اور ان کی طاقت کو کچلا، لیکن روہیلوں

اور شجاع الدولہ کی فوجیں بھی تو اس میں شامل تھیں، جو میدان میں باقاعدہ اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہی تھیں۔ پھر خود نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ بھی شریکِ جنگ تھے، روہیلوں نے مرہٹوں کے توپ خانے پر قبضہ کر کے جنگ ... پلٹ دیا تھا۔ ایک موقع پر جب ابدالی کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ ... ہونے لگی تو روہیلوں ہی کے لشکر نے کمالِ شجاعت سے مرہٹوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا تھا۔ کیا اس بہادری کا صلہ بھی ابدالی ہی کو ملے گا اور ہندوستان کی فوجوں کے یہ کارنامے کسی شمار میں نہیں آئیں گے؟

کہا جاتا ہے کہ ابدالی کو شاہ ولی اللہ نے دعوت دی تھی۔ یہ صحیح ہے لیکن شاہ صاحب کی دعوت ایک سیاسی ضرورت پر مبنی تھی۔ وہ سیاسی ضرورت یہ تھی کہ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مرہٹے پورے ملک میں پاؤں پھیلا رہے تھے اور بلا امتیاز مذہب و ملت سب کو پریشان کرتے تھے۔ چنانچہ سیر المتاخرین کی روایت کے مطابق ہندو راجے اور امرائے مملکت بھی ان کے مظالم لامتناہی سے چیخ اُٹھے اور ان کا سر کچلنے اور باشندگانِ ملک کو ان سے نجات دلانے میں متفق اللسان تھے۔ اس کے لیے ان کی نظر احمد شاہ ابدالی پر پڑی اور وہ سب اس دعوت میں شریک تھے۔ شاہ صاحب سیاسی بصیرت کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک اذیت کو دوسری اذیت قبول کرنے سے ہی دفع کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس ضرورت سے مجبور ہو کر ابدالی کو صرف ایک مرتبہ دعوت دی تھی۔ اس کو یہ پٹا لکھ کر نہیں دے دیا تھا کہ تم سال دو سال بعد آ دھمکا کرو اور ہمیشہ اس ملک کو روندتے اور پامال کرتے رہو۔ شاہ صاحب ایک لمحے کے لیے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ملک پر جنگ کی گھٹائیں چھائی رہیں، اس کی اقتصادی حالت کو نقصان پہنچایا جائے، اس کے معاشی وسائل کو تہس نہس کیا جائے، اس کی دولت کے ذخائر دوسرے ملک میں منتقل کیے جائیں اور اس کے باشندے پریشانی کا شکار ہوں۔ شاہ صاحب ہمیشہ امن پسند رہے اور امن و سلامتی کے ساتھ تصنیف و تالیف اور خدمت

قرآن و حدیث میں زندگی گزار دی، رحمۃ اللہ علیہ۔

بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی جو دولت ہندوستان سے لے کر جاتا تھا، وہ مالِ غنیمت تھا اور فاتح شرعاً اس کا استحقاق رکھتا ہے۔ بے شک فاتح لشکر کو مالِ غنیمت کا حق پہنچتا ہے، اور مالِ غنیمت وہ ہے جو فاتح لشکر کو مفتوح فوج سے حاصل ہو۔ ملک کے عام باشندوں اور گھر بیٹھے شہریوں کے مال و دولت لوٹنے کا اسے ہرگز حق نہیں پہنچتا۔ یہ کھلی جارحیت اور ظلم ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دیتا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی فوج نے مختلف مقامات پر لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھا۔

احمد شاہ

محمد شاہ کی وفات کے وقت اس کا بیٹا مجاہد الدین محمد ابو النصر احمد شاہ وارثِ تخت ہوا۔ اس کو باپ کی موت کی اطلاع پانی پت میں ملی، نواب صفدر جنگ اس کے ہم عنان تھا۔ اس نے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) کو چترِ شاہی سر پر رکھا اور لوازمِ جلوس سے آراستہ ہوا۔ قلمدانِ وزارت نواب صفدر جنگ کے حصے میں آیا، جو خاندانِ اودھ سے تعلق رکھتا تھا۔ اب سلطنتِ مغلیہ کا وقار روز بروز گھٹتا جا رہا تھا اور مختلف علاقوں کے حکمران خود مضبوط اور مرکز سے باغی ہوتے جا رہے تھے۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ جمادی الاخریٰ ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) کے آخر میں بادشاہ کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی اور معدوم البصارت کر کے سلیم گڑھ میں قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد صفحۂ تاریخ سے اس کا نام بالکل محو ہو گیا۔ لیکن ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ مسندِ بادشاہت سے بیس سال بعد ۲ شوال ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کو قید خانے میں اس کی موت واقع ہوئی اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ یہ بادشاہ بھی علما و فقہا کا قدردان تھا۔

عالمگیر ثانی

احمد شاہ کی معزولی کے بعد ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) کو جہاں دار شاہ

کے بیٹے عزیز الدین کو عالم گیر ثانی کا لقب دے کر تخت نشین کیا گیا۔ عزیز الدین ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوا تھا اور فرخ سیر کے زمانے سے قید خانے میں پڑا تھا۔ اس کو قید سے نکال کر بادشاہ بنایا گیا تھا اور یہ اس کے بڑھاپے کا دور تھا۔ اس کی بادشاہت بالکل برائے نام تھی اور تمام اختیارات غازی الدین خاں کے ہاتھ میں تھے جو اس کا وزیر تھا۔ سلطنتِ مغلیہ گھٹتے گھٹتے اطرافِ دہلی کے چند اضلاع تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ پنجاب ہاتھ سے نکل چکا تھا، دکن اور اودھ دونوں خود مختار سلطنتیں ہو گئی تھیں۔ ملک کے بڑے حصے پر مرہٹوں کا قبضہ تھا، کچھ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل تھا۔ دہلی کا بادشاہ چند امیروں اور وزیروں کے رحم و کرم پر تھا اور اس کے تاج کی اب کوئی عزت باقی نہ رہی تھی، لیکن عیش و عشرت کا سلسلہ بدستور وہی تھا۔ بادشاہ ستر سال کی عمر کو پہنچ گیا تھا کہ فروری ۱۷۵۶ء میں محمد شاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے (جو صرف سولہ سال کی تھی اور حسین و جمیل تھی) شادی رچانی چاہی، لیکن حضرت بیگم نے انکار کر دیا اور خودکشی کی دھمکی دی۔

عالم گیر ثانی کا وزیر غازی الدین نہایت شقی القلب اور ظالم شخص تھا۔ بادشاہ کی ذرہ بھر آبرو اس کے دل میں نہ تھی اور وہ اس کو کسی بہانے ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ غازی الدین، دکن کے والی نظام الملک کا پوتا تھا اور ظلم و ستم اس کی سرشت میں داخل تھا۔ اس نے مغل بادشاہوں کے عزل و نصب اور قتل و غارت کا وہی سلسلہ شروع کر رکھا تھا جو اس سے قبل ساداتِ بارہہ کا تھا۔ ساداتِ بارہہ بھی اپنے زمانے میں بادشاہ گر کی حیثیت سے مشہور تھے اور دکن کے نظام الملک کا خاندان بھی اب یہی "خدمات" انجام دے رہا تھا۔

غازی الدین نے عالم گیر ثانی کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اس سے انتہائی سفاکانہ سلوک کیا۔ اس زمانے میں یہ بے کس و مظلوم بادشاہ امورِ سلطنت سے

دست کش ہو کر خلوت نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کا فکر و عقیدہ کچھ ایسا تھا کہ درویشوں اور فقیروں سے میل جول رکھتا اور ان کی صحبت کو اچھا سمجھتا تھا۔ ایک روز مہدی علی خاں نے جو غازی الدین خاں کا شریکِ سازش تھا، بادشاہ سے کہا کہ ایک درویش کامل کوٹلہ فیروز شاہ میں تشریف لائے ہیں اور قابلِ زیارت بزرگ ہیں۔ مہدی علی خاں نے ان کے کئی کشف اور کرامتیں بھی بیان کیں بھولا بادشاہ درویش کی عقیدت کے جوش میں مہدی علی خاں کے جھوٹ کے جال میں آگیا اور فقیر با کرامت کی زیارت کو چل پڑا۔ جب پہلے دروازے پر پہنچا، تو مہدی علی خاں نے تلوار بادشاہ سے لے لی۔ پردہ اٹھا کر اندر لے گیا اور دروازے بند کر دیے۔ بادشاہ اندر پہنچا تو دیکھا کہ موت کے فرشتے انسانوں کی صورت میں سامنے کھڑے ہیں۔ چار ازبک تلواریں سونت کر بادشاہ پر پل پڑے۔ سر تن سے جدا کر دیا اور بے سر تن کو جمنا کی ریت پر پھینک دیا۔ ایک ظلم یہ کیا کہ لاش کے کپڑے بھی اتار کر لے گئے۔ کئی روز بعد بادشاہ کی لاش ملی اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن ہوئی۔ بادشاہ کے اس مظلومانہ قتل کا سانحہ ۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) کو پیش آیا۔

عالم شاہ ثانی

عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد اس کا بیٹا ابو المظفر جلال الدین سلطان عالی گوہر شاہ عالم ثانی کے لقب سے بادشاہ ہوا۔ عالم شاہ ثانی ۷ ذیقعدہ ۱۱۴۰ھ کو پیدا ہوا اور ۳۲ سال کی عمر میں ۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) کو تختِ حکومت پر بیٹھا۔

عالم شاہ ثانی کو احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر ثانی کا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ غازی الدین خاں اس کا مخالف تھا۔ وہ ابدالی کی موجودگی میں تو خاموش رہا، لیکن ابدالی کے دہلی سے چلے جانے کے بعد اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈالنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ چنانچہ اس نے فوج کو حکم دے کر محل کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن شہزادے نے ہمت

سے کام لیا اور گرفتاری سے بچ گیا۔ اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے وہ رات کی تاریکی میں محل کے روشن دان سے کودا اور دیواروں کو پھاند کر باہر آگیا۔ باہر اس کے کچھ ساتھی گھوڑے لیے تیار کھڑے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور گھوڑے جمنا میں ڈال کر دریا پار کیا۔ مجنوں کے ٹیلے تک پہنچے تو وہاں ایک مرہٹہ سردار فوج لیے بیٹھا تھا۔ اس نے شہزادے کا استقبال کیا اور نہایت عزت و احترام سے اپنی نگرانی میں اسے فرخ نگر تک پہنچایا۔ وہاں موسیٰ خاں بلوچ سے ملاقات ہوئی، اس نے شہزادے کو کئی ہزار روپے کی پیش کش کی۔ مرہٹہ سردار تو واپس آگیا اور شہزادہ وہاں سے نجیب الدولہ کے پاس سہارن پور پہنچ گیا، جہاں وہ آٹھ مہینے مقیم رہا۔ نجیب الدولہ نے اس کے شاہانہ مرتبے کے مطابق سامانِ سفر تیار کیا اور وہ مراد آباد، بریلی، لکھنؤ اور الہ آباد کی خاک چھانتا ہوا، عظیم آباد (پٹنہ) پہنچا۔ اسی سفر میں جب وہ بنگال جاتے ہوئے ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (نومبر ۱۷۵۹ء) میں کرم ناسا سے پار اترا تو اس کے والد عالمگیر ثانی کے قتل کا سانحہ پیش آیا، جس کی اطلاع اس کو کچھ عرصہ بعد صوبہ بہار کے ایک گاؤں "کاتولی" میں ملی۔ شہزادے نے یہ خبر سنتے ہی چند لوگوں کے سامنے کھانے کی دو میزیں ایک دوسری سے ملائیں، اوپر قالین بچھایا اور اسے تختِ سلطنت قرار دے کر شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کر کے اس پر جلوس کیا۔

افراتفری کے اس زمانے میں مغل بادشاہت کی کیا قدر و منزلت رہ گئی تھی، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ تخت نشین ہونے کے بعد یہ بادشاہ پورے دس سال تک اپنے دارالحکومت دہلی نہیں جا سکا۔ الہ آباد میں بیٹھا برائے نام حکومت کرتا رہا۔ امرا کی سازشوں اور وزرا کی رقابتوں میں گھرا، اور انگریزوں کے پنجۂ جبر میں پھنسا ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس کو چھبیس لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے اور یہ اس کو غنیمت سمجھتا تھا۔ یہ چھبیس لاکھ روپے اسے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے بدلے میں دیے جاتے تھے، بعد میں یہ بھی بند کر دیے گئے۔

اور بادشاہ کے ذاتی مملوکہ علاقے بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کردیے گئے۔ ادھر اس کا بیٹا مرزا جوان بخت مرہٹوں کے اثر و اقتدار میں پھنسا ہوا دہلی میں بیٹھا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۶۳ء کے اواخر میں بھرت پور کے سورج مل جاٹ نے پہلے تو آگرے پر چڑھائی کی، اس کے بعد بعض اور علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تخت نشینی کے بارہ سال بعد ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو بادشاہ شاہ عالم ثانی دہلی آیا، لیکن یہاں اسے نہایت تکلیف دہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ غلام قادر روہیلہ کئی قسم کے حیلے بہانے کر کے بادشاہ کے قریب ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے خلعت سے نوازا، اور منصب وزارت اور مرصّع سپر سے سرفراز کیا، اور اس نے قرآن درمیان میں رکھ کر وفاداری کا عہد کیا۔ لیکن اس بدبخت نے بادشاہ کو سلیم گڑھ کے قلعے میں محبوس کر دیا، اور ایک محبوس شہزادے بیدار بخت کو جیل سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔ اس ناہنجار نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، ۹ ذیقعدہ ۱۲۰۲ھ کو بادشاہ کی آنکھیں بھی نکال دیں۔ پھر نہایت رعونت اور نخوت کے ساتھ بولا "اب تجھے کیا سوجھتا ہے۔" شاہ عالم نے جواب دیا "مجھے وہ قرآن پاک دکھلائی دے رہا ہے جو تیرے اور میرے درمیان ہے۔"

جفا کار اور ستم گر غلام قادر کا انجام بھی نہایت عبرت ناک ہوا۔ پہلے تو بادشاہ کے اندھا کر دینے کی خبر دبی رہی، لیکن جونہی لوگوں کو اس کا علم ہوا، وہ "تھرا" اٹھے اور قلعے کے گرد جمع ہو گئے۔ مرہٹہ فوج بھی بادشاہ کی مدد کو پہنچی۔ غلام قادر رات کے اندھیرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا لیکن گھوڑا ایک گڑھے میں گر پڑا، گھوڑا تو اٹھ کر دوڑ گیا، مگر غلام قادر بے ہوشی کی حالت میں رات بھر وہیں پڑا رہا۔ صبح کو گرفتار کر کے اسے متھرا میں گوالیار کے مادھوجی سندھیا کے کیمپ میں لے جایا گیا۔ مرہٹے بعض وجوہ کی بنا پر اب بادشاہ کے حامی تھے، وہاں اسے گدھے کی دم کی طرف منہ کر کے سوار کیا اور بازار میں پھرایا

گیا۔ غلام قادر نے گالیاں دینی شروع کر دیں تو زبان جڑ سے کاٹ دی گئی۔ پھر اندھا کر کے ناک، کان، ہاتھ پاؤں کاٹ کر شاہ عالم کے حضور بھیجا گیا۔ لیکن جو لوگ اسے لے جا رہے تھے، انھوں نے راستے میں ایک درخت پر الٹا لٹکا دیا اور اسی حالت میں ۳ مارچ ۱۷۸۹ کو اس کا دم نکل گیا بیدار بخت جسے تخت پر بٹھایا گیا تھا، زندہ درگور ہوا۔

شاہ عالم ثانی نے جو طبع موزوں رکھتا تھا، اپنی مظلومیت پر دردناک شعر کہے، چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

صرصرِ حادثہ برخاست پے خواری ما
داد بر باد سر و برگ جہاں داریِ ما

آفتاب فلک رفعت شاہی بودیم
بردر شام زوال آہ سیہ کاریِ ما

چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد
تا نہ بینیم کہ کند غیر جہاں داریِ ما

داد افغان بچہ ای شوکتِ شاہی برباد
کیست جز ذات مبرا کہ کند یاریِ ما

بود جانکاہ زر و مالِ جہان ہمچو مرض
دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما

کردہ بودیم گناہے کہ سزا ایش دیدیم
ہست مصروف کہ بخشند گنہگاریِ ما

کردہ سی سال نظارت کہ مرا داد بباد
زود تر یافتہ پاداش ستم گاریِ ما

عہد و پیماں بمیاں دادہ نمودند دغا
مخلصاں نمودند وفا داریِ ما

شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من
زود باشد کہ بیاید بمدگاریِ ما

مادھوجی سندھیہ فرزند جگر بندِ من است
ہست مصروف تلافی ستم گاریِ ما

راجہ و راؤ زمیندار امیر و چہ فقیر
حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواریِ ما

نازنینانِ پری چہرہ کہ ہمدم بودند
نیست جز محل مبارک بہ پرستاریِ ما

گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم
باز فردا دہد ایزد سر سرداریِ ما

نابینا ہونے کے باوجود عالم شاہ ثانی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا، لیکن وہ صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اس کے قبضے اور اختیار میں کوئی چیز نہ تھی۔

نو لاکھ روپے سالانہ پنشن مرہٹوں سے ملتی تھی، وہ بھی کبھی ملی، کبھی نہ ملی۔ دو ہزار روپے ماہانہ پنشن ایسٹ انڈیا کمپنی دیتی تھی۔ اس طرح وہ دو طرف سے دباؤ میں تھا۔ اس کے علاوہ نذرانوں اور چھوٹے چھوٹے رؤسا کی پیش کش کی آمدنی تھی، جس سے انگریز عہدے داروں کو بھی نذر دینی پڑتی تھی، پھر چھوٹے چھوٹے خلعتوں سے بھی بادشاہ معززین کو سرفراز کرتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ عالم شاہ ثانی ایک دُور اندیش، جرأت مند اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت اس کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے تگ و دَو بھی کی، اور ان طاقتوں سے تعاون کے لیے بھی کوشاں ہوا جو انگریزوں سے برسرِ پیکار تھیں۔ پھر اس کی سزا بھی اسے بھگتنی پڑی اور بالآخر انگریزوں کے زیرِ نگیں آنے پر مجبور ہوا۔ افسوس ہے، اس کو اس وقت حکومت ملی جب پورے ملک میں سازشوں کا وسیع جال بچھا ہوا تھا اور ہر طرف ہنگامے بپا تھے۔ حالات بگڑ چکے تھے اور اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔

شاہ عالم ثانی نے ۷ رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء) کو اس دنیائے فانی سے عالمِ آخرت کے لیے رختِ سفر باندھا۔

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے شاہانِ مغلیہ کی یہ مختصر داستان تھی۔ اس کی بے شمار تفصیلات قلم زد کر دی گئی ہیں۔ اب اس حکومت کے دورِ زوال کے دو بادشاہ باقی ہیں۔ ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی اور ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو ان کے ضروری حالات "فقہائے ہند" کی اگلی جلد میں بیان کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

یہ عالمِ ہست و بود بے شمار آلام و حوادث کی جولان گاہ ہے جو ہمیشہ

زمانے کی رفتار کے ساتھ سطحِ ارض پہ نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے دوائرِ عمل اتنے محدود اور اثرات و نتائج اس درجہ ناپائیدار ہوتے ہیں کہ انھیں ناقابلِ اعتنا سمجھ کر ترک کر دیا جاتا ہے اور تاریخ کے صفحات میں انھیں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ بعض اپنے خوش گوار یا ناخوش گوار اثرات کی وسعت و شدت کی بنا پہ عرصۂ دراز کے لیے یادوں کے گہرے نقوش اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق انھیں نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ پھر ان کی وجہ سے قوموں اور ملکوں کی تقدیر کا دھارا اپنا رُخ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اتوار کا دن، ۲۸ رمضان المبارک ۹۰۳ھ (۲۰ مئی ۱۴۹۸ء) کی تاریخ تھی کہ جنوبی ہند کی بندرگاہ کالی کٹ (ملیبار) کے ساحل پہ ایک واقعہ پیش آیا، جو اس وقت اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا معمولی اور اتنا چھوٹا تھا کہ کسی نے اس کو اہمیت نہ دی۔ لیکن آگے چل کر یہ واقعہ پاک و ہند کی تجارتی اور سیاسی فضا میں ایسے اسباب پیدا کرنے اور ایسے عناصر کے قدم جمانے کا باعث بن گیا کہ یہ برِصغیر اجنبی اقتدار کی زنجیروں میں جکڑا گیا اور طویل مدت تک محکومی و غلامی کی سزا بھگتتا رہا ـــــ یہ پرتگیزوں کی آمد کا واقعہ تھا، جو واسکوڈی گاما کی قیادت میں چار چھوٹے جہاز لے کر ایک عرب ماہر بحریات احمد بن ماجد نجدی کی رہنمائی میں راس امید کا چکر کاٹتے ہوئے کالی کٹ کے ساحل پہ اترے تھے۔ اس کے بعد انگریزوں کے یہاں تک پہنچنے کے لیے راستہ ہموار ہوا۔

پھر اس ملک کے سیاسی افق پر جس کا کاشانۂ تقدیر کافوری شمعوں سے جگمگا رہا تھا، سیاہ بادل چھا گئے اور وہ یورپی ممالک جو تجارتی لحاظ سے تاریک گوشوں میں سمٹے بیٹھے تھے، ممتاز حیثیت اور نئی شان و شوکت سے ابھر کر سامنے آئے۔

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ پرتگیزوں کے ساحل ہند پر ورود سے قبل بحیرۂ روم، بحیرۂ اٹلانٹک، بحیرۂ قلزم، بحر ہند اور بحرالکاہل کے سینے پر عرب مسلمانوں کے سفینے تیرتے پھرتے تھے، جن کی ترکتازیوں کا سلسلہ چین اور جاوا تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ پرتگیزوں نے ان کے بیڑے تباہ کر دیے اور تجارت پر قبضہ کر لیا۔

یہ ایک طویل داستان ہے جو بہت سے تلخ حقائق اپنے اندر لیے ہوئے ہے، یہاں اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ساحل ہند پر پہلی بحری تجارتی یلغار کرنے والا یورپی قافلہ پرتگیزوں کا تھا۔ پھر ان کی جگہ ہالینڈ کے ولندیزیوں نے لی، ان کے بعد انگریز اور فرانسیسی جہاز راں بحر ہند میں وارد ہوئے۔ برصغیر کی سمندری تجارت کے اکھاڑے میں ان دونوں کے درمیان شدید مقابلہ ہوا، اور دونوں نے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ بالآخر اس کش مکش میں انگریز غالب آئے اور پھر آہستہ آہستہ وہ برصغیر پر قابض ہو گئے۔

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو آگے چل کر برصغیر کی فرماں روا بن گئی، ۱۶۰۱ء میں ہندوستان کو پہلے تجارتی جہاز روانہ کیے، اور شروع ہی میں اسے بے پناہ منافع حاصل ہونے لگا، یہاں تک کہ بارھویں سفر میں ہر حصے دار کو ۳۴۰ فی صد منافع ہوا۔ اس منافعے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے تاجروں اور یہاں کی حکومت نے انگریز تاجروں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا اور ان کو اپنے دامنِ محبت میں جگہ دی۔ جہاں گیر کے عہد میں جب کپتان ہاکنز دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے فراخ دلی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۶۰۸ء میں اس کو سورت میں جو اس زمانے میں مشہور بندرگاہ تھی، کوٹھی تعمیر کرنے کی اجازت ملی۔ یہ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کا دور تھا۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۶۱۳ء میں سر طامس برطانوی

سفیر کی حیثیت سے ہندوستان آیا تو جہاں گیر اس کی شائستگی اور قابلیت سے بہت متاثر ہوا، اور اسے اس مغل بادشاہ کی نجی صحبتوں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اب سورت کے علاوہ احمد آباد، برہان پور، آگرہ، اجمیر اور کھمبایت وغیرہ شہروں میں انگریزوں کی کوٹھیاں اور کمپنی کے گودام تعمیر ہونے لگے۔ کمپنی کے ملازم لاکھوں کا لین دین کرتے تھے۔ ان سے برصغیر کے تاجروں کی ہمدردیوں کا یہ حال تھا کہ کسی انگریز کو مکان نہ ملتا تو ہندی تاجر اس کے لیے اپنا مکان خالی کر دیتا۔ قرض کی ضرورت ہوتی تو خوشی سے مطلوبہ رقم پیش کر دیتا، یا اس کا ضامن ہو جاتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت جلد بحری برتری حاصل کر لی تھی اور بحر ہند میں اس کے تجارتی جہاز دندناتے پھرتے تھے۔ ایک مرتبہ جہاں گیر کے عہد میں یہ انگریزی کمپنی اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر مغل حکومت سے باقاعدہ بحری جنگ پر تیار ہو گئی تھی۔ فریقین کے درمیان وجہ مخاصمت کمپنی کے کارندوں کی یہ شکایت تھی کہ شاہی ملازم تجارتی مال درآمد پر محصول لینے میں سختی کرتے اور رشوتیں لیتے ہیں، اور حکومت ہند کے کارکنوں کو یہ شکوہ تھا کہ بدیسی تاجر، ان دیہات سے جو ساحلِ سمندر پر واقع ہیں، بچے پکڑ کر لے جاتے ہیں اور غلام بنا کر انھیں فروخت کرتے ہیں۔ نیز ہندی تاجروں کے جہازوں کو سمندر میں لوٹ لیتے ہیں، اس طرح یہ لوگ بحری قزاقی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے جب لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی تو بدیسی تاجروں میں میدان میں لڑنے کی طاقت تو تھی نہیں، وہ کوٹھیوں سے اپنا سامان اٹھا کر جہازوں میں منتقل کر دیتے اور سمندر میں ہندی جہازوں کو خوب لوٹتے اور عملے کے ارکان کو گرفتار کر لیتے۔ بالآخر ہندی تاجر فریاد لے کر حکومت کے پاس جاتے اور وہ ان کا بے جا مطالبہ منظور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس طرح کی دو لڑائیاں — ایک کلکتے میں اور دوسری سورت کے قریب — انگریزوں نے اورنگ زیب عالم گیر سے لڑیں اور یہ

مضبوط مغل حکومت ان کے سامنے بے بس ہوگئی۔ اسی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت اور مرہٹوں کی بھی شدید مخالفت پر اتر آتی، لیکن اسے کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز کارکن محض تاجر نہ تھے، سپاہی بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب برصغیر میں وسیع پیمانے پر طوائف الملوکی پھیلی اور امن عامہ خطرے میں پڑ گیا تو کمپنی کے کارپردازوں کی حفاظت کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں کرنا پڑا۔ ان کی ساحلی کوٹھیاں جو بمبئی، سورت، مدراس اور کلکتے وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں تھیں، پہلے ہی سے قلعہ بند تھیں، مسلّح جوان ابتدا ہی سے ان کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھے اور ان کے جہاز یوم اوّل ہی سے حربی ضروریات کو پیش نگاہ رکھ کر بنائے گئے تھے۔ ان کی یہی فوجی طاقت تھی، جس کو انھوں نے اورنگ زیب کے انتقال کے بعد برصغیر میں پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا اور اس سے خوب کام لیا۔

اٹھارھویں صدی میں مغلیہ سلطنت کی عظمت کا چراغ گل ہونے لگا تو برصغیر کے متعدد علاقوں میں نئی حکومتیں ظہور میں آئیں۔ مرہٹوں نے مغلوں کی شان و شوکت کے کھنڈروں پر اپنی طاقت کے محل تعمیر کیے، پورے مہاراشٹر اور وسطی ہند پر قبضہ جما لیا، اور مالوہ اور گجرات تک تگ و تازکی۔ نادر شاہ ایران سے چلا اور دلّی کو تہ و بالا کر دیا، اور صدیوں کے جمع شدہ مال و متاع کو چشم زدن میں تاراج کر دیا۔ خود مغلوں نے جن لوگوں کو مختلف صوبوں کے والی اور حاکم مقرر کیا تھا، وہ اپنی اپنی جگہ خود مختار بن بیٹھے۔ بنگال میں علی وردی خاں، اودھ میں، برہان الملک سعادت علی خاں، روہیل کھنڈ میں افغان سردار اور دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے بلاشرکت غیرے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی اطاعت سے منہ موڑا، خراج دینا بند کیا اور نذرانے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس صورتِ حال سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز کارکنوں کے

حوصلے اور بڑھے اور وہ براہِ راست سیاسیات میں دخل دینے لگے۔ پھر جن علاقوں کی حکومتیں مالی لحاظ سے کمزور تھیں، انگریز سرمایہ داروں نے ان کی روپے پیسے سے مدد کرنا شروع کی اور ان کو قرض دینے لگے تاکہ یہ ان کے زیر بارِ احسان رہیں اور ان کے سامنے دم نہ مار سکیں۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنی مصلحتوں کی بنا پر محمد علی کو کرناٹک کی صوبے داری پر متعین کیا تو اس کو روپے کی ضرورت پڑی کیونکہ وہ فوجیوں کی تنخواہیں بھی ادا نہیں کر سکتا تھا اس وقت اس نے انگریزوں کی طرف رجوع کیا اور اپنی مجبوری بیان کی تو انھوں نے چند انگریز سرمایہ داروں سے اس کو چار لاکھ اشرفی بہ طور قرض دلائی اور شرط یہ عائد کی کہ مدراس کی حکومت نواب کی ضمانت دے، اور ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا کہ چند اضلاع بصورتِ رہن قرض خواہوں کے سپرد کیے جائیں جن کی مال گزاری سے وہ سود وصول کرتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب کے صوبے کے کئی ضلعے عملاً انگریزوں کے ماتحت چلے گئے، وہ ان کا مالی لحاظ سے محتاج بھی ہو گیا اور اس کے علاقے میں کمپنی کا ولایتی مال بھی خوب فروخت ہونے لگا، یعنی یہ علاقہ ان کی ایک مستقل منڈی بن گیا۔

ابھی کرناٹک کا مرہونہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز سرمایہ داروں اور تاجروں کے قبضے میں تھا کہ ۱۷۵۷ء میں بنگال کا علاقہ بھی ان کے زیر نگیں آ گیا۔ یعنی جنگِ پلاسی میں انگریزوں کے مقابلے میں میر جعفر کی غداری سے سراج الدولہ کی شکست ایک عظیم انقلاب کا باعث بنی کہ جس سے برصغیر کی سیاسی فضا بالکل بدل گئی اور اس ملک میں انگریزوں کے قدم اور مضبوط ہو گئے — اس کی ضروری تفصیل آگے آ رہی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جب مرکزی طاقت کے کمزور ہو جانے کے باعث صوبوں کے والی اور گورنر آزاد ہو گئے اور ان کے علاقوں کے خراج اور نذرانوں کی آمدنی جو مغل بادشاہ کے مرکزی خزانے میں جاتی تھی، بند ہو گئی، پھر حاکموں کے عزل و نصب کے بارے میں بھی بادشاہ کے حکم کو ناقابل

تعمیل قرار دیا جانے لگا تو ملک کے تمام عمال و حکام خود سر ہو گئے اور باہم لڑائی جھگڑے پر اتر آئے۔ ان آزاد، خود سر اور خود مختار حکومتوں اور جماعتوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز اہل کار بھی شامل تھے، جو ڈیڑھ سو سال سے اس ملک میں رہ رہے تھے۔ اس طویل مدت میں ان کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی، اب وہ محض غیر ملکی یا بدیسی نہیں رہے تھے بلکہ ملک کے دوسرے باشندوں، افغانوں، مغلوں، مرہٹوں اور دیگر قوموں کی طرح ہندی اور دیسی ہو گئے تھے۔ یا یوں کہیے کہ اس برصغیر میں جو ہمیشہ مختلف قوموں کا "عجائب خانہ" رہا ہے ایک سفید فام قوم کا اضافہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے ہندی طرزِ معاشرت اختیار کر لی تھی، شہری آبادیوں میں یہاں کے باشندوں سے گھل مل کر رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کی زبان سیکھ لی تھی اور شعر و شاعری کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور شعر کہتے اور پڑھتے تھے۔ پھر یہاں کے باہمی سیاسی جھگڑوں میں مختلف فریق ان سے مدد لیتے اور وہ مدد دیتے تھے۔ انگریز چوں کہ ایک منظم قوم تھے اور برصغیر کے لوگ افراتفری اور انتشار کا شکار ہو گئے تھے، اس لیے آگے چل کر اپنی مضبوط تنظیم کی وجہ سے وہ اس ملک پر غالب آ گئے اور یہاں کے باشندے ان کی محکومی کی زنجیر میں جکڑے گئے۔

جنگِ پلاسی کے بعد بنگال پر میر جعفر کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی، تمام اہم معاملات اور سلطنت کے دروبست پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ تھا۔ اس سے کمپنی کو آگے قدم بڑھانے کے خوب مواقع میسر آئے، اور وہ جلبِ مال و زر میں بے لگام ہو گئی۔ اس سے قبل فرخ سیر کے زمانے میں انگریزی مال کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا جا چکا تھا۔ وہ اس طرح کہ مغل بادشاہ فرخ سیر ایک مرتبہ بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر ہملٹن نے اس کا علاج کیا اور بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ڈاکٹر ہملٹن سے کہا کہ بتاؤ تمھیں کس انعام و اکرام سے نوازا جائے؟ ڈاکٹر نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں مانگا، عرض

کیا، انگریزوں کے تجارتی مال سے محصول معاف کر دیا جائے ۔ بہر حال انگریزوں کے حق میں برصغیر کے حالات روز بروز ساز گار ہو رہے تھے اور کمپنی کے علاوہ انگریزوں نے نجی طور پر بھی تجارت شروع کر دی تھی ۔ بنگال کی ہر منڈی میں انگریز تاجر موجود تھے اور وہ پان، بانس، چاول گھی، گُھس، نمک، چھالیہ مچھلی، تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے تھے ۔ ہندی تاجران کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، کیوں کہ دیگر اخراجات کے علاوہ ان کو محصول بھی ادا کرنا پڑتا تھا، اور انگریز تاجر اس محصول سے مستثنیٰ تھے ۔

سراج الدولہ کے قتل کے بعد انگریزوں نے بنگال کی حکومت میر جعفر کے سپرد کر دی تھی، اس سے اختلاف ہوا تو اس کے داماد میر قاسم کو حکمران بنا دیا ۔ میر قاسم کے پاس ہندی تاجروں کی طرف سے انگریز تاجروں کی کاروباری بدعنوانیوں کی شکایات آنے لگیں ۔ نیز خود میر قاسم نے کمپنی کے حکام سے فریاد کی کہ انگریزوں کے ہر چھوٹی بڑی تجارت پر قبضہ کر لینے سے میری حکومت بہت خسارے میں ہے اور انگریز تاجروں سے محصول معاف ہونے کی وجہ سے حکومت کو پچیس لاکھ روپے سالانہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے ۔ لیکن ان شکایتوں اور فریادوں کا انگریزوں پر ذرہ اثر نہ ہوا ۔ بالآخر میر قاسم نے ہندی تاجروں سے بھی محصول لینا بند کر دیا ۔ یہ بات کاروباری نقطہ نظر سے انگریزوں کے خلاف جاتی تھی، لہٰذا انھوں نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا اور نتیجۃً میر قاسم کو بنگال چھوڑ کر شمالی ہند کی طرف جانا پڑا ۔ پھر وہاں سے وہ والیٔ اودھ شجاع الدولہ اور شاہ عالم بادشاہ کے پاس پہنچا ۔ ان سے فوجی مدد لے کر بنگال کا رخ کیا، اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں سے جنگ لڑی اور شکست کھائی ۔ اس سے اگلے سال ۱۷۶۵ء میں اللہ آباد کا صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے بادشاہِ دہلی کی طرف سے کمپنی کو بنگال کا دیوان یعنی مال گزاری وصول کرنے والا حاکم مقرر

کیا گیا اور اس کے بدلے کمپنی کی طرف سے بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہو گیا۔ علاوہ ازیں بنگال کے میر جعفر (جس کو میر قاسم کے حکومت چھوڑ جانے کے بعد دوبارہ بر سرِ حکومت لایا گیا تھا) کے ذاتی مصارف اور انتظامی محکموں کے اخراجات کے لیے ایک رقم معین کر دی گئی اور طے پایا کہ ان دو مصارف کے بعد جو کچھ بچ رہے گا، وہ کمپنی کا ہو گا۔ اس معاہدے کی تحریر تک تو حکومت میں انگریزوں کا عمل دخل باقاعدہ نہ تھا، لیکن اس فرمانِ شاہی کی رو سے ان کو حکومت پر قبضہ کرنے کی باضابطہ سند حاصل ہو گئی۔

انگریزوں کی اس کمپنی نے محمد علی سے کرناٹک پر حکومت قائم کرنے کے صلے میں لاکھوں روپے کمائے اور کئی اضلاع حاصل کیے۔ اس کے علاوہ اس نے میر جعفر سے بنگال کی حکومت کا سودا کیا۔ پہلے میر جعفر سے سراج الدولہ کو ختم اور اس کی گدی پر قبضہ کرنے کے بدلے میں ۱۷۵۷ء میں ساڑھے تین کروڑ سے زائد رقم وصول کی۔ پھر ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کو ہٹا کر اس کی جگہ میر قاسم کو تخت نشین کیا، اور میر قاسم سے تقریباً ستائیس لاکھ روپے ملے۔ اس کے بعد ۱۷۶۳ء میں پھر میر قاسم کو الگ کر کے میر جعفر کو لائے اور اس سے کم و بیش ڈیڑھ کروڑ روپے میں سودا چکایا۔ پھر ۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ کی طرف رجوع کیا اور اس سے کوئی بیس لاکھ روپے لیے اور بنگال میں اس کی حکومت قائم کی۔ اس طرح کمپنی نے پانچ کروڑ روپے تو نقد کمائے اور جو مراعات حاصل کیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ اس قسم کے مختلف طریقوں سے ۱۷۷۰ء تک کمپنی اور اس کے اہل کاروں کو کوئی بیس کروڑ روپے کی رقم وصول ہوئی۔ پھر تھوڑے عرصے بعد یہ رقم چالیس کروڑ روپے کو پہنچ گئی۔ اندازہ لگائیے اس زمانے میں روپے کی قیمت کیا تھی اور اب کیا ہے اور زمانۂ حال کے حساب کے مطابق سوا دو سو سال قبل اس رقم کو کتنی اہمیت حاصل ہو گی۔

مشرقی ہند میں بنگال، بہار اور اڑیسہ بہت زرخیز اور بڑے صوبے تھے۔

انگریزوں نے سب سے پہلے یہیں قدم جمائے۔ بادشاہِ دہلی سے جس کو غلام قادر روہیلہ نے آنکھیں نکال کر اندھا کر دیا تھا، کمپنی نے چھبیس لاکھ روپے سالانہ دینے کے وعدے پر انھی تینوں صوبوں کی دیوانی لکھوائی، لیکن بعد میں بادشاہ کے چھبیس لاکھ روپے بھی ضبط کر لیے اور اس کے مملوکہ علاقے بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ یعنی نہ سراج الدولہ سے وفا کی، نہ میر جعفر اور میر قاسم کو معاف کیا، نہ بادشاہِ دہلی کو قابلِ رحم سمجھا۔ جس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہوئی، فائدہ اٹھایا، پھر اسے بے مصرف سمجھ کر پیچھے پھینک دیا۔

بکسر کی لڑائی کے بعد لارڈ ولزلی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے گورکھپور، روہیل کھنڈ اور جنوبی دوآبے کے علاقے پر قبضہ کر لیا، پھر کرناٹک کے نواب کو معزول اور سلطان ٹیپو کو شکست دینے کے بعد وہ تمام علاقے ہتھیا لیے جو بعد میں احاطۂ مدراس میں شامل ہوئے۔

مرہٹے جن کا سرحدِ بنگال سے لے کر کاٹھیاواڑ تک، اور گوالیار سے لے کر ستارا تک ڈنکا بج رہا تھا، نہایت سخت جان قوم تھے، کمپنی نے ان کو بھی ان کے علاقوں سے بزورِ شمشیر بے دخل کیا۔ اس سے قبل یہ اورنگ زیب عالم گیر سے بھی کئی معرکوں میں شکست کھا چکے تھے اور احمد شاہ ابدالی سے بھی پانی پت کے میدان میں بُری طرح ہزیمت اٹھا چکے تھے، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان میں کمال یہ تھا کہ شکست کھانے کے بعد پھر ابھرتے اور بار بار میدان میں اترتے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں بھی آئے اور کچلے گئے۔

اب کمپنی نے برصغیر میں تقریباً تمام مخالف طاقتوں کو ختم کر دیا تھا اور اس کے مقبوضات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک قدم یہ اٹھایا کہ اپنے مقبوضہ علاقوں کی اعلیٰ ملازمتوں سے برصغیر کے لوگوں کو ناقابلِ اعتماد سمجھ کر الگ کر دیا اور ان کی جگہ انگریزوں کو بھرتی کیا۔ عدالتوں میں بھی

یہی صورت حال پیدا کردی۔

۱۷۶۵ء میں کمپنی کے دیوانی یا صیغۂ مال پر قبضے کے سات سال بعد تک بنگال میں دو عملی یہی قائم رہی۔ یعنی کمپنی کی حکومت بھی تھی اور نواب کی بھی۔ ۱۷۷۲ء میں گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے اس صورت حال کا بھی خاتمہ کردیا۔ اس نے پولیس اور فوج داری کا انتظام بھی کمپنی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہر ضلع میں کلکٹر مقرر کیے جو مال گزاری وصول کرنے کے علاوہ مقدمات مالی کے فیصلے بھی خود ہی کرتے تھے۔ اپیل کی سماعت کے لیے کلکتے میں دو عدالتیں قائم کیں، صدر نظامت اور صدر دیوانی۔ لیکن انگلستان کی پارلیمنٹ کے ارکان کو جب کمپنی کے کار پردازوں کی ان زیادتیوں کا پتا چلا جو انھوں نے باشندگان ہند پر روا رکھی تھیں، تو ۱۷۷۳ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا، جس کی رو سے بورڈ آف کنٹرول یعنی جماعت نگراں کار اور عدالت ہائی کورٹ قائم کیے۔ یہ پہلا ہائی کورٹ تھا جو شاہِ انگلستان کی طرف سے کلکتے میں قائم ہوا، اور مسٹر امپی اس کے چیف جسٹس انگلستان سے مقرر ہو کر آئے۔ ان کی تنخواہ آٹھ ہزار روپے ماہانہ تھی۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ ہائی کورٹ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے جج بعض فیصلے کمپنی کے مفادات کے خلاف بھی کر دیتے تھے۔ اب مسٹر وارن ہیسٹنگز نے یہ چال چلی کہ ان آٹھ ہزار روپے کے علاوہ جو مسٹر امپی چیف جسٹس کو انگلستان کے بادشاہ کے حکم سے ملتے تھے، کمپنی کی طرف سے مزید آٹھ ہزار روپے دینے کا اعلان کیا اور بیرونی اپیلیں بھی چیف جسٹس کے سپرد کردیں۔ اس سے گورنر جنرل کا مقصد چیف جسٹس کو روپے کا لالچ دے کر کمپنی کے مفادات کا تحفظ کرانا تھا۔

بہرحال جب عدالتوں کا نظام بھی بہت بگڑ گیا، کمپنی کی زیادتیاں بھی حد کو پہنچ گئیں اور کمپنی کے اہل کاروں کے رویے سے ہندوستانیوں کی بلاوجہ تحقیر

بھی ہونے لگی تو برطانوی پارلیمنٹ نے کئی سال بعد ۱۸۳۲ء میں کمپنی سے تجارت کا حق چھین لیا اور اس کے ہاتھ میں صرف ہندوستان کی حکومت رہ گئی، وہ بھی ۱۸۵۷ء میں ختم ہوگئی، اور اس سال سے پورا برصغیر براہِ راست برطانوی حکومت کے تسلّط میں چلا گیا۔

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا دورِ حکومت یوں تو برصغیر کے تمام لوگوں کے لیے انتہائی تکلیف کا دور تھا، لیکن مسلمان اس میں بالخصوص نہایت اذیت میں مبتلا تھے۔ کیوں کہ انگریز انھی سے حکومت چھین رہے تھے اور انھی کے درپے آزار تھے تاکہ یہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں اور اپنی غصب شدہ حکومت کے حصول کے لیے میدان میں نہ اُتر سکیں لیکن انگریزوں کی بے پناہ الم ناکیاں ان کی جد وجہد کا راستہ نہ روک سکیں اور ان کے مجاہدانہ جوش وجذبے میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکیں۔ چنانچہ برصغیر کے علمائے دین نے نعرۂ جہاد بلند کیا اور مسلمان ان کی رہنمائی میں میدانِ وغا میں اترے۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کا فتویٰ جاری کیا اور اس ملک کو دارالحرب قرار دیا۔ ان کے بھتیجے مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی نے انگریزوں کے خلاف تقریریں کیں، عوام کو ان کی مخالفت پر ابھارا اور بالآخر شاہ عبدالعزیز کے ایک پاک باز مرید وشاگرد سیّد احمد شہید بریلوی کی قیادت میں ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو جامِ شہادت نوش کیا۔ علمائے برصغیر کی عظیم جماعت ان کے ساتھ تھی۔ علاقہ میوات کا ایک غیور مسلمان جس کا نام چیتو تھا، پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ انگریزوں سے معرکہ آرا ہوا۔ غرض آزادی کی بہت سی تحریکیں جن میں مسلمان پیش پیش تھے اور بالخصوص علمائے دین جن میں مرکزی کردار ادا کر رہے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں اٹھیں۔ ان سب

تحریکوں کا ضروری تذکرہ فقہائے ہند کی آئندہ جلدوں میں ان حضرات کے حالات کے ضمن میں کیا جائے گا، جو ان تحریکوں کے قائد یا ان سے وابستہ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اَوَدھ کی حکومت

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد سلطنتِ مغلیہ میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں معرضِ وجود میں آگئی تھیں اور ان کے حکمران خود مختار ہو گئے تھے۔ ان ریاستوں میں اَوَدھ کی ریاست کا نام سرِفہرست ہے۔ اودھ ہندوستان کا ایک علاقہ ہے جو صوبہ یوپی کے کچھ اضلاع پر مشتمل تھا اور اس کا دارالسلطنت لکھنؤ تھا۔

اَودھ کا پہلا حکمران محمد امین تھا جو نیشاپور کے خاندانِ سادات سے تعلق رکھتا اور نامور تاجر تھا۔ وہ عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے دورِ حکومت میں دہلی پہنچا اور شاہی خدمات پر مامور ہوا۔ بہادر جرنیل، صاحبِ تدبیر اور بہت بڑا منتظم تھا۔ محمد شاہ بادشاہ نے ساداتِ بارہہ (حسین علی خاں اور حسن علی خاں) سے نجات حاصل کرنے اور ان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، تو محمد امین بادشاہ کا شریکِ راز تھا۔ حسین علی خاں کے قتل کے بعد حسن علی خاں سے مقابلے اور قتل کی نوبت آئی تو اس وقت بھی اس نے بڑی مستعدی کا ثبوت دیا اور اس نازک موقعے پر فتح حاصل کی۔ اس شجاعت اور مستعدی کے صلے میں پہلے یہ صوبۂ اکبر آباد کی حکومت پر فائز ہوا، پھر اسے صوبۂ اودھ کا والی مقرر کیا گیا، بعد ازاں مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اودھ کو اس نے ایک مستقل ریاست کی شکل دے دی اور زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بادشاہِ دہلی کی طرف سے برہان الملک اور سعادت خاں کے القاب سے سرفراز ہوا۔ نادر شاہ نے اسی سعادت خاں کی دعوت پر ہندوستان پر یلغار کی تھی اور اسی کے مشورے سے دہلی شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا تھا۔

پھر اس نے اسی اثنا میں ۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) کو اودھ کے حکمراں کی حیثیت سے وفات پائی۔

برہان الملک نواب سعادت خاں کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب وہ اودھ کی عنانِ حکومت سنبھالنے کے لیے جا رہا تھا اور فرخ آباد سے کشتی کے ذریعے دریائے گنگا عبور کر رہا تھا تو آبِ گنگا کی موجوں میں سے ایک مچھلی برآمد ہوئی اور اچھل کر سعادت خاں کی جھولی میں آ پڑی۔ سعادت خاں نے اس کو نیک فال سمجھ کر پکڑ لیا۔ پھر اس کی سوکھی ہوئی ہڈیاں اودھ کے آخری حکمران نواب واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ کے عجائب گھر میں محفوظ رہیں۔ کہتے ہیں کہ غالباً یہی وہ تصور ہے جس کا اثر نہ صرف قیصر باغ وغیرہ کی تصویروں میں اب تک نمایاں ہے، بلکہ حکومت اودھ کے سکوں اور سرکاری کاغذات میں بھی مچھلی کی تصویر نے نمایاں جگہ حاصل کی۔[۱۵]

سعادت خاں نے اپنے زمانۂ حکومت میں علاقۂ اودھ میں مکمل امن و امان قائم رکھا اور اس کی حدیں اتنی وسیع کر لیں کہ غازی پور، جون پور، بنارس اور چنار بھی اس میں شامل ہو گئے۔ سعادت خاں کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے اور داماد صفدر جنگ کو ۱۷۴۸ء میں مغلیہ حکومت کا وزیر مقرر کیا گیا۔ یہ وہی حکمران تھا جس نے روہیلوں کی مضبوط مسلمان قوم کے مقابلے میں مرہٹوں سے فوجی امداد طلب کی تھی۔ پھر اس ضمن میں جو جنگیں ہوئیں، ان کے نتیجے میں مرہٹے اس طرح ابھر کر سامنے آئے کہ روہیل کھنڈ پر اپنے حقوق کا دعویٰ کرنے لگے۔

صفدر جنگ کے بعد ۱۷۵۴ء میں اس کا بیٹا شجاع الدولہ اودھ کا حکمران بنا۔ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی، شجاع الدولہ

---

[۱۵] علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۲ ص ۵۶ (حاشیہ نمبر ۱)

اس کے مقابلے میں آیا اور ۱۷۶۴ء کو بکسر کے مقام پر شکست کھائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ کا صوبہ کمپنی کے قبضے میں آگیا۔ ۱۷۶۵ء میں الٰہ آباد کا عہد نامہ ہوا، جس کی رُو سے کان پور، الٰہ آباد اور فتح پور کو چھوڑ کر، اودھ کا باقی علاقہ شجاع الدولہ کو واپس دے دیا گیا۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہ پچاس لاکھ روپے کی رقم انگریزوں کو دے گا۔ ۱۷۷۳ء میں عہد نامۂ بنارس کی تکمیل ہوئی۔ اس عہد نامے کی رو سے پچاس لاکھ روپے کی یہ رقم بادشاہِ دہلی کو ادا کی گئی تاکہ وہ اپنا وقار و اقتدار بحال رکھ سکے۔ یہ ریاست چوں کہ مرہٹوں اور بنگال کے درمیان واقع تھی، اس لیے انگریزوں نے اس کو اور زیادہ اپنے زیر اثر کر لیا، اور انگریزی فوجوں کے اخراجات جو دو لاکھ دس ہزار روپے ماہانہ تھے، اسی ریاست پر ڈال دیے گئے۔ علاوہ ازیں کڑھ اور الٰہ آباد کے اضلاع جو شاہِ دہلی کے قبضے میں تھے، نواب اودھ کے ہاتھ پچاس لاکھ روپے میں فروخت کر دیے گئے، اس لیے کہ بادشاہِ دہلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے قطع تعلق کر کے یہ اضلاع مرہٹوں کے حوالے کر دیے تھے۔

۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ اودھ کا نواب مقرر ہوا تو وارن ہیسٹنگز کی کونسل کی مخالف اکثریت نے اس کا خراج دو لاکھ ۶۰ ہزار روپے ماہانہ تک بڑھا دیا اور مجبور کیا کہ وہ اضلاعِ جون پور، غازی پور اور بنارس کے شاہی حقوق مکمل طور پر کمپنی کو منتقل کر دے۔ آصف الدولہ نے ۱۷۹۷ء میں وفات پائی اور نواب سعادت علی خاں اس کی مسند پر بیٹھا۔

۱۸۰۱ء میں لارڈ ولزلی نے آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی اور اس کے جانشین نواب سعادت علی خاں کو پورا روہیل کھنڈ اور دوآب کا ایک حصہ انگریزوں کے حوالے کرنے پر مجبور کیا، چنانچہ اس علاقے کی تمام آمدنی انگریزی فوج کے خرچ کے لیے وقف کر دی گئی۔

نواب سعادت علی خاں نے ۱۸۱۴ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا

سب سے بڑا بیٹا غازی الدین حیدر وارثِ تخت ہوا۔ یہ پہلا حکمران تھا جس نے شاہِ اودھ کا لقب اختیار کیا۔ اودھ کا یہ حکمران ۱۸۲۷ء میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوا۔ اس کے بعد علاقۂ اودھ کے مندرجہ ذیل بادشاہ ہوئے:

۱۔ ناصر الدین حیدر : ۱۸۲۷ تا ۱۸۳۷ء

۲۔ محمد علی شاہ : ۱۸۳۷ تا ۱۸۴۲ء

۳۔ امجد علی شاہ : ۱۸۴۲ تا ۱۸۴۷ء

۴۔ واجد علی شاہ : ۱۸۴۷ تا ۱۸۵۶ء

۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی نے صوبۂ اودھ کا الحاق انگریزی علاقے سے کر دیا اور واجد علی شاہ کا وظیفہ مقرر کر کے اسے کلکتے میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی گئی، جہاں اس نے ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا اور اس کے ساتھ ہی اودھ کی بادشاہت ختم ہو گئی۔

سراج الدولہ

سلطنتِ مغلیہ کے زوال پذیر عہد میں جن امرائے مملکت اور وزرائے سلطنت نے مختلف علاقوں اور صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم کیں، ان میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ناظم علی وردی خاں کا نام بھی شامل ہے جس کا لقب مہابت خاں تھا۔ یہ شخص اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی چھوٹی بیٹی کا نام آمنہ بیگم تھا۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں آمنہ بیگم کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام مرزا محمد رکھا گیا۔ علی وردی خاں نے مرزا محمد کی عمدہ طریقے سے تربیت کی اور سراج الدولہ کا لقب عطا کیا۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں سراج الدولہ کا باپ دربھنگہ کے پٹھانوں کے ہاتھوں مارا گیا تو علی وردی خاں نے سراج الدولہ کو بہار کے منصبِ نظامت پر مامور فرمایا، اور موت سے پہلے ۹ اپریل ۱۷۵۶ء کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔

اس وقت بنگال میں دو یورپین قومیں آباد تھیں۔ ایک ایسٹ انڈیا کمپنی

کے انگریز، دوسرے فرانسیسی۔ لیکن ان کو بنگال میں اپنے مقبوضہ علاقوں کی قلعہ بندی کا حق حاصل نہ تھا۔ فرانسیسیوں نے تو اس پر عمل کیا، لیکن انگریزوں نے کلکتے میں اپنے قلعے (فورٹ ولیم) کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے ڈھاکہ کے دیوان راج بلبھ کے بیٹے کرشن داس کو، جس پر شاہی خزانے کے ترپن ۵۳ لاکھ روپے غبن کرنے کا الزام تھا، اپنی پناہ میں لے لیا۔ نواب سراج الدولہ نے فورٹ ولیم کے گورنر ڈریک کے پاس اپنے ایلچی نرائن سنگھ کو یہ خط دے کر بھیجا کہ اس کے یہ مطالبے منظور کیے جائیں:

۱۔ فورٹ ولیم کونسل قلعہ بندی میں مزید اضافہ نہ کرے۔

۲۔ "مرہٹہ خندق" کو جو شہر کے اردگرد کھودی گئی ہے، پر کر دیا جائے۔

۳: کرشن داس کو واپس بھیجا جائے۔

یہ مطالبات بالکل صحیح تھے لیکن ڈریک نے سراج الدولہ کے ایلچی نرائن سنگھ سے بے اعتنائی سے گفتگو کی اور بے رخی سے پیش آیا۔ ۲۰ مئی ۱۷۵۶ء کو اس نے نواب سراج الدولہ کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں کرشن داس کو واپس کرنے سے انکار کر دیا اور قلعہ بندی کے بارے میں لکھا کہ یہ اقدام خطرۂ جنگ کے پیش نظر ضروری ہے۔ ڈریک کا یہ جوابی مراسلہ نواب کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس نے اس تحریر سے اندازہ کر لیا کہ انگریزوں کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ اس نے دو اعلیٰ فوجی افسروں — درلبھ رائے اور حکم بیگ — کے نام فرمان جاری کیا کہ انگریزوں کی قاسم بازار والی فیکٹری کا محاصرہ کر کے اس میں ہر قسم کی درآمد برآمد کو روک دیا جائے، نیز بندرگاہ ہگلی سے انگریزوں کے جہازوں کی روانگی پر پابندی لگا دی جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور ۲۴ مئی ۱۷۵۶ء کو نواب کے فوجی دستوں نے فیکٹری کا محاصرہ کر لیا۔ بعد ازاں کچھ اور کمک بھی بھیج دی گئی۔ ۳ جون ۱۷۵۶ء کو خود نواب سراج الدولہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ سراج الدولہ انگریزوں کا سخت دشمن تھا، لیکن اس کے باوجود صلح کی فضا میں

اور خوش اسلوبی سے تمام مسائل کو حل کرنے کا خواہاں تھا، لڑائی جھگڑے سے بہرحال گریزاں تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعدد ذمے دار انگریزوں نے بھی اس کی تائید کی اور اس کے موقف کو صحیح قرار دیا، کیوں کہ اس نے قاسم بازار کے گرفتار شدہ تمام انگریز قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اور کمپنی کے اثاثے کو بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کے انگریز گورنر ڈریک نے نہ تو سراج الدولہ کی کسی تجویز کو لائقِ اعتنا سمجھا اور نہ اپنے انگریز ساتھیوں کی کسی بات کو قابلِ توجہ سمجھا، وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے فوج کا ایک دستہ نوشکھ ساگر کی طرف روانہ کیا اور ایک تلئہ تھانہ کی جانب بھیجا، لیکن نواب سراج الدولہ کی فوج نے دونوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا — اب نواب کے لیے میدانِ جنگ میں نکلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، چنانچہ وہ ۱۶ جون ۱۷۵۶ کو تیس ہزار فوج کے ساتھ فورٹ ولیم کے سامنے نمودار ہوا، اور ہر طرف سے انگریزوں پر ہلہ بول دیا۔ چار دن تک شدید لڑائی جاری رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے عورتوں اور بچوں کو جہاز میں سوار کر کے محفوظ مقامات پر بھیج دیا اور خود ڈریک میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کی جگہ ایک اور انگریز ہال ویل آیا۔ اس نے آتے ہی حالات کا جائزہ لیا اور صلح کا جھنڈا بلند کر دیا۔ ۲۰ جون کو ہتھیار ڈال دیے اور سراج الدولہ کی فوجیں فورٹ ولیم میں داخل ہو گئیں۔

اس موقع پر سراج الدولہ نے نہایت عالی ظرفی کا ثبوت دیا، نہ کسی انگریز پر ہاتھ اٹھایا، نہ کسی کو تشدد کا نشانہ بنایا، نہ کسی سے سختی کا سلوک روا رکھا اور نہ کوئی سامان لوٹا۔ فورٹ ولیم کونسل کا سیکریٹری کُک کہتا ہے کہ نواب اور اس کی فوج کے شریفانہ اور ہمدردانہ رویّے سے حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جائیں گے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمران نواب کی عائد کردہ شرائط

کے تحت جو بالکل صحیح ہیں، اپنا کاروبار جاری رکھ سکیں گے۔

لیکن اس کے بعد ایک بالکل غلط اور جھوٹا افسانہ تراشا گیا، وہ یہ کہ سراج الدولہ نے ۱۴۶ انگریز قیدیوں کو ایک اٹھارہ فٹ لمبی اور چودہ فٹ دس انچ چوڑی کال کوٹھڑی میں، جس کا نام "بلیک ہول" رکھا گیا، بند کر دیا تھا اور ان میں سے صرف ۲۳ زندہ بچے، باقی سب مر گئے — یہ نہایت سنگین الزام تھا اور سراسر کذب و افترا پر مبنی! خود دیانت دار انگریز مورخین بھی اس کی تردید کرتے ہیں، کیوں کہ اتنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں اتنے لوگ سما ہی نہیں سکتے! اور یہ نواب سراج الدولہ پر وسیع پیمانے پر حملہ کرنے اور انگریزوں کو اس کے خلاف مشتعل کرنے کی ایک سازش تھی۔

بہرحال سراج الدولہ کی انگریزوں کے مقابلے میں یہ بہت بڑی فتح تھی جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام سخت پریشان تھے، دوسری طرف اس کے اندرونی دشمن بھی اس کو برداشت نہیں کرتے تھے اور اس کے درپے آزار رہتے تھے۔ بلیک ہول (کال کوٹھڑی) کی جھوٹی خبر بھی انگریزوں نے بہت مشہور کر رکھی تھی، چنانچہ اس کا بدلہ لینے کے لیے کرنل کلائیو اور امیر البحر واٹسن بری اور بحری فوج لے کر مدراس سے بنگال پہنچے، اور بعض مقامات پر قبضہ کر لیا۔ ادھر نواب کے بعض ذمے دار افسروں نے نہایت بے پروائی سے کام لیا اور انگریزی فوج کو قلعۂ کلکتہ پر قابض ہونے کے مواقع فراہم کر دیے۔

سراج الدولہ نے خود فوج لے کر انگریزوں کے مقابلے میں حرکت کرنے کا ارادہ کیا تو کئی بدخواہ آڑے آئے۔ اس پر شب خون مارنے کی بھی کوشش کی۔ اسی اثنا میں سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا، یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ انگریزی فوج نے ہگلی کو فتح کر لیا اور سراج الدولہ کے کمانڈر میر جعفر نے انگریزوں سے اس کے خلاف ساز باز شروع کر دی۔ اس سے انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے اور فتح قریب نظر آنے لگی۔ پھر مغربی سمت سے

سراج الدولہ کو احمد شاہ ابدالی کے متعلق یہ خبر پہنچی کہ وہ بنگال پر حملہ کرنے والا ہے، چنانچہ اس نے مصلحتاً فروری ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کی طرف دستِ مصالحت بڑھایا لیکن کلائیو کی نیت خراب تھی، وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو سراج الدولہ کو زیر کرنے کے لیے اس کی مدد کرے اور پھر اس کی مسند پر بیٹھ کر انگریزوں کے مفادات کا تحفظ کرے۔ چنانچہ اس کی نظر میر جعفر پر پڑی اور اس کو بنگال کی حکومت کا لالچ دے کر ہاتھ میں لیا۔ امی چند سوداگر نے جو اس سازش میں شریک تھا، اپنی کوششوں کے صلے میں کلائیو سے تیس لاکھ روپے کی رقم طلب کی۔ کلائیو نے اس کے ساتھ یہ فریب کیا کہ اسے ایک جعلی عہد نامہ لکھ کر دیا اور امی چند اسے صحیح سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔

میر جعفر سے کلائیو نے جو خفیہ معاہدہ کیا تھا، اس کی رُو سے میر جعفر نے انگریزوں کے ساتھ سراج الدولہ کی جنگ کو ناگزیر بنا دیا۔ چنانچہ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو کلائیو اپنی فوج کو جدید اسلحہ سے مسلح کر کے شمال کی جانب بڑھا اور بغیر کسی مقابلے کے سراج الدولہ کی فوج نے قتوہ کلائیو کے حوالے کر دیا، جہاں سے اس کو کافی سامانِ جنگ ہاتھ آیا۔ نواب ۵۰ ہزار پیادہ اور ۱۸ ہزار سوار اور ۵۰ توپوں کے ساتھ بھاگیرتی ندی کے کنارے جو پلاسی کے قریب بہتی ہے، خیمہ زن ہوا۔ بائیں بازو کی فوج میر جعفر کے زیر کمان تھی۔ پلاسی کے میدان میں جنگ شروع ہوئی۔ سراج الدولہ نے انگریزی فوج کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی، لیکن انگریزوں کو گھیرے میں لینے والی فوج میر جعفر کے ماتحت تھی جو سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا۔ توپ و تفنگ کی لڑائی صرف قلب کی فوج نے کی، جس کا کمانڈر میر مدن تھا، میر مدن نے خوب دادِ شجاعت دی اور لڑتے لڑتے دشمن کی گولی کا نشانہ بنا۔ اس کی موت سے سراج الدولہ کا دل ٹوٹ گیا، اور شام تک میر جعفر کی غداری کا بھید بھی کھل گیا جو لڑائی سے الگ ہو گیا تھا۔

شب کی تاریکی میں سراج الدولہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر مرشد آباد پہنچا اور اسلحہ، گھوڑے اور ہاتھی سب انگریزوں کے ہاتھ آئے۔ میر جعفر پہلا شخص تھا جو جنگ کے اختتام پر انگریزی فوج کے استقبال کے لیے آگے بڑھا، اس طرح پلاسی کی لڑائی میر جعفر کی غداری کی بنا پر انگریزوں کی "فتح" اور سراج الدولہ کی "شکست" پر منتج ہوئی۔ دراصل یہ جنگ نہیں تھی صریح دھوکا تھا

نواب سراج الدولہ اس شکست کے بعد نہایت پریشان ہوا، اور میر جعفر کی نمک حرامی اور عیاری نے، جو اس کا رشتے دار اور فوجوں کا کمانڈر تھا، اس کو انتہائی غم واندوہ میں مبتلا کر دیا۔ وہ مرشد آباد سے روانہ ہوا تو اس کی ہندو بیوی راج کنور جس کا اسلامی نام لطف النسا تھا، بہ اصرار اس کے ہم راہ ہوئی اور کہا کہ اس پریشانی کے عالم میں، میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ تین دن کی بھوک پیاس اور انتہائی تکلیف کے بعد دونوں میاں بیوی بہرال کے مقام پر پہنچے اور کھانے پینے کی تلاش میں دانا شاہ کے مزار کی طرف روانہ ہوئے، لیکن پہچانے گئے، وہاں ایک شخص کے گھر میں پناہ لی، اس نے بھی غداری کی اور کسی میر صاحب نے روپے کے لالچ میں میر جعفر کے داماد میر قاسم کو خبر کر دی۔

نواب سراج الدولہ مع اہل وعیال کے گرفتار ہوا، لاکھوں روپے کے موتی اور جواہر میر قاسم کے ہاتھ آئے اور نواب کو پابہ زنجیر میر جعفر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے اور اس کے بیٹے میرن نے اسی حالت میں جیل میں لے جانے اور قتل کرنے کا حکم دیا۔ لیکن نواب پر تلوار چلانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ آخر نواب سراج الدولہ اور اس کے نانا علی وردی خاں کا ایک پرانا نمک خوار غلام آگے بڑھا اور کہا کہ "زنجیروں سے جکڑے ہوئے اس نواب پر یہ غازی تلوار چلائے گا"۔ رات کا وقت تھا کہ یہ نمک حرام غلام قید خانے میں داخل ہوا۔ نواب [illegible] چونکا اور بولا، "تم مجھے قتل کرنے آئے ہو؟" غلام

نے نہایت بے باکی سے جواب دیا۔ "بے شک"۔! نواب فوراً اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوا، اور اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگی۔ پھر سر اٹھایا اور جلّاد سے کہا۔ "کیا میر جعفر اس پر راضی نہیں کہ میں کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کروں؟" جلّاد کڑک کر بولا۔ "چپ رہو۔" نواب پھر سجدے میں گر پڑا، اور جلّاد نے اس کی گردن اڑا دی۔ جلّاد نے نواب کا سر کاٹ کر میر جعفر کے حضور پیش کیا، اور بہت سے انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

اس طرح ۲۹ جون ۱۷۵۷ء کو اپنے ہی اہل کاروں کی سازش اور سپہ سالار (میر جعفر) کی غدّاری سے انگریزوں کے اس بہت بڑے دشمن کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کا عظیم سانحہ ہے جو برصغیر کی تاریخ کا الم انگیز حصّہ ہے۔

روہیل کھنڈ کی حکومت

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو حکومتیں معرضِ قیام میں آئیں، ان میں ایک حکومت علاقہ روہیل کھنڈ میں، روہیلہ پٹھانوں کی تھی۔ برِصغیر کے عہدِ زوال میں روہیلوں کی یہ ایک مستحکم حکومت تھی اور خطۂ ہند میں اس کے حکمران بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ انگریزوں، مرہٹوں اور بعض دیگر طاقتوں سے یہ کئی دفعہ نبرد آزما ہوئے اور ہر حریف سے اپنی قوت و طاقت کا لوہا منوایا۔

اٹھارھویں صدی میں روہیلہ پٹھانوں کا نامور سردار اور ممتاز حکمران حافظ رحمت خاں تھا، جس کے جراٴت مندانہ اقدامات اور صائب نقطۂ نظر نے بعض بڑی بڑی قوتوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ شخص ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) کو "تور شہامت پور" میں پیدا ہوا، جو "روہ" (افغانستان کے وسیع

سلسلۂ کوہستان) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

آج سے کم وبیش تین سو سال پیشتر اس علاقے کے پٹھانوں نے ترکِ وطن کر کے ہندوستان کے اس علاقے میں بود و باش اختیار کر لی تھی جو دامنِ ہمالہ میں واقع ہے اور تاریخ میں "کھیڑ" کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کا اصل وطن چوں کہ "روہ" تھا، اس لیے انھوں نے ہندوستان کے جس علاقے میں سکونت اختیار کی وہ "روہیل کھنڈ" کے نام سے مشہور ہوا۔

روہیلہ پٹھانوں کے سردار اور حافظ رحمت خاں کے والد شاہ عالم خاں کا غلام داؤد خاں پہلا شخص تھا جو روہ سے چل کر کھیڑ (ہندوستان) آیا اور اس علاقے کے راجوں اور زمینداروں کے ہاں فوجی خدمات انجام دینے لگا۔ اپنے حسنِ سلوک اور اوصافِ گوناگوں کی بنا پر عوام و خواص میں داؤد خاں کو احترام و اکرام کا مستحق گردانا جاتا تھا۔ اس نے یہاں تک ترقی کی کہ اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی۔ اس کے عروج و شہرت کی خبریں اس کے وطن روہ میں پہنچیں تو وہاں کے بہت سے لوگوں نے ہندوستان کا رُخ کیا، جن میں حافظ رحمت خاں کا والد شاہ عالم خاں بھی شامل تھا۔

شاہ عالم خاں چوں کہ داؤد خاں کا آقا تھا، اس لیے داؤد خاں نے اس کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد دونوں میں کوئی ایسی رنجش پیدا ہوئی کہ داؤد خاں نے شاہ عالم خاں کو قتل کر ڈالا۔ اس سے تھوڑی مدت بعد خود داؤد خاں بھی مارا گیا۔

داؤد خاں کی وفات کے بعد اس کے متبنّٰی علی محمد خاں نے اس کی مسند سنبھالی۔ علی محمد خاں دلیر اور بہادر سپاہی تھا۔ اس زمانے کے مغل بادشاہ نے اسے طبل اور علم عطا کیا اور نواب کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ وزیر سلطنت قمر الدین خاں کا تقرب بھی اسے حاصل تھا۔ ۱۷۴۲ء میں جب اس نے راجا ہرنند کو شکست دے کر کھیڑ پر قبضہ کر لیا تو روہیلے پٹھان کثیر تعداد میں وہاں

آباد ہو گئے تھے، جن میں زیادہ تر علی محمد خاں کے فوجی سپاہی اور خاندان کے لوگ تھے۔ یہ شخص خود تو روہیلہ نہیں تھا، لیکن روہیلوں کی مدد اور سرپرستی کی وجہ سے روہیلہ سردار کہلایا۔ اس کے زمانے میں روہیلے اس قدر جری ہو گئے تھے کہ علی محمد کی قیادت میں انھوں نے بریلی اور اس کے گرد و نواح کو تہ و بالا کر ڈالا۔ ان کی ان سرگرمیوں کی شکایات مغل بادشاہ محمد شاہ (۱۷۱۹-۴۸ء) کو پہنچیں تو اس نے ان کی سرکوبی کے احکام جاری کیے۔ شاہی فوج ان کے مقابلے کو نکلی لیکن ناکام رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روہیلوں کے حوصلے اور بڑھے، اپنی مہم کو زیادہ تیز کیا اور مزید علاقوں پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ اب بریلی، پیلی بھیت، شاہ جہان پور اور بہت سے بلاد و قصبات پر ان کا پرچمِ اقتدار لہرا رہا تھا۔

روہیلوں کی ان فتوحات سے اَوَدھ کا نواب صفدر جنگ بہت پریشان تھا، اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ وہ خود اپنی مملکت کی حدود کو وسیع کرنے کے لیے سوچ رہا تھا اور روہیلے اس کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ کٹّر شیعہ تھا اور روہیلے سخت سنّی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ملک میں سنّی اس طرح فتح حاصل کریں، اپنے عقیدے کی بنا پر وہ ان کو برداشت نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے بادشاہِ دہلی سے علی محمد خاں کی شکایت کی اور بادشاہ اس کے اکسانے پر روہیلوں کے مقابلے کے لیے خود فوج لے کر نکلا۔ علی محمد خاں نے شاہی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ وزیر الممالک قمر الدین خاں کے کہنے پر بادشاہ نے علی محمد خاں کی جان بخشی، نوکر دی، البتہ اسے قیدی بنا کر اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔

اس زمانے میں علی محمد خاں کا دستِ راست اور بہت بڑا معاون حافظ رحمت خاں تھا، بادشاہ نے اسے کچھ نہیں کہا۔ لیکن روہیلوں نے علی محمد خاں کی گرفتاری کو قومی غیرت کا سوال بنا لیا اور اسے پٹھانوں کی توہین قرار دیا۔

اس کا انتقام لینے کے لیے رحمت خاں ایک بھاری فوج کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوا، وزیر الممالک قمر الدین خاں اور کچھ لوگوں کے درمیان میں پڑنے سے علی محمد خاں کو رہائی حاصل ہوئی اور ساتھ ہی سرہند کی صوبے داری تفویض کی گئی، جہاں سکھوں اور جاٹوں نے ہنگامے بپا کر رکھے تھے۔ کچھ دنوں بعد (۱۷۴۸ء میں) بادشاہ کو دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے کی اطلاع پہنچی۔ اس نے اس خطرے کے پیشِ نظر کہ روہیلے کہیں اس کے ساتھ نہ مل جائیں، علی محمد خاں کو سرہند کی صوبے داری سے الگ کر کے روہیل کھنڈ میں اس کے پہلے منصب پر مامور کر دیا۔ اسی اثنا میں بادشاہ محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ احمد شاہ نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ کچھ عرصہ بعد ۳ شوال ۱۱۶۲ھ (۴ ستمبر ۱۷۴۹ء) کو علی محمد خاں بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔ وفات سے دو دن پہلے اس نے حافظ رحمت خاں کو اپنا جانشین بنایا۔ لیکن رحمت خاں چونکہ مخلص آدمی تھا اور حکومت کا اسے کوئی لالچ نہ تھا، اس لیے علی محمد خاں کے چھوٹے بیٹے سعد اللہ خاں کے حق میں حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام عبداللہ خاں تھا اور ایک کا فیض اللہ خاں۔ ! مگر دونوں افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قید میں تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے جب ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں ہندوستان پر حملہ کیا تو ان کو رہا کر دیا تھا — یہ وہی فیض اللہ خاں ہے جو بعد میں ریاست رام پور کا بانی ہوا، جو آزادی کے بعد صوبہ یوپی میں ضم ہو چکی ہے۔

روہیل کھنڈ کی حکومت بہت سے نشیب و فراز سے گزری اور دوسرے امرائے ہند کے علاوہ خود علی محمد خاں کے تینوں بیٹوں کے درمیان بھی اس کے لیے بڑی کشمکش ہوئی۔ بالآخر اس کی زمامِ اختیار حافظ رحمت خاں کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے اس کو قائم رکھنے اور اس کے انتظام کو بہتر

طریقے سے چلانے کے لیے پوری کوشش کی۔ اَوَدھ کے حکمرانوں سے جنگ کی، مرہٹوں سے برسرِ پیکار ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمرانوں کا مقابلہ کیا، دوسری حریف طاقتوں سے بھی کئی مرتبہ معرکہ آرائی کی نوبت آئی، لیکن یہ شخص نہایت استقلال سے اپنی جگہ پر قائم رہا۔ یہ ایک شجاع، بہادر اور دُوراندیش حکمران تھا۔ ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں جب احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے میدان میں آخری مقابلہ ہوا، جس میں مرہٹوں کی حکومت ختم ہوگئی تو حافظ رحمت خاں، اس کے بیٹے عنایت خاں اور چچازاد بھائی دوندے خاں نے جو نجیب الدولہ کا خسر تھا، عملاً حصّہ لیا اور اپنی جاں باز فوجوں سے احمد شاہ ابدالی کی پوری مدد کی۔ احمد شاہ ابدالی نے رحمت خاں کی بہادری اور حربی قابلیت سے متاثر ہوکر اسے اٹاوا کا شہر عنایت کیا، جہاں ابھی تک مرہٹوں کا قبضہ تھا، رحمت خاں نے بزورِ شمشیر انھیں شہر سے باہر نکالا۔

۱۷۶۳ء میں علی محمد خاں کے بیٹے نواب سعد اللہ خاں کا انتقال ہوا، تو روہیل کھنڈ کے لوگوں نے علی محمد خاں کے کسی بیٹے کو اپنا حاکم نہیں بنایا بلکہ حافظ رحمت خاں کی قیادت میں رہنا پسند کیا۔ ۱۷۶۸ء تک اس علاقے میں بالکل امن و امان رہا، یہ روہیلوں کے عروج کا زمانہ تھا۔

اب ملک کے حالات تیزی کے ساتھ نئے قالب میں ڈھل رہے تھے اور برصغیر کے سیاسی افق پر انگریزوں کی طاقت روز بروز نمایاں ہوکر اُبھر رہی تھی۔ حافظ رحمت خاں بھی اس صورتِ حال کو خوب سمجھتا تھا اور کسی فریق سے خواہ مخواہ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں نجیب الدولہ اور ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں رحمت خاں کا چچازاد بھائی دوندے خاں جو اس کا بہت بڑا حامی تھا، وفات پاگئے تھے، جس سے ہندوستان میں پٹھانوں کی سیاسی طاقت کو شدید دھچکا لگا۔

رحمت خاں تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ خاموشی کے ساتھ اپنے علاقے کی ترقی کے لیے غور کرنا اور اس کے باشندوں کی خدمت کرنا ہی اس دور کا اصل کام ہے، لیکن اودھ کے شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں نے اس کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اسے مجبور ہو کر میدانِ جنگ میں اترنا پڑا۔ شجاع الدولہ نے ایک طرف تو وارن ہیسٹنگز سے بات کی اور اس کو بیس لاکھ روپے نقد ادا کر کے اور سینتیس لاکھ روپے کا وعدہ کر کے کمپنی کی امداد طلب کی، دوسری طرف دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کو یہ لالچ دے کر روہیل کھنڈ پر حملہ کرنے کی اجازت لی کہ اس کو فتح کرنے کے بعد آدھا علاقہ اس کی ملکیت میں دے دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ خود بعض روہیلہ سرداروں نے میدانِ جنگ میں اترنے سے انکار کر دیا۔

رحمت خاں کے لیے یہ نہایت پریشانی کا زمانہ تھا اور سب طاقتیں اس کے خلاف متحد ہو گئی تھیں۔ اس نے مجبور ہو کر صلح کی کوشش کی اور وارن ہیسٹنگز سے ملاقات کرنا چاہی، لیکن اس نے ملاقات کے بجائے کرنل چمپین کی کمان میں شجاع الدولہ کی امداد کے لیے انگریزی فوج میدان میں اتار دی۔ کرنل چمپین نے رحمت خان کو خط لکھا کہ یا تو نواب شجاع الدولہ کو دو کروڑ روپے ادا کرو، یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ نامعقول اور ناقابلِ قبول مطالبہ تھا، اور اس سے گفت و شنید کے دروازے بند ہو گئے تھے، جنگ کے بغیر اب کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کو کڑھیرا پور میں فریقین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں۔ دشمن کی فوج بہت بڑی تعداد میں تھی اور روہیلوں کا لشکر اس کی نسبت بہت کم تھا۔ حافظ رحمت خاں خود میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ لڑائی شروع ہوئی، توپوں کے منہ کھلے اور چاروں طرف آگ برسنے لگی، اتنے میں ایک

گولہ رحمت خاں پر گرا، اور وہ اسی وقت ہلاک ہو گیا۔ ادھر سے اس کا ایک سابق ملازم سلطان آیا، اس نے اپنے آقا کا سر کاٹ کر شجاع الدولہ کی خدمت میں پیش کیا، جسے دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے بعد اس کی لاش تلاش کی گئی، جو میدانِ جنگ سے ملی اور سر کو لاش کے ساتھ سی دیا گیا پھر اسے بریلی بھیج دیا گیا، جہاں اس کو دفن کر دیا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں روہیلوں کے قلیل المدت، مگر شاندار دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ سانحہ ہفتے کے روز ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ (۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء) کو پیش آیا۔

حافظ رحمت خاں نے ایک شخص راؤ پہاڑ سنگھ کو کئی جاگیریں عطا کی تھیں۔ اس نے ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵) میں اپنے اس محسن کی قبر پر مقبرہ تعمیر کیا، اور ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں رحمت خاں کے بیٹے ذوالفقار خاں نے اس مقبرے کی تکمیل کی۔

حافظ رحمت خاں کی وفات کے بعد فاتح شجاع الدولہ کے حکم سے روہیل کھنڈ کے پورے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی گئی۔ بے شمار گاؤں جلا دیے گئے، اور وہاں کے باشندوں کو یا تو قید کر لیا گیا یا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ روہیلہ سرداروں کی تعمیر کی ہوئی سیکڑوں عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ رحمت خاں کے اہل و عیال اور رشتے داروں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے، ان کی عورتوں اور بچوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کیا گیا۔ شجاع الدولہ کی والدہ نے مختلف مظالم کے واقعات سنے تو وہ بھی چیخ اٹھی اور بیٹے سے ظلم و ستم کا سلسلہ بند کرنے کی التجا کی، لیکن وہ نہیں مانا۔ اس کے بعد جب شجاع الدولہ خود خطرناک بیماری میں مبتلا ہوا، اور اسے یہ بھی اطلاع ملی کہ روہیلے دوبارہ جمع ہو کر لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں تو دل میں کچھ نرمی پیدا ہوئی اور بعض قیدیوں کو رہا کر دیا۔

رحمت خاں، حافظِ قرآن، پرہیزگار، نیک سیرت اور بلند اخلاق حکمران

تھا۔ عادل و منصف، عالی دماغ اور رعایا کے لیے مشفق و مہربان تھا۔ علم و علما سے بے حد تعلق و عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے روہیل کھنڈ میں بہت سے مدارس قائم کیے اور جگہ جگہ درس و تدریس کا انتظام کیا۔ اس کی قلمرو میں بے شمار علما و فضلا جمع ہو گئے تھے۔ وہ پانچ ہزار علمائے کرام کو ملک کے خزانۂ عامرہ سے وظیفے اور تنخواہیں دیتا تھا۔ طلبا کے اخراجات کی خود کفالت کرتا اور انھیں معقول ماہانہ وظائف سے نوازتا۔ اس نے دیہات و قصبات میں مسجدیں بنائیں اور ان میں باقاعدہ خطیب، مدرس، مؤذن اور خادم مقرر کیے، جن کے مصارف ملکی خزانے سے ادا کیے جاتے۔ یہ روہیل کھنڈ کا اہل علم حکمران تھا اور اس کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو شکست کے بعد روہیل کھنڈ سے لوٹ کر شجاع الدولہ اپنے ساتھ لکھنؤ لے گیا تھا۔ بعد میں بعض کتابیں انگریزوں نے لندن میں بھی پہنچائیں جو انڈیا آفس لائبریری میں اب تک محفوظ ہیں۔

رحمت خاں بوقلموں اوصاف کا حامل تھا۔ شجاعت و بہادری اور فہم و فراست میں یکتا تھا۔ متحمل مزاج اور متین تھا۔ سخاوت و جودت میں اپنی مثال آپ تھا۔ فارسی اور پشتو کا اچھا شاعر بھی تھا۔

اس نے زراعت و تجارت کو بھی خوب ترقی دی اور کسانوں، مزدوروں اور کاشت کاروں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اپنے علاقے میں شان دار عمارتیں تعمیر کرائیں، جن میں بیشتر شجاع الدولہ نے اس لیے بھی منہدم کرادی تھیں کہ ان کی ساخت و بناوٹ اس کے خاص عقیدہ و مسلک سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔

رحمت خاں باجماعت نماز ادا کرتا، رمضان میں عام لوگوں کے ساتھ تراویح پڑھتا اور خود قرآن مجید سناتا، چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ہر شخص کی بات توجہ اور اطمینان سے سنتا اور لوگوں کو ہر موقعے پر حق کہنے کی تلقین کرتا۔

وہ اگرچہ مطلق العنان حکمران تھا مگر اس نے رعایا کے تمام افراد کو برملا بات کرنے اور حق و صداقت کا اعلان کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی اور

وہ حریت فکر و عمل کا داعی تھا۔ اس کا دروازہ ہر شخص کے لیے ہر آن کھلا رہتا اور کوئی فریادی یا ضرورت مند خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ روہیلہ پٹھانوں کا ایک حصہ بنگش خاندان تھا، جس کا سربراہ اس زمانے میں نواب محمد خاں بنگش تھا۔ اس سلسلے کی ایک مضبوط کڑی نجیب خاں تھا، جس نے دربار شاہی میں رسائی حاصل کر کے رکن حکومت کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور نجیب الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ عظیم لوگ تھے اور ملک کو اجنبی اقتدار سے پاک رکھنا چاہتے تھے، لیکن اس دور میں غدار اور عیار و مکار گروہ نے اپنی مخالفانہ سرگرمیوں کا جال اتنا وسیع کر لیا تھا کہ ان کی زد سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

حیدرآباد کی آصف جاہی حکومت

حیدرآباد (دکن) کی آصف جاہی حکومت بھی مغلوں کے دور زوال کی منت پذیر ہے۔ جس نے بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں جنم لیا۔ اس کے بانی کا نام فخر الدین تھا، جس کو مغل دربار سے فتح جنگ اور نظام الملک آصف جاہ وغیرہ کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ اس کے دادا کا نام عابد خاں تھا جو سمرقند سے تین کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں علی آباد میں پیدا ہوا، اور پھر اپنے علم و استعداد کی بنا پر شیخ الاسلام کے مرتبے کو پہنچا۔ مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں دہلی آیا اور دربارِ شاہی سے منصب و جاگیر کا مستحق قرار پایا۔ شاہ جہان کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کا تقرب حاصل کیا اور راماہولی کا قلعہ دار بنا۔

عابد خاں کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ جب اورنگ زیب نے قلعۂ گولکنڈہ پر حملہ کیا تو یہ اس کا ہم رکاب تھا اور توپ کے گولے سے زخمی ہو گیا تھا، لیکن صبر و ضبط کا یہ حال تھا کہ ایک درباری جملۃ الملک اسد خاں اس کی

مزاج پرسی کو آیا تو یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جرّاح اس کے شلنے سے ٹوٹی ہوئی ہڈی کی کرچیں نکال رہا ہے اور یہ شخص نہایت تحمل و استقلال کے ساتھ بیٹھا لوگوں سے باتیں کر رہا ہے اور ایک ہاتھ میں قہوے کی پیالی پکڑے اطمینان سے قہوہ پی رہا ہے اور ہنس ہنس کر کہہ رہا ہے کہ یہ جراح اپنے فن میں بڑا ماہر ہے۔ لیکن زخم اتنا کاری تھا کہ عابد خاں اس سے صحت یاب نہ ہو سکا اور ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۶ء) کو وفات پا گیا۔

عابد خاں کا بیٹا میر شہاب الدین خاں تھا، اس کی ولادت بھی اپنے آبائی وطن علی آباد (سمرقند) میں ہوئی۔ باپ ہندوستان میں شاہی منصب پر فائز ہوا تو بیٹے کو بھی بلا لیا، وہ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء) میں دہلی پہنچا اور دربار کی ملازمت و خطابات سے بہرہ مند ہوا۔ یہ بھی باپ کی طرح نہایت مستعد اور تیز آدمی تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۰۰ھ میں طاعون کی وبا پھیلی تو یہ اس کی لپیٹ میں آگیا اور اس کے اثر سے نابینا ہو گیا، لیکن سرکاری فرائض اسی طرح انجام دیتا رہا۔ یہاں تک کہ بعض علاقوں میں فوجوں کی کمان بھی، جو انتہائی مشکل کام ہے، آخر عمر تک اسی حالت میں کرتا رہا۔ ۷ شوال ۱۱۲۲ھ کو مرض استسقا سے احمد آباد میں فوت ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں دہلی کے اجمیری دروازے کے باہر ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا، اس کے احاطے میں مقبرہ بھی بنوایا تھا، وفات کے بعد اس کی میت احمد آباد سے دہلی لائی گئی اور اسی مقبرے میں اسے دفن کیا گیا۔ یہی مدرسہ بعد میں دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا۔

میر شہاب الدین خاں کی شادی شاہ جہان بادشاہ کے نامور وزیر علامی سعد اللہ خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ نظام الملک آصف جاہ جس نے آگے چل کر حیدر آباد (دکن) کی آصف جاہی حکومت کی بنیاد رکھی، اسی خاتون کے بطن سے تھا۔

نظام الملک نہایت چالاک اور تیز نظر آدمی تھا۔ عہدِ انحطاط کے مغل دربار میں اس کو بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی طرف سے مختلف اوقات میں یہ کئی صوبوں کے منصب ولایت پر مامور رہا۔ بالآخر دکن کا قصد کیا۔ ایک طرف تو یہ دکن میں ایک خود مختار حکومت قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا، دوسری جانب دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی اپنا اثر قائم رکھنے کا خواہاں تھا۔ دکن اور اس کے گرد و نواح میں مرہٹے ایک زور دار طاقت تھے جن سے اس کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو ان کی یلغار سے محفوظ رکھنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ان کو دہلی پر حملے کے لیے آمادہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) میں مرہٹوں کا سیلاب دہلی کی طرف بڑھا اور فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہو گیا۔ کئی روز تک مرہٹہ فوج دہلی کے بازاروں میں دندناتی رہی، بالآخر بادشاہِ دہلی محمد شاہ رنگیلا سے معاہدہ کر کے واپس آ گئی۔ نظام الملک اس حرکت سے خود تو مرہٹوں کی دست برد سے محفوظ ہو گیا مگر مغل بادشاہ کو ان کے مطالبات ماننے پر مجبور کر دیا۔ محمد شاہ کو معلوم تھا کہ مرہٹوں کے دہلی پر حملے میں نظام الملک کا ہاتھ ہے مگر وہ بعض ایسی مجبوریوں میں جکڑا ہوا تھا کہ اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ بلکہ الٹا اس کو "وکالتِ مطلقہ" کے بہت بڑے عہدے، آصف جاہ کے خطاب اور ہشت ہزاری منصب سے سرفراز کیا۔

اس کے بعد ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں نادر شاہ نے دہلی پر جو زبردست حملہ کیا اور اس شہر کو جس سفاکی کے ساتھ تاراج کیا اس میں برہان الملک کے ساتھ نظام الملک کا ہاتھ بھی کار فرما تھا۔

یہاں اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ نظام الملک "وکالت مطلقہ" کا منصب عالی حاصل کرنے کے کچھ عرصہ بعد حیدر آباد چلا گیا، اور دہلی میں اپنے بیٹے غازی الدین خاں کو اپنا نائب مقرر کر گیا۔ حالات کچھ ایسا

رُخ اختیار کر گئے تھے کہ دکن میں نظام الملک نے اور دہلی میں غازی الدین خاں نے اپنے سیاسی مستقبل کے تحفظ کا ذریعہ مرہٹوں کو قرار دے لیا تھا اور دونو باپ بیٹا اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان کا سہارا مرہٹوں کی طاقت ہے، لہٰذا ان کی مدد کرنا اور ان سے تعلقات استوار رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے مرہٹوں کے دروازے پر دستک دی۔ غازی الدین خاں نے بادشاہِ دہلی کو ہاتھ میں رکھنے کے لیے بھی مرہٹوں کا سہارا تلاش کیا، اودھ کے حکمرانوں کو زیر کرنے کے لیے بھی انھی سے استمداد کی، اپنے دوسرے مخالفوں کا زور توڑنے کے لیے بھی انھی سے مدد مانگی۔ دہلی کے بادشاہ عالمگیر ثانی کو بھی اسی شخص نے قتل کرایا۔ پانی پت کی لڑائی میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے ہندوستانی حلیفوں کے مقابلے میں مرہٹوں کی امداد بھی اسی سلطنت کے معماروں نے کی۔ پھر میسور کی سلطنت خداداد کے بانی نواب حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو کے خلاف بھی حیدر آباد کے اربابِ اختیار شمشیر بکف ہو کر میدانِ مبارزہ میں نکلے اور مرہٹوں اور انگریزوں کی کھل کر امداد کی۔ غرض اس ریاست کے اصحابِ بست وکشاد نے ہر موقعے پر مرہٹوں اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔

یہ ریاست دو سو سال تک ارضِ دکن میں قائم رہی۔ برصغیر کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔ دو سو سال کی اس طویل مدت میں اس کے حکمرانوں نے کئی بہت اچھے کام بھی کیے۔ اس کا آخری حکمران میر عثمان علی خاں تھا۔ اس کے عہد میں تو ہندوستان میں اس ریاست کو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا ایک نشان سمجھا جاتا تھا۔ اس ملک میں عربی اور اردو کی جو خدمت میر عثمان علی خاں کے دور میں ہوئی، وہ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ نقش رہے گی۔ اس دور میں بے شمار علمی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں اور متعدد نایاب و ناپید کتابوں سے اہلِ علم محض حیدر آباد (دکن) کی وجہ سے متعارف

ہوئے۔ پھر اس نے ایک شان دار علمی ذخیرے کو عربی سے اردو میں منتقل کرایا۔ خدمتِ علم و تحقیق کے لیے بہترین ادارے قائم کیے اور برصغیر کے بے شمار اصحابِ علم اور اربابِ فضل نے ان اداروں میں خدمات انجام دیں۔ علما و فضلا اور شعرا و ادبا کا ایک مجمع وہاں مختلف تحقیقی و تصنیفی فرائض انجام دینے پر متعین ہوا۔

ریاست حیدرآباد نے اپنے خرچ پر تصنیف و تالیف کے ادارے قائم کیے، تحقیق و ترجمے کے مراکز کھولے اور تعلیم و تدریس کے لیے حدودِ ریاست میں یونیورسٹی سے لے کر ابتدائی درجے کے مدارس کا جال بچھا دیا۔ پھر اس میں لباس، گفتگو اور میل جول میں ایسی ثقافت اور تہذیب کو عام کیا گیا جو ارضِ ہند میں مسلمانوں کی ایک دل کش اور جاذبِ نظر علامت بن گئی۔ کہنا چاہیے کہ دیارِ ہند میں اہلِ علم اور اصحابِ فن کے مرکز کی حیثیت سے حیدرآباد کو وہی مرتبہ حاصل تھا جو بنو عباس کے عہد میں ممالکِ اسلامی میں بغداد کو حاصل تھا۔ اس کی تمام سیاسی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی علمی و تحقیقی خدمات کا پہلو بہت ہمہ گیر اور وسعت پذیر رہا ہے۔

سلطنتِ خداداد میسور

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں برصغیر کے مختلف حصوں میں جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں میسور کی سلطنتِ خداداد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ جنوبی ہند کی اس سلطنت کا بانی حیدر علی خاں تھا جو معمولی فوجی عہدے سے ترقی کر کے منصبِ حکمرانی پر فائز ہوا۔ یہ شخص بہت شجاع، دلیر اور جنگ جو تھا۔ ملک گیری و جہاں بانی کے تمام اوصاف اس میں پائے جاتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز، ریاست حیدرآباد کے اربابِ اختیار اور مرہٹے اس کے حریف تھے۔ اس نے ان سب سے ٹکر لی اور مختلف محاذوں میں ان سے برسرِ پیکار ہوا۔

اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی اصل دشمن دو طاقتیں تھیں۔ ایک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز جو مختلف مقامات پر اپنے قدم جما چکے اور حکومت کے دروبست پر قابض ہو گئے تھے اور ان کی فوجیں جنگی ساز و سامان سے لیس ہو کر اس ملک کے بیشتر حصوں پر دندناتی پھرتی تھیں۔ دوسرے مرہٹے جو حرب و ضرب اور جنگ و جدال میں بڑی شہرت رکھتے اور برصغیر کے بعض گوشوں میں اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ لیکن اس عہد کے ہندوستانی مسلمانوں کی حرماں نصیبی ملاحظہ ہو کہ مسلمانوں کی جو علاقائی حکومت ان دو طاقتوں سے پنجہ آزما ہونے کے لیے میدان میں اترتی، دوسری مسلمان حکومتوں کے اصحاب بست و کشاد اس کی گردن ناپنا شروع کر دیتے۔ چنانچہ بنگال میں سراج الدولہ انگریزوں کے مقابلے میں آیا تو خود مسلمان ہی اس کی شکست کا باعث بنے۔ حافظ رحمت خاں نے انگریزوں اور مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو اودھ کے شجاع الدولہ نے انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر کے اس کو ختم کر ڈالا۔ پھر جنوبی ہند میں حیدر علی اور اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے ان کے خلاف تلوار اٹھائی تو نظام حیدر آباد کی حکومت بھاری فوج لے کر سامنے آ کھڑی ہوئی اور انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر میسور کی اس مسلمان سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ارکاٹ کا نواب محمد علی خاں والاجاہ بھی ان کا معاون تھا۔ اگر یہی مسلمان حکومتیں متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرتیں تو کبھی بیرونی طاقت ان پر مسلط نہ ہو سکتی۔ انگریزوں نے پہلے تو ان کی باہمی مخالفت سے فائدہ اٹھا کر ان کی قوت کو منتشر کیا اور پھر انھیں مستقل طور پر اپنے حلقۂ غلامی میں جکڑ لیا۔

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کی علاقائی سلطنتوں میں میسور کی سلطنت خداداد خاص اہمیت و شہرت کی حامل تھی، جس کی بنیاد نواب حیدر علی خاں نے رکھی۔ حیدر علی تمام عمر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہا اور ساری زندگی انگریزوں، مرہٹوں اور حکومت حیدر آباد سے جنگ کرتے ہوئے بسر کر دی۔ اس نے ۳ ذی الحجہ

۱۱۹۵ھ کی رات (۷ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو ارکاٹ کے قریب نرسنگ رائن پیٹ میں وفات پائی اور سرنگاپٹم میں دفن ہوا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے سلطان ٹیپو نے زمام اختیار ہاتھ میں لی۔

ٹیپو جمعے کے روز ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ (۱۰ نومبر ۱۷۵۰ء) کو بنگلور سے بیس میل دور "دیون ہلی" کے مقام پر پیدا ہوا۔ ٹیپو کی ولادت سے قبل حیدر علی اولادِ نرینہ سے محروم تھا اور بیٹے کی شدید خواہش دل میں رکھتا تھا۔ چنانچہ ارکاٹ کے ایک بزرگ ٹیپو مستان ولی کے مزار پر حاضر ہوا، اور اللہ تعالیٰ سے بیٹے کی پیدائش کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور بیٹا عطا کیا تو برکت و تیمن کے لیے اسی بزرگ کے نام پر بیٹے کا نام ٹیپو رکھا۔ ٹیپو پانچویں سال کو پہنچا تو حصولِ علم کا آغاز ہوا۔ عربی اور فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں، فنونِ سپاہ گری یعنی تیر افگنی، نیزہ بازی، شمشیر زنی، اور تفنگ اندازی وغیرہ میں مہارت پیدا کی اور حرب و ضرب اور رزم و پیکار کے پرانے اور نئے طریقوں کی تربیت حاصل کی۔

حیدر علی خاں چونکہ خود بڑا جنگ جو اور بہادر و شجاع تھا، اس لیے بیٹے کو بھی اسی راہ پر لگایا اور دلیر بیٹے نے اس وادیِ پُرخار کے تمام نشیب و فراز سے کامل واقفیت بہم پہنچائی۔ ۱۷۶۵ میں حیدر علی نے ملیبار پر حملہ کیا تو ٹیپو اس کے ساتھ تھا۔ یہ پہلی جنگ تھی جس میں ٹیپو نے شرکت کی۔ اس وقت اس کی عمر صرف پندرہ برس تھی، مگر جرأت اور حوصلے کا یہ حال تھا کہ تھوڑی سی فوج لے کر دشمن کا تعاقب شروع کر دیا اور اس کے لشکر کو دھکیلتا ہوا گھنے جنگل میں لے گیا، یہاں تک کہ وہ لوگ ٹیپو کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۷۶۷ میں حیدر علی خاں نے نظام دکن کی خدمت میں قیمتی تحائف دے کر ایک وفد بھیجا، اس وفد کا قائد ٹیپو سلطان تھا جس کی عمر اس وقت سترہ سال کی تھی۔ نظام نے شہزادے کو "نصیب الدولہ" اور "فتح علی خان بہادر"

کے خطاب دیے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ٹیپو کا اصل نام فتح علی خاں نہیں تھا بلکہ یہ خطاب تھا جو اسے نظام دکن نے دیا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی نام کے طور پر بولا جانے لگا۔

ٹیپو سلطان جرأت مند باپ کا جرأت مند بیٹا تھا۔ انگریزوں، مرہٹوں، اور دوسرے حریفوں کے ساتھ حیدر علی کے جو محاربے ہوئے، ان سب میں ٹیپو شامل رہا اور ہر موقعے پر دشمن کا مقابلہ کیا۔ جون ۱۷۶۷ء میں انگریزوں کی جنگی سرگرمیوں کا پتا لگانے اور ان کے فوجی ٹھکانوں میں ہراس پیدا کرنے کے لیے حیدر علی نے جو فوج مدراس بھیجی، اس میں ٹیپو بھی شامل تھا۔ اس کے بعد مختلف محاذوں پر اس نے خوب دادِ شجاعت دی اور دشمن اس کی جنگی صلاحیتوں کا لوہا ماننے پر مجبور ہوا۔

حیدر علی خاں کی وفات اس وقت ہوئی جب وہ انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا اور خود ٹیپو بھی محاذِ جنگ پر تھا۔ اس کو پانچویں روز (۱۱ دسمبر ۱۷۸۲) کو ملیبار میں عظیم باپ کی موت کی اطلاع ملی۔ وہ ۲۵ دسمبر ۱۷۸۲ کو چکملور پہنچا، جہاں اس کا لشکر مقیم تھا۔ والد کی موت کے افسوس کی وجہ سے اس نے اپنے رسمی استقبال کی ممانعت کر دی تھی۔ وہ غروب آفتاب کے بعد خاموشی سے لشکر گاہ میں داخل ہوا، اور فرشِ زمین پر بیٹھ کر سلطنت کے سرداروں کو شرفِ باریابی بخشا۔ ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ (۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو جمعرات کے دن مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی اور سلطنتِ خداداد کی زمامِ حکومت ہاتھ میں لی۔ اس وقت ٹیپو کی عمر بتیس سال کی تھی۔

ٹیپو سلطان جب سلطنت خداداد کے منصب حکومت پر متمکن ہوا تو وہ برصغیر کی ایک اہم اور طاقت ور حکومت تھی۔ رقبے کے لحاظ سے وہ شمال میں دریائے کرشنا سے لے کر جنوب میں ریاست ٹراونکور اور ضلع تِنا ولی تک پھیلی ہوئی تھی۔ شرق میں اس کی حد مشرقی گھاٹ تھی اور مغرب میں اس کا دامن سمندر کو چھو

رہا تھا۔ آبادی، زرخیزی اور حُسنِ انتظام میں یہ ایک مثالی سلطنت تھی۔ قدرتی دولت بھی اللہ نے اس کو فراوانی سے عطا کی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جنگ و پیکار کا بھی ایک طویل سلسلہ اس سے وابستہ ہوگیا تھا۔ ایک طرف نظام حیدرآباد اور مرہٹے اس کو ہڑپ کرنے کے درپے تھے، دوسری طرف انگریز تھے جو پورے ہندوستان پر اپنا پرچمِ اقتدار لہرانے کے لیے ہر طرف سے یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور اس سلطنت کو اپنے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ارکاٹ کا نواب محمد علی والاجاہ بھی اس کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا اور اپنے عارضی مفاد کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کا سخت حامی بن گیا تھا۔ میسور کا قدیم ہندو خاندان بھی، جس سے حیدر علی نے یہ حکومت چھینی تھی، ٹیپو کے درپے آزار تھا۔ اس طرح ٹیپو سلطان کم سے کم پانچ دشمنوں سے گھرا ہوا تھا اور یہ اس کے عزیمت و حوصلہ مندی اور عقل و تدبر کے زبردست امتحان کا وقت تھا۔ اس کی نگاہِ دُوررس اور سیاسی بصیرت نے تمام حریف طاقتوں کی نیتوں کو بھانپ لیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس نے جو تاجِ شاہی سر پر رکھا ہے، وہ بے شک بہ ظاہر لعل و جواہر سے مزین ہے لیکن درحقیقت یہ کانٹوں کا تاج ہے، اور اس پر چاروں طرف سے تلواریں گھوم رہی ہیں۔ اس نے نہایت استقلال کا ثبوت بہم پہنچایا اور مخالف قوتوں کا پامردی سے مقابلہ کیا۔

تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ خود اس کے متعدد اہل کار اور عمالِ حکومت نے بھی اس کے خلاف غداریوں کا وسیع سلسلہ شروع کر دیا اور اس کے گرد و پیش سازشوں کا ایک خوف ناک جال بچھا دیا۔ ان غدار اور نمک حرام لوگوں میں میر صادق، میر غلام علی لنگڑا، بدر الزمان خاں نائطہ، میر معین الدین، میر قمر الدین، میر قاسم علی اور پورنیا کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ حکومت کے اہم مناصب پر فائز تھے اور ٹیپو سلطان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ٹیپو کے دشمنوں سے رابطہ قائم کیا، ان پر حکومت کے راز ظاہر کیے اور بالخصوص انگریزوں سے گٹھ جوڑ

کر کے اپنے مربّی کے قتل اور اس کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنے۔

ٹیپو سلطان اس برصغیر کی عظیم شخصیت تھی، وہ خود اہل علم، اہل علم کا قدر دان اور پسندیدہ عادات و اطوار کا مالک تھا۔ نیک اور عبادت گزار لوگوں سے اس کو محبت تھی۔ اس کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا اور ادعیۂ مسنونہ پڑھتا۔ ہمیشہ باوضو رہتا اور امورِ خیر میں وقت صرف کرتا۔ تقویٰ شعاری اور حیاداری کا یہ عالم تھا کہ حمام میں بھی کپڑا باندھ کر غسل کرتا، پاؤں اور ہاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ کبھی لوگوں کے سامنے برہنہ نہ ہونے دیتا۔ کبھی ایسا لباس زیب تن نہیں کیا جس میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اس کے ملک کی اکثر ہندو عورتیں بازاروں اور گلیوں میں سر اور سینہ کھول کر چلنے کی عادی تھیں، سلطان اسے پسند نہ کرتا تھا، لہٰذا حکم جاری کر دیا کہ کوئی عورت کرتے اور اوڑھنی کے بغیر باہر نہ نکلے۔

کتابوں سے اس کو بے حد تعلق خاطر تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کی کئی ہزار قلمی کتابیں اس کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ تھیں، جو شہادت کے بعد دوسرے سامان کے ساتھ لوٹ لی گئیں، ان میں بہت سی کتابیں لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم و فنون پر مشتمل ہیں۔

ٹیپو نے ملک میں زراعت اور صنعت کو بڑی ترقی دی، تجارت کو وسعت دینے کی غرض سے بیرونی ممالک سے روابط بڑھائے، اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کیے اور رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بے پناہ کوششیں کیں۔ وہ حکومت کو اللہ کی طرف سے امانت سمجھتا تھا اور اس امانت کا حق ادا کرنے کی جو صورت بھی ممکن ہوتی اس کو بروئے کار لاتا۔ بحری اور بری فوج کو نئے انداز سے منظم کیا اور "فتح المجاہدین" کے نام سے ایک کتاب لکھوائی، جس میں فوج کی تنظیم اور اس کی نقل و حرکت کے وہ قواعد بھی درج ہیں، جو اس زمانے میں مغربی ممالک

میں رائج تھے اور وہ قواعد بھی مرقوم ہیں جو خود سلطان نے اپنے تجربات کی روشنی میں وضع کیے۔ فنِ جہاز سازی سے بھی اس کو شغف تھا، اس سلسلے میں اس نے حالات کے مطابق بہت سی نئی چیزیں ایجاد کیں۔

بہرحال ٹیپو سلطان اپنے دور کا عدیم المثال حکمران تھا، اپنی قلمرو میں اس نے جو اصلاحات نافذ کیں، وہ تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔ ارضِ ہند کے اس نامور جرنیل اور ممتاز حکمران کے کارنامے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

ٹیپو سلطان نے ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۱۳ھ (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کو شہادت پائی۔ اس کی موت کا المناک حادثہ اس وقت پیش آیا جب بارھویں صدی ہجری اپنی بساط لپیٹ چکی تھی اور تیرھویں صدی ہجری نے اپنے سفر کے تیرہ سال پورے کر لیے تھے۔ عیسوی حساب سے اٹھارھویں صدی قریب الاختتام تھی۔ اس مردِ مجاہد کا وقتِ آخر جہاں حسرت و افسوس کی ایک اندوہ ناک یادگار اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے، وہاں اس کے عزم و حوصلہ اور جرأت و شجاعت کا ایک لافانی نقش بھی اوراقِ تاریخ پر ثبت کر گیا ہے۔

یہ ایک انتہائی غم انگیز سانحہ ہے کہ جب شیر دل ٹیپو کو پتا چلا کہ وہ محل میں محصور ہو گیا ہے اور انگریزی فوج لحظہ بہ لحظہ اس کا محاصرہ تنگ کر رہی ہے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا "رضائے مولیٰ بر ہمہ اولیٰ"

۴ مئی ۱۷۹۹ کا دن اس کی زندگی کا آخری دن تھا۔ شدید دھوپ میں دوپہر کے وقت وہ انگریزوں سے دست بدست جنگ کر رہا تھا، اس کے غدار ساتھیوں یہاں تک کہ اس خادم نے بھی جو ہاتھ میں پانی کی چھاگل لیے سامنے کھڑا تھا، ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ چند رفقائے خاص کے سوا سب اہل کار انگریز کے ہاتھ بک چکے تھے۔ دربار کے ذمے دار لوگوں نے انگریزی فوج کو قلعے میں داخل کیا اور جب بہادر سلطان اپنے چند محافظوں کے ساتھ دشمن کے سامنے سینہ سپر ہوا تو محافظ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ عین اس وقت جب کہ وہ نہایت دلیری سے دشمنوں پہ

تلوار کے فیصلہ کن وار کر رہا تھا، شدتِ پیاس سے بے قرار ہو کر خادم سے پانی طلب کیا، خادم خاموش کھڑا رہا۔ پھر اُس نے خدا کا واسطہ دے کر پانی کا ایک قطرہ مانگا، سنگ دل خادم پر اس لجاجت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ نہ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا نہ چھاگل سے پانی کا گھونٹ باہر نکلا۔ بالآخر وہ شدید زخمی ہو کر پانی مانگتا ہوا گھوڑے سے گرا، اور جامِ شہادت نوش کر کے اپنی پیاس بجھائی، اور تاریخِ جبر و ستم کی پیشانی پہ خونِ شہادت سے ہمیشہ کے لیے یہ فقرہ ثبت کر دیا۔

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔

لیکن ادھر جب انگریز جرنیل ہارس نے سلطان کی خون آلود لاش پر نگاہ ڈالی تو فرطِ مسرت سے پکار اُٹھا۔ "آج ہندوستان ہمارا ہے"۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اٹھارھویں صدی میں برصغیر کے جن مجاہدوں نے انگریزی اقتدار کا مقابلہ کیا اور اس کے نتیجے میں درجۂ شہادت کو پہنچے، ان میں تین شخصیتیں نمایاں ہیں:

ایک سراج الدولہ۔

دوسرے حافظ رحمت خاں روہیلہ۔

تیسرے ٹیپو سلطان۔

انھوں نے علی الترتیب ۲۹ جون ۱۷۵۷ء، ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء اور ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جامِ شہادت نوش کیا۔

واقعات کی صحیح ترتیب سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی آخری جنگوں کو "جنگ" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

سراج الدولہ لڑائی کے میدان میں نہیں آنا چاہتا تھا، لیکن اس کو دجل و فریب سے اس کے وزرا و امرا پلاسی کے میدان میں لائے اور اسے بعد میں گرفتار کر کے شہید کر دیا گیا۔

حافظ رحمت خاں کے ساتھ بھی دھوکا ہوا، جس کا نتیجہ اس کی موت کی شکل میں نکلا۔

ٹیپو سلطان سے بھی اس کے ساتھیوں نے غداری کی۔ انگریزی فوج کے لیے قلعے کے دروازے کھول دیے، ادھر وہ قلعے میں داخل ہوئی اور ادھر میر صادق نے اپنی فوج کو بلا کر تنخواہ دینا شروع کر دی۔ سلطان کو اس سے بے خبر رکھا گیا، اور وہ انگریزوں اور اس کے اتحادیوں کے اچانک حملے کے موقعے تنہا کھڑا تھا، لیکن یہ اس کی انتہا درجے کی بہادری تھی کہ اس نے دشمن کے سامنے جھکنا گوارا نہیں کیا اور شہادت سے ہم کنار ہو گیا۔

حرفِ آخر

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے سیاسی واقعات و حوادث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حکمرانوں کے خلاف امرائے سلطنت کی غداریوں اور عمالِ حکومت کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر ایک واقعے کے ساتھ دوسرا واقعہ اور دوسرے کے ساتھ تیسرا اس طرح پیوستہ ہے کہ کسی بات کو خاص ترتیب سے بیان کرنا مشکل ہے۔ ہم نے اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ تاریخ کے خس و خاشاک میں سے مطلب کی ضروری باتیں چھانٹ لیں اور ان کو قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اس سعی میں ہم کہاں تک کامیاب رہے ہیں، یہ فیصلہ کرنا قارئین کا کام ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اٹھارھویں صدی اگرچہ سیاسی اعتبار سے زوال و انحطاط کی صدی ہے اور اس میں حکمرانوں اور امرائے مملکت میں دین داری کا عنصر بھی کم ہی نظر آتا ہے لیکن اس میں علوم و فنون نے خوب ترقی کی، علما و فقہا کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ حکمرانوں نے بھی علم کے فروغ میں پورا حصہ لیا اور اہلِ علم کی ہر موقعے پر پذیرائی کی۔ ان سے تعلقات بڑھائے اور ان کو عزت و اکرام کے مستحق گردانا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

ہر حکمران کے عہد میں اہلِ علم اور اصحابِ فضل کی ایک جماعت موجود رہی ہے۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس صدی کے لیل و نہار مزید الم ناک واقعات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ اس میں صرف دو مغل حکمران ہندوستان کے افقِ سیاست پر باقی رہ گئے ہیں۔ ایک ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی، جس کا دورِ بادشاہت ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اکتیس سال کو محیط ہے۔ دوسرا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر جو ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بیس سال مسندِ بادشاہت پر متمکن رہا۔ یہ صرف نام کے بادشاہ تھے، حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور پورے برِصغیر پر انگریزوں کا پرچمِ اقتدار لہرانے لگا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان میں شدید ردِّ عمل ہوا، اور انگریز کی مخالفت میں کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی اور قلم و قرطاس سے تعلق قائم رہا تو اس ضمن کے ضروری واقعات فقہائے ہند کی جلد ششم میں بیان کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔ ربنا اٰتنا من لدنك رحمة وھیّئ لنا من امرنا رشدًا۔

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی

۲۳ رجب ۱۴۰۱ھ — ۲۸ مئی ۱۹۸۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بارھویں صدی ہجری

۱۔ شیخ مجیب اللہ جعفری پھلواروی

شیخ مجیب اللہ بن ظہور اللہ بن کبیر الدین جعفری پھلواروی، اپنے عصر اور علاقے کے نامور فقیہ، جیّد عالمِ دین اور فضل و صلاح میں یگانہ تھے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے، اس لیے جعفری کی نسبت سے مشہور تھے۔

شیخ مجیب اللہ پھلواروی ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۹۸ھ کو پھلواری میں پیدا ہوئے جو صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ میں واقع ہے اور عرصۂ دراز سے علم و فضل کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ہوش سنبھالا تو وہیں کے ایک بزرگ مولانا فصیح الدین پھلواروی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ ایک روایت کے مطابق اپنے ماموں زاد بھائی مولانا عماد الدین جعفری پھلواروی (متوفی ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۲۴ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں عازمِ بنارس ہوئے، وہاں شیخ محمد وارث حسینی بنارسی (متوفی ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۷ھ) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شرکت کی اور باقی علوم مروّجہ کی تحصیل فرمائی۔ انہی سے طریقۂ اویسیہ قادریہ میں فیض حاصل کیا۔ پھر اپنے شہر پھلواری کو مراجعت کی، اور ۱۱۲۲ھ میں مولانا عماد الدین جعفری پھلواروی سے طریقۂ قلندریہ میں اخذِ طریقت کیا۔ کسبِ علم اور اخذِ طریقت کے بعد اپنے شہر پھلواری میں

مسندِ دعوت و ارشاد آراستہ کی اور خلقِ کثیر کو مستفید فرمایا۔
شیخ مجیب اللہ جعفری پھلواروی نے ۱۱۹۱ھ میں وفات پائی۔[۱]

۲۔ قاضی محب اللہ بہاری

قاضی محب اللہ بن عبد الشکور عثمانی صدیقی بہاری، دیارِ ہند کے نامور فقہا اور ممتاز علما میں سے تھے۔ موضع کڑا میں پیدا ہوئے جو اعمالِ محب علی پور مضافاتِ بہار شریف (ہندوستان) میں واقع تھا۔ ان کا خاندان "ملک" کہلاتا تھا اور اس علاقے میں شرافت اور علم و قابلیت میں مشہور تھا۔ قاضی محب اللہ اوائل شباب ہی میں تحصیل علم کے لیے پورب وغیرہ کے علاقوں میں چلے گئے تھے۔ متعدد مقامات پر گھومے پھرے اور کئی علما سے ابتدائی اور اوسط درجے کی کتابیں پڑھیں۔ بالآخر شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی (سن شہادت ۱۱۰۳ھ) کی خدمت میں گئے اور ان سے کچھ درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ بعض کتبِ درسیہ علامہ قطب الدین حسینی شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ) سے پڑھیں۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کو علم کا بحر ذخار بنا دیا اور آسمان علوم و فنون کے ستاروں میں انھیں بدرِ کامل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول وہ "بحرے است از علوم و بدرے است بین النجوم"۔

تحصیل علم کے بعد حکومت کے ایوانوں سے وابستہ ہونے کا عزم کیا اور شاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں پہنچے جو ان دنوں بلادِ دکن میں مقیم تھا۔ علما کے اس قدر دان بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر لکھنؤ کے منصب قضا پر متمکن کیا۔ کئی سال اس عہدے پر فائز رہے۔ بعد ازاں معزول ہو گئے۔ دوسری مرتبہ پھر دکن کا عزم کیا اور بادشاہ سے ملاقات کی۔

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۹، ۲۵۰۔ بحوالہ شجرۃ الشیخ بدر الدین

اب اُس نے ان کو حیدرآباد (دکن) کا قاضی مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے بعد کسی وجہ سے بادشاہ ان سے ناراض ہو گیا اور انھیں منصبِ قضا سے علیحدہ کر دیا گیا۔

چند دنوں بعد لوگوں نے بادشاہ کے حضور ان کی سفارش کی اور قصور معاف کر دیا گیا۔ اب بادشاہ نے ان کو اپنے پوتے رفیع القدر کی تعلیم پر مامور کیا، جو محمد معظم (شاہ عالم) کا بیٹا تھا۔ پھر جب زندگی کے آخری دور میں اورنگ زیب عالم گیر نے کابل کی ولایت محمد معظم کے سپرد کی اور وہ اپنے بیٹے رفیع القدر کو ساتھ لے کر دکن سے کابل روانہ ہوا تو قاضی محب اللہ بہاری کو بھی ساتھ لے گیا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۱۱۸ھ میں محمد معظم نے شاہ عالم کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کی زمامِ حکومت ہاتھ میں لی تو اس نے قاضی محب اللہ بہاری کو ممالکِ ہند کی صدارتِ عظمیٰ کے منصبِ جلیلہ پر فائز کیا اور فاضل خاں کا لقب عطا فرمایا۔ یہ واقعہ ۱۱۱۹ھ کا ہے۔

قاضی محب اللہ بہاری بڑی علمی رفعت کے مالک اور جلالتِ قدر کے حامل تھے، ذہانت و خطابت میں یگانہ اور تحقیق و تدقیق میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ہر گوشۂ علم پر اُن کی نظر تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور دیگر تمام علوم پر انھیں عبور حاصل تھا۔ فارسی اور عربی کے بہترین ادیب تھے۔ مولوی رحمان علی "تذکرہ علمائے ہند" میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بحرے بود از بحارِ علوم و بدرے بود بین النجوم۔

یعنی اگر علوم کے دریا جاری ہوں تو قاضی محب اللہ کی حیثیت علم کے تیز دریا اور ستاروں کے درمیان بدرِ کامل کی تھی۔

ہندوستان کی سرزمین کو جن اجلۂ علما کے قدم چومنے کا شرف حاصل ہوا ان میں قاضی محب اللہ بہاری کے نامِ نامی کو بہت اہمیت حاصل ہے، وہ اونچے درجے کے مدرس، بلند مرتبہ شارح اور بہترین مصنف تھے۔ ان کو اللہ نے بے حد شہرت عطا کی اور اپنے معاصرین میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے

دیکھے گئے۔ ان کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ اسی دور میں ان کی کتابوں کو درسِ نظامیہ میں شامل کر لیا گیا اور ان کے حواشی و شروح معرضِ تحریر میں لائے گئے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ سُلّم العلوم : یہ کتاب علم منطق میں ہے اور اس فن کے نہایت دقیق اور مشکل مباحث کو محتوی ہے۔ یہ کتاب باقاعدہ درسِ نظامیہ میں شامل ہے اور علمائے منطق نے اس کو شروع ہی میں لائقِ اعتنا ٹھہرا لیا تھا، اس پر انھوں نے حواشی لکھے اور اس کی شرحیں سپردِ قلم کیں۔

ہندوستان سے باہر کے ماہرین منطق کی دو ایسی کتابیں ہیں جنھیں طبقۂ علما میں عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔ پہلی کتاب نجم الدین عمر بن علی قزوینی کی "الشمسیہ" ہے اور دوسری علامہ سعد الدین تفتازانی کی "تہذیب المنطق"۔ ان کتابوں کو اصحابِ منطق میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس حلقے میں اس قدر متداول ہوئیں کہ انھیں داخل نصاب کیا گیا اور شروح و حواشی کے لیے شائستۂ التفات گردانا گیا۔ مدارس عربیہ میں ان کتابوں کے بعد قاضی محب اللہ بہاری کی "سُلّم العلوم" کی باری آتی ہے اور یہ طلبا کو باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر مشمولاتِ منطق کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتی ہے۔ مصنف شہیر نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رہنے دیا۔ تمام منطقی اشکالات اور اس فنِ دقیق کے نزاعی مباحث کا احاطہ کر لیا ہے۔ مصنف نے اس کے مقدمے میں اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ "میں چاہتا ہوں کہ سُلّم العلوم کتبِ درسیہ میں اس طرح چمکے کہ جس طرح ستاروں میں چاند چمکتا ہے"۔

ان کی زندگی ہی میں ان کی یہ تمنا پوری ہو گئی تھی، اور اہلِ علم نے اس کی شرحیں لکھنے کی طرف عنانِ توجہ مبذول کر لی تھی۔

سُلّم العلوم کی پہلی شرح کس نے لکھی، اس سلسلے میں مولانا فضل امام خیرآبادی (متوفی ۵ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ - ۹ مئی ۱۸۲۸ء) جو دیارِ ہند کے

نامور عالم ہیں ، قاضی محمد مبارک گوپاموی (متوفی ۵ شوال ۱۱۶۲ھ) کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اوّل کسے کہ حاشیہ بر میر زاہد نوشت و سُلّم را شرح کرد، او بُود۔

یعنی قاضی محمد مبارک گوپاموی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے میر زاہد پر حاشیہ لکھا اور سُلّم کی شرح سپردِ قلم کی۔

لیکن واقعات کی ترتیب اور دیگر حالات سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا فضل امام خیر آبادی کی یہ بات صحیح نہیں، اس لیے کہ قاضی محمد مبارک گوپاموی نے اپنی شرح کے خاتمے پر لکھا ہے :

قد تم الشرح بفضل من اللہ تعالیٰ و تبارك من عبدہ محمد مبارك فی سنة الف و مائة واربعین و ثلث من الهجرة النبوية فی سابع شهر ربيع الاوّل يوم الخميس فی بلدة شاه جهان اباد۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کے بندے محمد مبارک کے ہاتھوں یہ شرح ۷ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ کو بروز جمعرات شہر شاہ جہان آباد (دہلی) میں مکمل ہوئی۔

سُلّم العلوم کی ایک شرح بارھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے ممتاز فاضل شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۷ھ) نے تحریر فرمائی۔ وہ اپنی شرح (تصدیقات) کے خاتمے پر رقم طراز ہیں :

صنفه خادم الطلبة احمد عبد الحق بن فاضل الكامل محمد سعيد بن ملا قطب الدين شهيد قطب العلماء والعرفان الانصاری السهالی سنة الف و مائة و ثلاثين من الهجرة النبوية۔

طلبا کے خادم احمد عبدالحق بن شیخ محمد سعید بن ملا قطب الدین شہید انصاری سہالوی نے یہ شرح ۱۱۳۰ھ میں تصنیف کی۔

شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قاضی محمد مبارک گوپاموی کی شرح کو اوّلیت حاصل نہیں ہے اور مولانا فضل امام خیر آبادی کا یہ

کہنا تاریخی لحاظ سے درست نہیں کہ سلم العلوم کی شرح سب سے پہلے قاضی محمد مبارک گوپاموی نے لکھی، اس لیے کہ قاضی محمد مبارک نے اپنی شرح ۷ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ کو مکمل کی اور شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی اس سے تیرہ سال پیشتر ۱۱۳۰ھ میں اس اہم کام سے فارغ ہو چکے تھے۔

لیکن اس کے باوجود یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ شیخ احمد عبدالحق کی شرح اولین شرح ہے، اس لیے کہ خود شیخ احمد عبدالحق کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی سُلم العلوم کی کچھ شرحیں لکھی گئی تھیں۔ چنانچہ اپنی شرح کے خاتمے پر احمد عبدالحق رقم طراز ہیں:

وکنت بالغا فی الایضاح لم نجد مثلہ شرحا موضحا فائقا للابکار نافعا للطلاب۔

میں نے مطالبِ کتاب کی وضاحت میں پوری کوشش کی ہے، ایسی واضح، عمدہ افکار میں ممتاز اور طلبائے علم کے لیے مفید کوئی دوسری شرح ہم نے نہیں پائی۔

شیخ احمد عبدالحق کے ان الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی سُلم العلوم کی کچھ شرحیں قلم بند ہو چکی تھیں، لیکن ان میں الجھاؤ تھا اور وہ طلبا کے لیے زیادہ واضح اور سود مند نہ تھیں۔

بہر حال شیخ محب اللہ بہاری کی اس کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور متعدد حضرات نے اس کی شرحیں لکھیں، جن میں شرحِ احمد عبدالحق، شرح قاضی مبارک، شرح حمداللہ سندیلوی، شرحِ ملا مبین اور شرحِ مُلا مسافر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ مُسَلّم الثبوت: قاضی محب اللہ بہاری کی یہ کتاب اصولِ فقہ سے تعلق رکھتی ہے اور مدارسِ عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے سالِ تالیف ۱۱۰۹ھ نکلتا ہے۔ یعنی یہ کتاب انھوں نے ۱۱۰۹ھ میں تصنیف کی۔

مُسلّم الثبوت اپنے موضوع میں نہایت اہم کتاب ہے اور اصولِ فقہ کی اونچے مرتبے کی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ علما و طلبا کے حلقے میں بہت مقبول و متداول ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے اصولِ فقہ کے بنیادی اور اصولی مباحث کو ہدفِ فکر و نظر ٹھہرایا ہے۔ برِصغیر کے علاوہ یہ کتاب مصر کے علما و طلبا میں بھی مقبول ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ "مُسلّم الثبوت" شافعی اور حنفی اصولِ فقہ سے متعلق ہے۔ یہ کتاب افغانستان کے مشہور عالم مُلا حبیب اللہ قندھاری (تیرھویں صدی ہجری) کے ملاحظہ میں آئی تو انھوں نے "مغتنم الحصول فی علم الاصول" کے نام سے اس موضوع پر کتاب تصنیف کی، جس کا نقطہ نظر بعض امور میں "مسلم الثبوت" سے کافی حد تک مختلف ہے۔ کتاب اپنے مباحث و مندرجات کے اعتبار سے بڑی علمی ہے۔ یہ قلمی کتاب ہے، ہمارے علم کے مطابق پاکستان میں اس کے صرف دو ہی نسخے ہیں، ایک پشاور یونیورسٹی لائبریری میں اور ایک حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے (وزیرآباد) میں حضرت حافظ صاحب کے کتب خانے کا نسخہ ہمیں مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (مکتبہ سلفیہ، لاہور) کی وساطت سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ نسخہ بڑے سائز کے ۲۴۷ اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ ۲۴ سطور کو محیط ہے۔ خط بہت اچھا ہے۔ "مغتنم الحصول فی علم الاصول" کے فاضل مصنف نے "مسلم الثبوت" کے بعض مقامات کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ انداز بڑا فاضلانہ اور محققانہ ہے۔ یاد رہے یہ وہی مُلا حبیب اللہ قندھاری ہیں، جو مولانا عبداللہ غزنوی (متوفی ربیع الاول ۱۲۹۸ھ – ۱۸۷۹ء) کے استاذ اور مرشد تھے۔

۳۔ الجواہر الفرد: یہ بھی منطق کی کتاب ہے اور جزءِ لایتجزیٰ کے بارے میں ہے۔

یہ تینوں کتابیں مدارسِ عربیہ اور طبقۂ علما میں مروج و متداول ہیں۔

۴۔ مغالطۃ عامۃ الورود: یہ ایک رسالہ ہے جس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ مذہبِ حنفیہ رائے اور قیاس کے سلسلے میں مذہبِ شافعیہ سے زیادہ بعید ہے۔

قاضی محب اللہ بہاری نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور شہر بہار (ہندوستان) کے محلہ چاند پور میں مدفون ہوئے[۱]

وفات کی تاریخ ان الفاظ سے مستخرج ہے:

قاضی مولوی محب اللہ ۱۱۱۹ھ — رفتہ سوئے ارم حبیب اللہ ۱۱۱۹ھ

"بزم تیموریہ" میں سالِ وفات ۱۱۹۰ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ کتابت کی غلطی ہے۔

۳۔ سیّد محمد قنوّجی

سیّد محمد قنوّجی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن محمد بن محمد بن گدائی بن سیّد مالک بن عماد الدین بن حسین بن علاء الدین علی بن محمد بن ضیاء الدین حسینی دہلوی ثم قنوجی۔!

سید محمد قنوجی ارضِ ہند کے مشاہیر فقہا اور کبار علما میں سے تھے۔ قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کے لیے

---

[۱] مآثر الکرام ص ۲۰۰، ۲۰۱ — ابجد العلوم ص ۹۰۵ — سبحۃ المرجان ص ۶۶ — نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ — قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۰۲، ۲۰۳ — حدائق الحنفیہ ص ۴۳۱، ۴۳۲ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۵، ۱۷۶ — تراجم الفضلاء ص ۸۱ — تذکرہ مصنفین درسِ نظامی ص ۲۱۰ تا ۲۱۴ — بزم تیموریہ، ص ۲۵۲ — مقدمہ سلم العلوم — علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۱ ص ۴۰۵، ۴۰۶۔

رختِ سفر باندھا اور قاضی عبدالقادر عمری لکھنوی (متوفی ۲۷ شعبان ۱۰۷۶ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ پھر الہ آباد کا قصد کیا، وہاں شیخ محب اللہ الہ آبادی (متوفی ۹ رجب ۱۰۵۸ھ) کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، اس میں شرکت کی اور نعمتِ علم سے فیض یاب ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن قنوج تشریف لائے اور تمام دنیوی معاملات سے منقطع ہو کر گھر میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے آپ کو عبادتِ الٰہی اور افادۂ طلبا کے لیے وقف کر دیا۔

اس زمانے میں مغل حکمران شاہ جہان تختِ ہند پر متمکن تھا۔ وہ علم اور علما سے انتہائی تعلقِ خاطر رکھتا تھا، سید محمد قنوجی کے فضل و کمال اور فراوانیِ علم کا شہرہ اس تک پہنچا تو اس نے اپنے سالِ جلوس کے بتیسویں سال انھیں دربار میں طلب کیا اور پھر ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اس درجے متاثر ہوا کہ عمر بھر اپنے سے جدا نہ ہونے دیا۔ حتیٰ کہ قلعہ اکبر آباد کے ایامِ اسیری اور زمانۂ نظر بندی میں بھی ساتھ رکھا۔ محمد صالح کمبوہ کی روایت کے مطابق شاہ جہان ان سے قرآن و حدیث اور دیگر کتب اسلامی سنتا اور تمام حاضرینِ مجلس اس جلیل القدر عالم سے استفادہ کرتے ۵۳

شاہ جہان کی وفات کے وقت بھی سید موصوف اس کے پاس موجود تھے۔ جن حضرات نے اس کی تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیے اور میّت کو قلعے کے برجِ مثمن کے دروازے سے حصار سے باہر لائے، ان میں ایک سید محمد قنوجی بھی تھے۔ پھر نمازِ جنازہ اور تدفین میں بھی شامل تھے۔

شاہ جہان کی وفات کے بعد ان کو اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے ساتھ وابستہ کر لیا اور اپنے خاص مصاحبوں اور ندیموں میں شامل کیا اور فتاویٰ عالم گیری کی

---

۵۳ عمل صالح ج ۳ ص ۲۶۶

تدوین و ترتیب میں ان کو شریک فرمایا۔ عالم گیر ان کی بے حد تکریم کرتا اور عجز و نیاز مندی سے پیش آتا۔ وہ انھیں "استاذ" کہہ کر پکارتا اور کہا کرتا کہ یہ میرے بھی استاذ ہیں اور میرے والد کے بھی۔!

اورنگ زیب عالم گیر جو کہ علما کا انتہائی احترام کرتا تھا، سید محمد قنوجی سے امام غزالی کی تصنیفات بالخصوص احیاء علوم الدین اور کیمیائے سعادت کا درس لیتا۔ ہفتے میں تین روز وہ مجلس شاہی کے مذاکرۂ علوم میں سرگرم ا دہ رہتے۔ اس اثنا میں بادشاہ ان سے دیگر کتابوں کے علاوہ حدیث، فقہ اور سلوک و تصوّف کے موضوع سے متعلق مختلف کتابیں پڑھتا اور ان کے مندرجات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ علاوہ ازیں فتاویٰ عالم گیری کے بارے میں مذاکرہ کرتا اور بحث میں باقاعدہ حصّہ لیتا۔

سید محمد قنوجی جہاں علم و فضل میں یکتا تھے وہاں فقر و بے نیازی میں بھی منفرد تھے۔ ان کا ہندوستان کے اِن دو عظیم الشان بادشاہوں سے انتہائی قریب کا تعلق رہا۔ وہ اگرچہ ان سے بدرجۂ غایت عقیدت رکھتے تھے لیکن سید ممدوح ان سے کبھی کسی منصب و امارت کے خواہاں نہیں ہوئے۔ امارت پر ہمیشہ درویشی کو ترجیح دی، اور دربار شاہی سے تعلق کے باوجود زندگی کے آخری دم تک علما کی خاص نوع کی وضع قطع اور مخصوص ہیئت کو اپنائے رکھا۔ وہ کسی لمحے بھی اس دائرۂ خاص سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے۔ حالاں کہ ان کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ اپنے شہر قنوج میں معقول مالی حیثیت کے حامل اور کئی گاؤں کے مالک تھے۔

سید محمد قنوجی کا ذکر حضرت سید نواب صدیق حسن خاں نے بھی ابجد العلوم میں کیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے علاقے اور شہر کے صاحبِ ثروت عالمِ دین تھے اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں خصوصیت سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اُن کے عربی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

"سید محمد قنوجی، سادات سے تعلق رکھتے تھے اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ تھے - ان کی بہتر یادگاروں میں سے ایک عمارت مسافر خانے کی ہے جس کی اس نواح میں کوئی مثال نہیں ملتی - ان کا ایک باغ ہے، جس میں ایک بہت بڑا قبرستان ہے - اسی قبرستان میں خود ان کی اپنی قبر بھی ہے - علوم ریاضی اور علوم عربیہ میں انھیں بڑی دسترس حاصل تھی - انھوں نے معانی وبیان کی مشہور کتاب مطوّل پر حاشیہ تحریر کیا - وہ ایک عظیم المرتبت، حامل عزّ وجاہ، صاحب ثروت اور مال دار عالم تھے - علم وحکمت اور شوکت وشہامت کی دولت ان کی ذات میں سمٹ آئی تھی - اس شہر (قنوج) میں ان کے ورثا بھی رہتے ہیں لیکن وہ سب نا اہل لوگ ہیں[1]"

بہر حال سید محمد قنوجی اپنے دور کے جلیل القدر عالم وفقیہ اور فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی بلند مرتبت جماعت کے اہم رکن تھے - جس طرح شاہ جہان ان کی وسعتِ معلومات سے متاثر ہو کر ان سے استفادہ کرتا تھا، اسی طرح اورنگ زیب عالم گیر بھی ان کو انتہائی اعزاز واحترام کا مستحق گردانتا اور ان سے مستفید ومستفیض ہوتا تھا - اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ عالم گیر کے گیارھویں سالِ جلوس (۱۰۷۸ھ) میں، شعبان کو اس کے بیٹے شاہ زادہ محمد اعظم کی تقریب نکاح منعقد ہوئی تو سید محمد قنوجی کو وکیل نکاح بنایا گیا - اس کے بعد عالم گیر کے سولھویں سالِ جلوس (۱۰۸۳ھ) میں اس کے بیٹے شاہ زادہ محمد سلطان کا نکاح مراد بخش کی بیٹی دوست دار بانو بیگم سے ہوا تو سید محمد قنوجی کو بادشاہ کی طرف سے گواہ مقرر کیا گیا -

اورنگ زیب نے مختلف مواقع پر انھیں انعام واکرام اور خلعت سے بھی سرفراز کیا -

---

[1] ابجد العلوم ص ۹۳۴ -

بالاختصار سید محمد قنوجی اپنے عصر کی عظیم شخصیت تھے، گوناگوں اوصاف سے متصف اور علم و تحقیق میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علما و فقہا، ارباب حکومت اور امرائے سلطنت میں بڑے مرتبہ و عزت کے حامل تھے۔ بادشاہ ان کی فضیلت علمی، تدین و پارسائی اور دقت نظر سے بہت متاثر تھا، اسی وجہ سے وہ ان پر پورا اعتماد کرتا اور اہم مواقع پر ان کو اپنے ساتھ رکھتا اور ان سے مشورے لیتا تھا۔

انھوں نے ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی[۵]

اولاد

سید محمد قنوجی کے تین بیٹے تھے۔ ایک کا نام سید احمد تھا، ایک کا سید شریف اور ایک کا میر عبدالکریم۔ اتینوں بڑے منتظم اور قابل تھے اور عالمگیر کے حلقہ ملازمین سے منسلک۔!! ان کے تفصیلی حالات تو معلوم نہیں ہو سکے، البتہ جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ سید احمد کو قاضی محمد حسین محتسب (جو فتاوی عالم گیری کے مرتبین میں سے تھے) کے انتقال کے بعد اورنگ زیب کی طرف سے محتسب کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا[۶]

سید شریف کے متعلق مآثر عالم گیری میں جلوس عالم گیری کے تیسویں سال (۱۰۹۷ھ) کے حالات کے ضمن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی انتظامی صلاحیتوں کے مالک اور لائق شخص تھے۔

---

[۵] ان کے حالات کے لیے یہ کتابیں بھی دیکھیے: مآثر الامرا، ج ۳ ص ۵۰۴؛ عالم گیر نامہ صفحات ۴۴، ۳۹۷، ۴۲۷، ۴۲۸، ۹۳۲ تا ۹۳۵، ۱۰۶۰ — مآثر عالم گیری صفحات ۷۲، ۹۴، ۱۳۸ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۳، ۲۱۵، ۲۱۶ — نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۲۵۳، ۲۵۴ — بزم تیموریہ ص ۲۲۴ — برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۲۸۹ تا ۲۹۵۔

[۶] مآثر عالم گیری (اردو ترجمہ) ص ۱۱۲۔

اس سال کثرتِ باراں کی وجہ سے شدید قحط پڑا تھا، اس موقع پر انھوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ مآثرِ عالم گیری کا مصنف محمد ساقی مستعد خاں جن الفاظ میں ان کی خدمات کا ذکر کرتا ہے، ان کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

اس زمانے میں شدید بارش کی وجہ سے زمین پر دریا بہنے لگے اور قحط پڑ گیا۔ شہر کے ارد گرد غلے کی رسد بند ہو گئی اور رعایا میں ماتم بپا ہو گیا، لاکھوں بندگانِ خدا کی جانیں تلف ہو گئیں۔ مکان، دریا اور جنگل مردہ جسموں سے پٹ گئے۔ لشکر گاہ کی یہ حالت تھی کہ شب کو دولت خانۂ شاہی کے گرد مردہ جسموں کے انبار لگ جاتے، جن کو جاروب کش یا خاکروب روزانہ گھسیٹ گھسیٹ کر دریا میں ڈالتے تھے۔ صبح سے شام تک لاشوں کے اٹھانے کا سلسلہ جاری رہتا۔

صورتِ حال یہاں تک ابتر اور تکلیف دِہ ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بھوک کی شدت سے مردار کھانے سے کوئی پرہیز نہ رہا تھا۔ مُردوں کی لاشوں سے شہر کے تمام گلی کوچے پٹ گئے تھے۔ بارش کے مسلسل اور طویل سلسلے نے انسانوں اور حیوانوں کے گوشت پوست کو گلا دیا تھا خطرہ یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ مردار کی سخت بدبو آب و ہوا میں تعفن پیدا کر کے ان لوگوں کو بھی موت کے منہ میں ڈھکیل دے گی جو زندہ بچ گئے تھے۔

چند ماہ بعد بارش کا زور گھٹا اور دریا کی طغیانی کم ہوئی تو اطراف و جوانب سے شہر میں غلہ پہنچنے لگا۔ سردار خاں کی بجائے سیّد شریف خاں کروڑہ گنج کی خدمت پر مامور ہوئے، یہ وہی سیّد شریف خاں ہیں جو حضرت فردوس آشیانی اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاذِ اعلیٰ قدوۃ المشائخ پیر سیّد محمد قنوجی کے فرزندِ گرامی تھے، اور سیّد محمد قنوجی فضل و کمال میں مشہور اور عقل و شعور میں معروف تھے۔ اس موقعے پر رعایا پرور بادشاہ کے حسنِ نیت سے گرانی رفع ہوئی اور ملک

میں غلہ ارزاں ہو گیا تھا[57]

اورنگ زیب نے سید شریف کو ان کی قابلیت اور گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر امجد خاں کا لقب عطا کیا تھا۔ نزہۃ الخواطر میں ان کے حالات جن الفاظ میں مرقوم ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

"سید شریف محمد بن محمد بن محمد حسینی قنوجی، نواب امجد خاں۔ سید محمد قنوجی کے بیٹے تھے۔ ان کا شمار اس عصر کے نامور علما کی جماعت میں ہوتا تھا۔ علوم و فنون اور طریقت میں اپنے باپ سید محمد قنوجی سے فیض حاصل کیا تھا اور عرصے تک ان کے ساتھ منسلک رہے تھے۔ حصول علم کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کے مقربین میں شامل ہو گئے۔ اس نے قاضی محمد حسین جون پوری کی وفات کے بعد ۱۰۷۶ھ میں ان کو محکمۂ احتساب پر فائز کر دیا اور امجد خاں کے لقب سے سرفراز کیا۔ طویل مدت تک اس عہدے پر متعین رہے۔ پھر صدارتِ ہند کے منصبِ علیا پر فائز کیے گئے"[58]

سید محمد قنوجی کے تیسرے بیٹے سید میر عبدالکریم قنوجی تھے جو فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے نامور علما میں سے تھے۔ عالم گیر کی طرف سے برہان پور میں جزیہ وصول کرنے کے منصب پر مامور تھے۔ اس ضمن میں ان کی سرگرمیاں عالم گیر کے نزدیک اس درجے قابلِ قدر تھیں کہ ان سے متاثر ہو کر اس نے دکن کے چار علاقوں سے وصولیِ جزیہ کا عہدہ بھی ان کے سپرد کر دیا تھا۔ علم و فضل کی فراوانی کے ساتھ جود و سخاوت، عفت و تقویٰ اور حسنِ اخلاق کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ درسیات میں کامل مہارت رکھتے تھے اور ان کے ہاں یہ سلسلہ ہر حالت میں جاری رہتا تھا۔ عالم گیر کی طرف سے

---

۵۷ مآثر عالم گیری ص ۲۹۲، ۲۹۳

۵۸ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۳، ۲۸۴

امانتِ ہفت چوکی کے منصب کے ساتھ ساتھ جائے نماز خانہ کے داروغہ کی خدمت بھی ان کے سپرد تھی۔

تلامذہ

سیّد محمد قنوجی کے تلامذہ اور فیض یافتگان کا حلقہ بھی خاصا وسیع تھا جس میں ہندوستان کے دو بہت بڑے مغل بادشاہ بھی شامل تھے۔ ایک شہاب الدین محمد شاہ جہان، اور دوسرے اورنگ زیب عالم گیر۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات نے ان سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ان میں سے ایک شیخ علی اصغر قنوجی تھے، جو اپنے عہد کے مشہور عالم وفقیہ تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ نہایت نیک، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ قنوج میں ان کا ہنگامۂ درس جاری تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوّف وسلوک وغیرہ میں ممتاز درجے پر فائز اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

ان کے آباو اجداد اصلاً مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے، خاندان کے بعض حضرات نے مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے کرمان میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ پھر وہاں سے خاندان کے ایک بزرگ نے جن کا نام شیخ مبارک بن عماد الدین تھا، ہندوستان کا رُخ کیا اور قنوج میں متوطن ہو گئے۔ وہیں ۱۰۵۱ھ میں شیخ علی اصغر کی ولادت ہوئی اور پھر یہ شہر مستقل طور سے ان کا مسکن قرار پا گیا۔

شیخ علی اصغر نے پورے ساٹھ سال قنوج میں مسندِ تدریس بچھائے رکھی، اور اس اثنا میں بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ دیارِ ہند کے اس جیّد عالم وفقیہ نے ۸۹ سال عمر پا کر ۵ شعبان ۱۱۴۰ھ میں وفات پائی۔

۴- شیخ محمد گجراتی

شیخ محمد بن جعفر بن جلال بن محمد حسینی بخاری گجراتی، حضرت شیخ جلال الدین بخاری اُچی کی اولاد سے تھے۔ ۲ ربیع الاول ۱۰۴۷ھ کو پیدا ہوئے اور احمد آباد میں اپنے والد گرامی شیخ جعفر گجراتی اور دیگر علمائے عصر سے اخذِ علم کیا، یہاں تک کہ اپنے زمانے اور علاقے کے جلیل القدر اور بلند مرتبہ فقیہ ہوئے۔ ان کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا، جس سے بہت سے علمائے کرام اور طلبائے علم نے استفادہ کیا۔ تصنیف و تالیف میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور قرآن و حدیث پر خاصی نظر تھی۔ چناں چہ قرآن مجید کی ایک تفسیر تو فارسی میں لکھی، جس میں روایتِ اہل بیت کا التزام کیا۔ دوسری تفسیر عربی میں تفسیر جلالین کے انداز پہ تحریر کی۔

کتب احادیث میں مشکوٰۃ کو ان دنوں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ شیخ محمد گجراتی نے اسے بھی مرکزِ التفات ٹھہرایا اور "زینۃ النکات فی شرح المشکوٰۃ" کے نام سے اس کی شرح سپردِ قلم فرمائی۔ اس کے علاوہ مختلف مسائل سے متعلق اور بھی متعدد رسائل تحریر کیے۔

شیخ محمد گجراتی نے چونسٹھ برس عمر پا کر ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۱ھ کو احمد آباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے۔

۵- قاضی محمد آصف نگرامی

لکھنؤ کے نواح میں بہت سے قصبات و دیہات کو اہلِ علم کے مراکز کی حیثیت حاصل رہی ہے، ان میں ایک قریہ نگرام ہے جس کی خاک سے متعدد

---

۹ مرآۃ احمدی ص ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۵۷۔

اصحاب کمال پیدا ہوئے اور پھر ان کی علمی شہرت دُور دراز علاقوں میں پہنچی۔ علمائے نگرام میں ایک بزرگ قاضی محمد آصف گزرے ہیں جو اس نواح میں اپنے عصر کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ان کا کتب خانہ مختلف فنون کی بہترین کتابوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے ۲۲ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ کو نگرام میں وفات پائی۔[۱]

۶۔ شیخ محمد ارشد جون پوری

شیخ محمد ارشد جون پوری، مشہور عالم اور درسِ نظامیہ کی معروف کتاب "رشیدیہ" کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے فرزندِ گرامی قدر تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب انتیس واسطوں سے شیخ سری سقطی تک پہنچتا ہے۔ دیارِ ہند کے بہت بڑے عالم، شیخ اور متقی بزرگ تھے۔ ۱۰۴۱ھ میں پیدا ہوئے اور علم و مشیخت کی گود میں پرورش پائی۔ قرآن مجید پڑھا اور خوش نویسی اور کتابت مختلف حضرات سے سیکھی۔ علمِ صرف کی ابتدائی کتابیں یعنی میزان الصرف سے لے کر دستور المبتدی تک ایک عالم مولانا نصر اللہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد کتبِ نحو میں سے مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ اور شرح جامی وغیرہ کی تحصیل کی۔ اسی اثنا میں منطق کی ابتدائی کتابوں سے لے کر انتہائی کتابوں تک مختلف اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ معانی و بیان، ہیئت و ریاضی، مناظرہ، فقہ، اصول فقہ، علمِ فرائض، اصولِ حدیث، فلسفہ، تفسیر اور حدیث وغیرہ مروّجہ علوم کی تمام کتابوں کا جیّد و مشاہیر اساتذہ سے باقاعدہ درس لیا۔ اپنے والد مکرم شیخ محمد رشید جون پوری سے بھی متعدد فنون کی بہت سی کتابیں پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ نہایت

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۶۷۔

ذہین اور انتہائی فطین تھے، حافظہ بڑا تیز پایا تھا۔ تمام متداول علوم کی تحصیل سے اکیس سال کی عمر میں فارغ ہو گئے تھے۔ والد کی زندگی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

بہت نیک اور متدین تھے۔ تدریس کے ساتھ تلقین و موعظت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ قناعت و عفت اور فقر و توکل میں وہی معمول تھا جو والدِ گرامی شیخ محمد رشید کا تھا۔ ہر شخص سے نرمی اور انکساری کے ساتھ پیش آتے۔ مریض کی عیادت کرتے اور جنازوں میں شامل ہوتے۔ چھوٹے بڑے ہر شخص کی دعوت قبول فرماتے اور کسی کے لیے اذیت رسانی کا باعث نہ بنتے۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے اور اس پر خوش رہتے۔ نماز با جماعت پڑھنے اور اوّل وقت ادا کرنے کا اہتمام کرتے اور اپنے تلامذہ و رفقا کو بھی اس کی تاکید فرماتے۔ سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے۔

شیخ محمد ارشد جون پوری نے سلوک و تصوّف کے موضوع پر چند رسائل بھی تصنیف کیے۔ "گنجِ ارشدی" کے نام سے خود ان کے ملفوظات ۱۱۳۵ھ میں ان کے شاگرد شیخ شکر اللہ جون پوری نے جمع کیے، اور شیخ غلام رشید جون پوری (متوفی ۵ صفر ۱۱۶۷ھ) نے ان ملفوظات کو مرتب کیا۔ گنجِ ارشدی کا قلمی نسخہ جون پور میں موجود ہے۔ اس میں بہت سے علما و فضلا اور صوفیا و اولیا کے حالات و کوائف مرقوم ہیں اور اس کے حوالے مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔

شیخ محمد ارشد جون پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۳ھ کو جون پور میں وفات پائی۔[۱]

۷۔ مولانا محمد اسعد انصاری سہالوی

مولانا محمد اسعد انصاری سہالوی۔ برصغیر کے معروف عالمِ دین مولانا

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷ تا ۲۸ بحوالہ گنجِ ارشدی۔

قطب الدین انصاری سہالوی شہید کے چار بیٹوں میں سے بڑے بیٹے تھے ۔
موضع سہالی میں پیدا ہوئے جو لکھنؤ کے نواح میں اصحاب علم وفضل کا مشہور
قصبہ تھا ۔ اپنے والد مولانا قطب الدین سہالوی سے اخذِ علم کیا ۔ بارھویں
صدی ہجری کے جید علما میں سے تھے ۔ اپنے علمی کمال کی وجہ سے باپ کی
زندگی ہی میں برہان پور کے منصب صدارت پر فائز ہو گئے تھے ۔ اورنگ
زیب عالمگیر کے دربار سے منسلک تھے اور اس کے ہم رکاب رہتے تھے ۔
رئیسانہ مزاج کے مالک تھے ۔ حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ تحریر کیا ۔ بارھویں صدی
ہجری کے ہندوستان کے مشہور عالم ومصنف مُلا جیون امیٹھوی کے ہم عصر
تھے ، اور ایک مناظرے میں ملاجیون کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی تھی ۔
شاہ عالم کے زمانے میں علاقہ دکن میں فوت ہوئے ۔ رجب ۱۱۰۳ھ میں
جب ان کے والد مولانا قطب الدین [12] کو سہالی میں شہید کیا گیا تو یہ وہاں
موجود نہ تھے [13]

۸ ۔ سید محمد اشرف حسینی بلگرامی

سید محمد اشرف حسینی ترمذی بلگرامی کا تعلق سادات ترمذ سے تھا ۔
ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے ۔ والد کا اسم
گرامی سید عبدالدائم تھا ۔ اس خاندان کے پہلے بزرگ جو ترمذ سے ہندوستان
آئے ، سید احمد نخشنہ تھے ۔ یہاں آنے کے بعد وہ لاہور میں سکونت پذیر
ہوئے اور اسی شہر میں وفات پائی ۔ سید احمد نخشنہ کے اخلاف میں سے ایک

---

[12] مولانا قطب الدین کے حالات اور ان کی شہادت کی تفصیلات کے لیے
دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم حصہ اول ص ۳۲۲ تا ۳۳۵ ۔

[13] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۷ ـــ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۲ ۔

بزرگ سید محمد بن قاسم نے قنوج کا رخ کیا اور وہیں توطن اختیار کر لیا۔ جب شیر شاہ سوری نے داعی پور کے قریب شیر گڑھ آباد کیا تو بخاری سادات اور شہر قنوج کے بعض دیگر بزرگوں نے قنوج سے نقل مکانی کر کے شیر گڑھ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ سید محمد بن قاسم بھی قنوج سے اٹھ کر شیر گڑھ میں اقامت گزیں ہو گئے۔ پھر جب سوری خاندان کی حکومت ختم ہو گئی اور ہندوستان پر مغلوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا تو قنوج کے ان لوگوں نے جو شیر گڑھ میں آبسے تھے پھر قنوج کا رخ کیا، لیکن سید محمد بن قاسم نے وہیں رہنے کو ترجیح دی اور فرمایا:

ما فقیریم ہمیں صحرا مناسب حالِ ماست [۴۱]

ہم فقیر آدمی ہیں یہی جنگل ہمارے لیے موزوں جگہ ہے۔

سید محمد کی وفات شیر گڑھ ہی میں ہوئی، لیکن ان کی میت کو وہاں سے لا کر قنوج میں دفن کیا گیا۔

سید محمد کے بیٹے سید حسن تھے، جنھیں "بندگی سید حسن" کہا جاتا تھا، انھوں نے شیر گڑھ میں ایک نہایت شاندار مسجد تعمیر کی، وہ بڑے سخی اور مہمان نواز تھے۔ داعی پور میں فوت ہوئے۔

سید حسن کی اولاد میں ایک بزرگ سید فرید الدین پیدا ہوئے۔ وہ داعی پور کی سکونت ترک کر کے بلگرام میں متوطن ہو گئے تھے۔ یہی وہ سید فرید الدین ہیں جن کی اولاد میں سے سید محمد اشرف بلگرامی کا نام نامی شامل ہے۔ سید محمد اشرف بہت نیک اور بلند مرتبے کے عالم دین تھے۔ بلگرام کے علما و فضلا میں انھیں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی، وہاں کے مشہور علما میں سے سید عبدالجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ) اور استاذ المحققین میر سید

---

[۴۱] ماثر الکرام ص ۲۷۹۔

طفیل محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ) ان سے خاص تعلق رکھتے تھے اور ان کے انتہائی مداح تھے۔ نہایت نیک، فاضلِ اجل اور طریقۂ سلف صالحین کے پابند تھے۔ صوری و معنوی فضائل کے حامل اور ہر لحاظ سے اونچی شخصیت کے مالک تھے۔

سیّد محمد اشرف ۱۰۷۴ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ جوانی کی منزل میں داخل ہو چکے تھے اور شادی بھی ہو چکی تھی کہ تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں بلگرام کے متعدد اصحابِ علم مصروف درس و افادہ تھے، جن میں میر سیّد عبدالجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ) کا اسم گرامی قابل ذکر ہے، ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے مروّجہ علوم کی کئی کتابیں پڑھیں۔ پھر سیّد نوراللہ بلگرامی (متوفی ۳ شعبان ۱۱۳۱ھ) کی خدمت میں گئے۔ ان سے فقہ اور معقولات وغیرہ کی بعض کتابوں کی تحصیل فرمائی۔ پھر سید سعداللہ بلگرامی (متوفی ۱۷ شوال ۱۱۱۹ھ) کی طرف رجوع کیا، بعض کتابوں کی تکمیل ان سے کی۔ ان کے علاوہ مولانا شہاب الدین چوبے پوری سے بھی استفادہ کیا۔ مولانا ممدوح کا شمار فلسفہ و منطق کے مشہور علما میں ہوتا تھا اور قنوج کے نواح میں ایک مقام چوبے پور میں سکونت پذیر تھے، جو اس دور میں اچھا خاصا قریہ تھا اور علمی حلقوں میں بہت مشہور تھا۔

علوم متداولہ اور فنون مروجہ سے فارغ ہونے کے بعد سید محمد اشرف بلگرامی نے حکومتِ وقت سے راہ و رسم پیدا کی اور اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے محمد اعظم کے دربار میں جا کر اس کے حلقۂ ملازمین میں شامل ہو گئے اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر بڑا نام پیدا کیا۔ بعد ازاں نواب مبارز الملک سربلند خاں تونی سے تقرب پیدا کیا اور جن خدمات پر مامور ہوئے انھیں نہایت حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔ پھر نواب صفدر جنگ کی رفاقت اختیار کی، وہاں بھی جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے، ان کی تکمیل میں ہر لحاظ

سے کامیاب رہے۔ آخر میں احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ (۱۱۶۱-۱۱۶۷ھ) کی وزارت میں شامل ہو گئے اور امورِ مفوضہ کی انجام دہی میں بڑی محنت اور سرگرمی کا ثبوت دیا۔ جب کبرسنی کو پہنچ گئے تو اپنے وطنِ مالوف بلگرام واپس آ گئے۔

سید محمد اشرف بلگرامی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ بہت بڑے عالم اور متقی بزرگ تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ ملوک و امرا کی مصاحبت میں گزرا اور حکومت کے بلند مناصب پر فائز رہے۔ شب و روز کی عبادت کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ سفر و حضر میں نمازِ تہجد ہمیشہ پابندی سے ادا کرتے رہے۔ تلاوتِ قرآن انتہائی جذب و شوق اور عجز و انکساری سے کرتے۔ تفسیر، حدیث اور تصوف کا مطالعہ ان کا خاص موضوع تھا، وقت کا بڑا حصہ اسی میں صرف کرتے۔ نماز باجماعت کے پابند تھے۔ خط نہایت عمدہ تھا۔ فقہ کی مشہور درسی کتاب شرح وقایہ پر حاشیہ سپردِ قلم کیا اور بہترین خط میں شروع سے آخر تک اپنے قلم سے لکھا۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی ان کے حالات کے چشم دید گواہ ہیں۔ انھوں نے ان کا تذکرہ بڑے عمدہ انداز میں کیا ہے اور اختصار کے ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں کا بہترین اسلوب میں نقشہ کھینچا ہے۔ وہ ان کے آخری دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

از کبرسن و ضعفِ قویٰ طاقتِ قیام نمانده بود، بزورِ عصا یا اعانت دیگرے برمی خاست۔ روز عیدین سوار شده در مسجد جامع، محلہ میدان پوره می آمد و با حاضران ملاقات می کرد و می گفت، ہر چند نماز عیدین بہ عذر شرعی از من ساقط است، اما دریں روز کہ بہ تصدیع تمام حاضر مسجد می شوم، نیت آنست کہ نماز جماعت میسّر شود و ملاقات با احباب دست دہد

خدا داند سال آئندہ در می یابم یا نے [۱۵]

یعنی بڑھاپے اور شدید جسمانی کمزوری کی وجہ سے جب کھڑا ہوتے کی بھی طاقت باقی نہ رہی تھی، لاٹھی کے سہارے یا کسی دوسرے شخص کی مدد سے کھڑے ہوتے تھے، عیدین کی نماز کے لیے محلہ میدان پورہ کی جامع مسجد میں آتے اور لوگوں سے ملاقات کرتے اور کہتے کہ اگرچہ عذرِ شرعی کی بنا پر نمازِ عید میں حاضری مجھ سے ساقط ہے، تاہم اس دن بے حد تکلیف کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوتا ہوں۔ نیّت فقط یہ ہے کہ نماز باجماعت میسّر آجائے، اور دوستوں کی ملاقات کا موقع مل جائے۔ خدا جانے آئندہ سال یہ سعادت حاصل کر سکوں یا نہ کر سکوں۔

برِصغیر کے اس جلیل القدر عالم اور فقیہ نے ۹ صفر ۱۱۶۵ھ میں اکیانوے [۹۱] سال عمر پاکر داعی اجل کو لبیک کہا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان اشعار سے تاریخ وفات نکالی:

میر اشرف سر آمد فضلا • بر و تشریف سوئے منزلِ قدس
ہاتفے گفت سالِ رحلتِ او • اشرفِ واردانِ محفلِ قدس [۱۶]
۱۱۶۵ھ

۹۔ شیخ محمد اشرف کشمیری

شیخ محمد اشرف بن محمد طیّب کشمیری، ارضِ کشمیر کی منتو برادری سے تعلق رکھتے تھے اور دیارِ کشمیر کے نامور فقہا میں سے تھے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ قاضی حیدر کشمیری (متوفی ۱۱۲۱ھ) کے پوتے تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور

---

[۱۵] مآثر الکرام، ص ۲۸۰۔

[۱۶] حالات کے لیئے دیکھیے مآثر الکرام ص ۲۷۸ تا ۲۸۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۴، ۲۷۵۔

وہاں کے اکابر علما سے اخذ علم کیا۔ پھر شیخ محمد محسن فانی کشمیری (متوفی ۱۱۱۹ھ) سے منسلک ہو گئے اور ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔

جودت طبع، دقت ذہن، استقامت مزاج اور علم و فضل میں یگانہ تھے۔ بحث و اشتغال میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ افتا و تدریس میں مرتبہ بلند پر فائز تھے۔ قرآن مجید پر گہری نظر تھی۔ رد شیعیت میں بہت تیز تھے۔ قرآن مجید کے بعض اہم مقامات کی وضاحت، علم قرأت، اور شیعہ کی مخالفت میں کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ بعض اور مسائل کے بارے میں بھی کتابیں لکھیں۔ ان کی تصنیفات میں جواہر الحکم مشہور کتاب ہے۔ مجادلہ اور بلاغت کلام میں اپنے اقران سے ممتاز تھے۔

شیخ محمد اشرف منٹو کشمیری نے ۱۱۲۳ھ میں وفات پائی۔[۱۷۵]

۱۰۔ مولانا محمد اعلیٰ تھانوی

برصغیر کی مردم آفریں سرزمین کے ان فحول علما اور اکابر فضلا میں جنھوں نے بارھویں صدی ہجری کا زمانہ پایا، مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کا اسم گرامی علم و تحقیق کی رو سے ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ افسوس ہے، اس جلیل القدر عالم کے تفصیلی حالات تذکرہ و تاریخ کی کتابوں نے محفوظ نہیں کیے، جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کے والد کا نام علی، دادا کا محمد حامد اور پر دادا کا نام محمد صابر تھا۔ نسباً فاروقی اور مسلکاً حنفی تھے۔ یوپی کے مشہور مقام تھانہ بھون میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کا شمار اپنے دور کے اکابر فضلا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد شیخ علی ایک

---

[۱۷۵] تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۶ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۹ — حدائق الحنفیہ ص ۴۳۴، ۴۳۵ — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۵۔

جلیل القدر عالم تھے۔ جدِّ امجد کا علمی مقام بھی مسلّم تھا۔ اس لحاظ سے کہنا چاہیے کہ شیخ محمد اعلیٰ نے علم و فضل کی گود میں پرورش پائی۔ علم نحو اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل والد مکرم سے کی۔ علم فقہ کی متداول کتابیں بھی انہی سے پڑھیں بعض دیگر علمائے عصر سے بھی اخذِ علم کیا لیکن نہایت افسوس ہے ان اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی کو اس دَور کی کتب رجال نے اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنی تمام توجہ مطالعۂ کتب میں مبذول کر دی اور تیزی کے ساتھ ذخائرِ علمی کو سمیٹنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تحقیق کے دروازے کھول دیے اور مروجہ علوم کی علمی و فنی اصطلاحات میں ماہر کامل کے درجے پر فائز ہو گئے۔

۱۱۵۸ھ میں ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام "کشاف اصطلاحات الفنون" ہے۔ اس کتاب نے ان کو ہمیشہ کے لیے زندگی و تابندگی بخش دی ہے۔ اپنے موضوع کی یہ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ لائق مصنف نے اس میں تمام مروّجہ عقلی اور نقلی علوم کی اصطلاحات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ کون سی اصطلاح کہاں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً کلام، اصول، فقہ، صرف، نحو، منطق و حکمت، طب، ہندسہ، ریاضی وغیرہ علوم کی اصطلاحات کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مستشرقین نے بھی اس سے اعتنا کیا اور مشہور مستشرق اسپرنگر اور ولیم ناسولیس نے اس کی طباعت کو ضروری قرار دیا۔ چنانچہ انھوں نے محمد وجیہ مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ، عبدالحق اور غلام قادر ایسے جیّد اور نامور علما سے اس کی تصحیح کرائی اور پھر ۱۸۶۲ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے بڑے اہتمام کے

ساتھ اسے شائع کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۳ء) میں ڈاکٹر لطفی عبدالبدیع، ڈاکٹر عبدالنعیم اور استاذ امین الخولی کی تحقیق و تصحیح اور حواشی وغیرہ کے ساتھ یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی۔

قیاس کہتا ہے کہ شیخ محمد اعلیٰ تھانوی نے اورنگ زیب عالم گیر کا عہد پایا ہوگا، اور اس عصر کے علما سے ان کی صحبتیں بھی رہی ہوں گی، کیونکہ اورنگ زیب نے ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی اور شیخ محمد اعلیٰ نے ۱۱۵۸ھ میں اپنی کتاب مکمل کی لیکن اورنگ زیب سے ان کی ملاقات وغیرہ کا ذکر کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ سید عبدالحی حسنی نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں کہ ان کو مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ) نے بتایا کہ شیخ محمد اعلیٰ عہد عالم گیری میں تھانہ بھون کے عہدۂ قضا پر مامور تھے[۱۸]۔

بہر حال اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے اور نہ تاریخِ ولادت و وفات کا علم ہو سکا ہے۔

۱۱۔ میر محمد افضل دہلوی

میر محمد افضل دہلوی ثم الہ آبادی، ایک فاضل بزرگ تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تحصیل علوم کی، یہاں تک کہ اکثر علوم میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ حدیث، فقہ، کلام اور دیگر علوم میں ماہر تھے۔ زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔ نہایت قانع اور مستغنی المزاج تھے۔ شعر بھی کہتے تھے، ان کا ایک دیوان بھی ہے جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ شعر انہی کا ہے:

دیدیم بسے تو جلوۂ باغ و بہار حیف
گل خندہ زد بہ بیکسیٔ ما ہزار حیف

میر محمد افضل دہلوی نے ۱۲ ربیع الاول ۱۱۵۰ھ یا ۱۱۵۱ ہجری میں

---

[۱۸] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۷۸۔ مقدمہ کشاف اصطلاحات الفنون مطبوعہ مصر۔

داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۱۹]

۱۲۔ قاضی محمد اکرم سندھی

قاضی محمد اکرم نصرپوری سندھی، اپنے زمانے کے عالم کبیر اور محدث فقیہ تھے۔ ان کے والد قاضی عبدالرحمٰن تھے، جو جید عالم اور ممتاز فاضل تھے اور شاہ جہان کے عہد سے لے کر اورنگ زیب عالم گیر کی تمام مدتِ حکومت میں حرمین شریفین کے نذرانوں کے متولی رہے تھے ـــــ اس خدمت کے بدلے میں انھیں ایک بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ قاضی محمد اکرم ان کے فرزند کبیر تھے، جو اپنے وقت کے فاضل اور نامور عالم تھے۔ حدیث، فقہ اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اصول حدیث پر بالخصوص گہری نظر تھی۔ اس موضوع پر ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ اس کتاب کا نام "امعان النظر فی توضیح نخبۃ الفکر" ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب تھی، جو نخبۃ الفکر کی مفصل شرح تھی۔ نزہۃ الخواطر کے فاضل مصنف علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب شیخ عبدالحی بن عبدالحلیم انصاری لکھنوی کے کتب خانے میں دیکھی ہے۔

قاضی محمد اکرم کے ایک بیٹے "میاں مدنی" کے نام سے معروف تھے۔ انھیں میاں مدنی اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ بڑے نیک اور متقی عالم تھے۔[۲۰]

۱۳۔ قاضی محمد اکرم دہلوی

قاضی محمد اکرم دہلوی، عالم کبیر، شیخ وقت اور کبار فقہائے حنفیہ میں سے

---

[۱۹] ریاض الشعرا از علی قلی خاں داغستانی، نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۸۰۔

[۲۰] تحفۃ الکرام ص ۵۳۹، ۵۴۰ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۲۔

تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں دارالحکومت دہلی میں مفتیِ عساکر تھے اور یہ عہدہ آباواجداد سے ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔ طویل مدت تک اس منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کے علم وفضل سے متاثر ہوکر عالم گیر نے ۱۰۹۴ھ میں ان کو اورنگ آباد کا قاضی مقرر کردیا تھا۔ ۱۰۹۵ھ میں عالم گیر نے قاضیِ اکبر کی مسند پر قاضی عبداللہ بن محمد شریف گجراتی کو متمکن کردیا تھا جو بعد کو صدارت کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۱۰۹ھ میں مرضِ فالج سے ان کا انتقال ہوا تو قاضیِ اکبر کے منصب پر قاضی محمد اکرم دہلوی کو مامور کیا گیا۔ پھر عمر بھر یہ اس منصب پر فائز رہے۔ فقہ کے بے مثال عالم اور بہترین عادات واطوار کے حامل تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے دو سال قبل ۱۱۱۶ھ میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ بادشاہ ان کے فضل وکمال اور علم ودیانت سے بہت متاثر تھا۔ ان کی وفات کا اسے شدید افسوس تھا اور وہ ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ "مرحوم" کا لفظ استعمال کرتا تھا۔[۱۲۵]

۱۴۱۔ مفتی محمد امان گوپاموی

مفتی محمد امان بن ابوسعید بن علیم اللہ بن عبیداللہ شہابی صدیقی گوپاموی کا شمار فقہائے عصر اور علمائے اعلام میں ہوتا تھا۔ گوپامئو میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی مفتی ابوسعید گوپاموی (متوفی ۱۱۵۱ھ) سے جو نامور عالم، معروف فقیہ اور مفتیِ وقت تھے، تحصیل علم کی۔ دیگر علمائے کرام کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا، یہاں تک کہ والد کی وفات کے بعد منصب افتا پر متعین ہوئے۔ ہمیشہ درس وافادہ میں مصروف رہتے۔ ۱۱۹۵ھ میں اس جہانِ

۱۲۵؎ مآثر عالم گیری ص ۳۶۹ (اردو) ۔۔۔ نزہۃ الخواطر جلد ۶، صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳۔

فانی سے رخصت ہوئے [۲۲]

۱۵۔ قاضی محمد امیر فاروقی گوپاموی

قاضی محمد امیر بن قاضی محمد مبارک فاروقی گوپاموی ہندوستان کے صوبہ یو پی کے قصبہ گوپامئو میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ علوم مروجہ کی تحصیل اپنے والدِ مکرم قاضی مبارک گوپاموی (متوفی ۵ شوال ۱۱۶۲ھ) سے کی اور فقہ و اصول اور دیگر علوم متداولہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ بارھویں صدی ہجری کے برِ وہ ہندی عالم و فقیہ تھے جو زیورِ علم سے آراستہ اور فضل و صلاح سے بہرہ مند تھے۔ اپنے والدِ محترم کی طرح اخلاق فاضلہ کے حامل اور بہترین اوصاف سے متصف تھے۔ گوپامئو کے منصب قضا پر متعین تھے اور ساتھ ہی تدریس و تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات اور تصنیفات کا علم نہیں ہو سکا [۲۳]

۱۶۔ مولانا محمد امین کشمیری

خطۂ کشمیر کے جلیل القدر علما میں سے مولانا محمد امین کانی بلدیمری کشمیری بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ ارضِ کشمیر کے نامور علما سے جن میں مولانا ابوالقاسم کشمیری اور ان کے والد مولانا جمال الدین کشمیری شامل ہیں علم حاصل کیا اور وہاں کے علمائے مدققین اور فقہائے محققین میں سے گردانے گئے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ان کا اصل مشغلہ تھا انھوں نے اکثر کتب متداولہ مثلاً شرح تہذیب وغیرہ پر شروح و حواشی لکھے

---

[۲۲] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۸۳

[۲۳] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۴ بحوالہ تذکرۃ الانساب۔

اور علم فرائض سے متعلق نظم و نثر میں مفصل رسائل تصنیف کیے متعدد علمائے کشمیر مثلاً مولانا عنایت اللہ شال اور ملا محمد محسن وغیرہ نے ان سے علم حاصل کیا۔ توکل و قناعت کی دولت سے مالا مال تھے۔ ہر وقت تدریس اور علمی مباحث میں مشغول رہتے۔

مولانا محمد امین کشمیری کو عمر کے آخری دور میں ایک دردناک حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ ان کی دو بیٹیاں تھیں، عمرِ بلوغت کو پہنچیں تو ان کی شادی کی تیاری شروع کی اور جہیز وغیرہ بنانے کی غرض سے ہندوستان گئے جب دہلی پہنچے تو دونوں لڑکیوں نے جو اپنے وطن کشمیر ہی میں تھیں، غلطی سے دوا کے بجائے زہر کھا لیا اور جاں بحق ہوگئیں۔ مولانا کو خواب میں معلوم ہوا کہ آپ کی مہم انجام کو پہنچ گئی ہے، اب آپ واپس کشمیر جا کر درس و تدریس اور اشاعتِ علوم میں مشغول ہو جائیے۔ چنانچہ آپ کشمیر آگئے اور درس و افادۂ طلبا میں مشغول ہو گئے۔

مولانا محمد امین بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے کئی خاص علمی مضامین کو اشعار کے قالب میں ڈھالا۔ بڑے حاضر جواب اور شگفتہ مزاج تھے۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ کشمیر کا ایک قاضی جس کا نام قاضی عبدالکریم تھا، ہندوستان کے سفر پر گیا۔ گھوم پھر کر خاصی مدت کے بعد واپس آیا تو مولانا اس کی ملاقات کو گئے۔ وہ مولانا کو جانتا تھا، مگر چوں کہ خاصی مدت کشمیر سے باہر رہا تھا، اس لیے آپ کو پہچان نہ سکا۔ نام پوچھنے کے بعد پہچانا تو بہت معذرت کی اور کہا کہ ملاقات طویل عرصے کے بعد ہوئی ہے اس لیے افسوس ہے جلدی سے پہچاننے میں دقت پیش آئی۔

مولانا نے قاضی کو طنز کرتے ہوئے فوراً جواب دیا۔ بے شک آپ معذور ہیں۔ عربی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ: اِذَا جَاءَ الْقَضَاءُ عَمِیَ الْبَصَر۔ (یعنی قاضی بننے کے بعد انسان آنکھوں سے اندھا ہو جاتا ہے)

مولانا محمد امین کانی کشمیری، ماہ رمضان المبارک لیلۃ القدر ۱۱۰۹ھ میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے [۲۴]

۱۷۔ سیّد محمد باقر بلگرامی

سیّد محمد باقر حسینی واسطی بلگرامی، سید محمد صغریٰ (متوفی ۴ شعبان ۷۴۵ھ) کی اولاد سے تھے۔ والد کا اسم گرامی سید داور بخش تھا۔ اپنے عصر کے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ سیّد فرید الدین بلگرامی (متوفی تقریباً ۱۱۲۰ھ) اور سیّد نور اللہ بلگرامی (متوفی ۱۳ شعبان ۱۱۱۳ھ) سے علوم متداولہ کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں سید عبد الجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ) سے منسلک ہو گئے۔ ان سے خوب استفادہ کیا اور تمام علوم سے بہرہ ور ہوئے۔ عربی ادب اور حسنِ خط میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ عمر بھر درس و تدریس میں سرگرم رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔۔۔ ۱۱۳۱ھ میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں اس دنیائے ناپائیدار سے رختِ سفر باندھا اور بلگرام میں مدفون ہوئے۔ [۲۵]

۱۸۔ شیخ محمد باقر سندھی

شیخ محمد باقر سندھی، اخوند عبد الواسع کے بیٹے اور دیارِ سندھ کے

---

[۲۴] تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۹۱، ۱۹۲۔۔۔ روضۃ الابرار، ص ۔۔۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۲، ۱۸۳ ۔۔۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

[۲۵] مآثر الکرام ص ۲۳۶، ۲۳۷ ۔۔۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۹۔

مشہور بزرگ شیخ حمزہ واعظ کی اولاد سے تھے۔ فقہ کے جید عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ گوشہ گیر قسم کے صاحبِ علم تھے اور شہرت وناموری کو بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ علمِ فقہ میں اس قدر دسترس حاصل تھی کہ اس میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ حافظہ بے حد قوی پایا تھا اور ذہانت میں سب سے تیز تھے۔ چھوٹے بڑے ان کی تکریم میں پیش پیش رہتے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ کم وبیش اسّی برس کی عمر میں انتقال فرمایا[۲۶]۔

۱۹۔ مولانا محمد جمیل جون پوری

بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی علما اور نامور فقہا میں سے ایک بزرگ مولانا محمد جمیل صدیقی بروتوی جون پوری تھے۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی مفتی عبدالجلیل اور جدّ امجد کا نام نامی مفتی شمس الدین تھا۔ مفتی عبدالجلیل صدیقی جون پوری اپنے وقت کے وہ شیخ و عالم اور فقیہ و زاہد تھے، جنھوں نے تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور ۸ شوال ۱۰۷۶ھ کو جون پور میں وفات پائی۔ جدّ امجد مفتی شمس الدین صدیقی جون پوری بھی عالمِ کبیر اور فاضلِ نبیل تھے۔ جون پور کی مسندِ افتا پر فائز تھے اور درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ۱۰۴۷ھ کو جون پور میں فوت ہوئے اور اپنے مدرسے ہی میں دفن کیے گئے۔ ان کے آبا و اجداد کا شمار بھی مشاہیر علمائے عصر میں ہوتا تھا۔

مولانا محمد جمیل صدیقی جون پوری، ماہِ ذی قعدہ ۱۰۵۵ھ کو جون پور میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی فضا میں پرورش پائی۔ ان کی ولادت کے

---

[۲۶] تحفۃ الکرام ص ۶۹۹-۶۱۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۹

زمانے میں خود ان کے گھر میں علم کی شمع فروزاں تھی اور اس عہد کے جون پور کو صحابِ کمال اور اربابِ فضیلت کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس سے خوب استفادہ کیا اور متعدد فضلا سے تحصیل علم کی۔ شرح وقایہ اور مختصر معانی تک درسی کتابیں صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ) سے پڑھیں اور باقی علوم متداولہ کی تکمیل شیخ نورالدین جعفر بن عزیز اللہ جون پوری سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس سنبھالی اور درس و افادہ کا غلغلہ بلند کیا۔

مولانا محمد جمیل صدیقی جون پوری کا شمار بارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے رفیع المنزلت فقہا میں ہوتا تھا اور وہ ایک ذی مرتبت خاندان کے لائق فرزند تھے۔ ذہن نہایت رسا پایا تھا، قوتِ ادراک انتہائی تیز تھی، ملکۂ فراست میں بہ درجۂ غایت شہرت رکھتے تھے، جودتِ طبع میں ان کا کوئی حریف نہ تھا، بڑے پاکیزہ فکر عالم اور کئی بہترین کتابوں کے مصنف تھے۔ معانی و بیان کی معروف درسی کتاب "مطول" اور علم نحو کی شرح جامی کے مبحثِ عطف پر حواشی تحریر کیے۔ علاوہ ازیں علمِ فقہ پہ ایک رسالہ لکھا اور تصوف کے بارے میں "تنبیہاتِ جمیلی" کے نام سے ایک کتاب سپردِ قلم کی۔ یہ فقہائے برصغیر کی اس خوش بخت جماعت میں شامل تھے جنھوں نے "فتاویٰ عالم گیری" کی تدوین کا عظیم اور یادگار فقہی کارنامہ انجام دیا۔

مولانا محمد جمیل جون پوری کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ گنج ارشدی کے مؤلف شیخ غلام رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۵ صفر ۱۱۶۷ھ) بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل رہے۔ انھوں نے ان سے یہ کتابیں پڑھیں۔ مختصر المعانی اور مطول مع حاشیہ ۵۲۷۔ علامہ سعدالدین تفتازانی کی شرح

---

۵۲۷ سید شریف سے علی بن محمد بن علی جرجانی، متوفی ۶ ربیع الثانی ۸۱۶ھ مراد ہیں۔

العقائد مع حاشیہ خیالی، شرح المطالع مع حاشیہ سید، حسامی، نورالانوار کے کچھ اجزا، شرح وقایہ، ہدایۃ الفقہ، شیخ محمود جون پوری کا رسالہ الجبر والاختیار اور شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کی مشہور تصنیف رشیدیہ۔

مزار کی روایت کے مطابق شیخ نظام الدین اورنگ آبادی (متوفی ۲ ذیقعدہ ۱۱۴۲ھ) شیخ نورالہدیٰ امیٹھوی (متوفی ۱۳ رجب ۱۱۳۳ھ) سید حسن رسول نما (متوفی ۲۲ شعبان ۱۱۰۳ھ) اور بہت سے حضرات نے ان سے علم حاصل کیا۔ علاوہ ازیں مولانا نورالدین جعفر گنت پوری جون پوری (متوفی ۱۱۲۰ھ) کا نام بھی تذکرہ نویسوں نے ان کے تلامذہ میں لکھا ہے، انھیں مولانا نورالدین جعفر غازی پوری بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ گنت پور اعمال غازی پور میں واقع تھا۔

مولانا محمد جمیل نہایت ذہین اور انتہائی جودتِ طبع کے مالک تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں وہ مولانا نورالدین جون پوری کے حلقۂ درس میں شریک تھے اور اصولِ فقہ کی مشہور کتاب "نورالانوار" پڑھ رہے تھے، کتاب ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ استاد نے دہلی کا قصد کیا اور لائق شاگرد نے سلسلۂ درس کے منقطع ہونے پر اظہارِ افسوس کیا تو استاد نے فرمایا اب تمھیں مزید درس کی ضرورت نہیں رہی، مطالعہ کافی ہے۔

ان کی ذہانت و فطانت کا ایک اور واقعہ بڑا ہی تعجب خیز ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ علم معانی و بدیع کی کتاب "مطول" کی ایک دقیق عبارت کا مطالعہ کر کے اپنے نامور استاد مولانا نورالدین کی خدمت میں گئے اور دورانِ درس اس عبارت کا پوری وضاحت سے مطلب بیان کیا۔ استاد نے بڑی توجہ سے سنا اور شاگرد کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا، اس عبارت کا مطلب میں نے آج تمھاری تشریح سے سمجھا۔

لائق شاگرد کی بے پناہ فطانت و ذہانت کی وجہ سے ان کے اساتذہ

خوش ہو کر انھیں مُلّا جلال اور مُلّا شریف کہا کرتے تھے۔

مولانا محمد جمیل جون پوری جب دہلی گئے اور مختلف اہل علم سے ملے اور ان سے بعض علمی مباحث پر گفتگو ہوئی تو وہ حیران رہ گئے اور تمام علمائے دہلی پر ان کی علمی ہیبت طاری ہو گئی۔ اس ضمن میں مشاہیر جون پور کے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں:

آں چناں جودتِ ذہن بود کہ اگر یک بار متن کسے کتاب بدید حاجتِ حاشیہ نہ افتد۔ ہر مطالبِ دقیق کہ پیش آید فوراً بہ قوتِ ذہن حل گردد، بارہا استادش فرمودے کہ مُلّا جمیل را مماثل علامہ میر شریف و مُلّا جلال گفتن بے جا نیست۔ وقتیکہ ملا جمیل واردِ دہلی شدہ شہرۂ فضیلتش چناں شائع گردید و ہیبتش طاری شد کہ بہر درس کہ رسیدے درس موقوف گشتے۔ روزے در مدرسۂ ملا لطف اللہ دہلوی رفت، در یک سطر ہفت یا ہشت شبہات پیش نمود۔ ملا لطف اللہ از جوابش عاجز آمدند[۲۸]۔

یعنی قوت ذہن اس قدر تیز تھی کہ ایک مرتبہ کسی کتاب کا متن دیکھ لیتے تو حاشیے کی طرف مراجعت کی ضرورت نہ رہتی۔ جو بھی دقیق اور پیچیدہ مباحث سامنے آتے فوراً قوتِ ذہانت سے ان کی گرہیں کھل جاتیں۔ ان کے استاد اکثر فرماتے کہ مُلّا جمیل کو علامہ میر شریف[۲۹] اور مُلّا

---

[۲۸] مشاہیرِ جون پور، ص ۸۸۔

[۲۹] علامہ میر سید شریف جرجانی کا نام علی بن محمد بن علی تھا۔ ۲۲ شعبان ۷۴۰ھ کو جرجان میں پیدا ہوئے۔ بہت بڑے عالم و فاضل اور جلیل القدر بزرگ تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، ہیئت اور دیگر علوم پر کامل عبور رکھتے تھے۔ متعدد کتابوں کے شرح اور حواشی لکھے۔ ان کی کئی تصانیف عربی علوم

جلال[۳۰] کے مماثل قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ملا جمیل جب دہلی گئے تو ان کی فضیلت علمی کا شہرہ اس قدر پھیلا اور وہاں کے علما پر اتنا رعب طاری ہوا کہ جس حلقۂ درس میں چلے جاتے سلسلۂ درس موقوف ہو جاتا۔ ایک روز ملا لطف اللہ[۳۱] دہلوی کے درس میں گئے تو (زیر درس کتاب کی) ایک سطر میں سات یا آٹھ شبہات وارد کیے اور ملا لطف اللہ ان کا جواب دینے سے عاجز آگئے۔

بہر حال مولانا محمد جمیل بہت بڑے عالم تھے اور درس و تدریس ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ جون پور کے محلہ مفتی میں ایک وسیع اور پختہ خانقاہ اور ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جس میں خود درس دیتے اور لوگوں کی باطنی اصلاح کرتے تھے۔ لیکن اب یہ گہوارۂ علم اور مرکزِ روحانیت دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گیا ہے۔ "مشاہیر جون پور" کے مصنف دردناک الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں:

چوں زمانہ دگرگوں شد، اکنوں آثارے ہم باقی نہ ماند، جز ایں کہ بر ایں

کے مدارس میں باقاعدہ پڑھائی جاتی ہیں۔ ۶ ربیع الثانی ۸۱۶ کو شیراز میں فوت ہوئے۔

[۳۰] اس سے ملا جلال الدین دوانی مراد ہیں، جو ۸۳۰ھ (۱۴۲۶ء) میں صوبہ شیراز کے ضلع گازرون میں "دوان" نام کی ایک چھوٹی سی بستی میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل کے اس مرتبۂ بلند کو پہنچے کہ "محقق دوانی" کہلائے۔ علوم و فنون کی کئی کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ ان کی بعض تصنیفات درسِ نظامیہ میں داخل ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ وغیرہ تمام علوم متداولہ کے ماہر تھے۔ ۹ ربیع الثانی ۹۰۸ھ (۱۲ اکتوبر ۱۵۰۲ء) کو مرض اسہال سے انتقال کیا اور اپنے گاؤں دوان میں سپردِ خاک کیے گئے۔

[۳۱] ملا لطف اللہ دہلوی مہندس تھے اور ریاضی و ہندسے کے بہت بڑے عالم اور مشہور فاضل تھے۔ حساب کے موضوع سے متعلق نظم میں ایک کتاب بھی لکھی اور ۱۱۳۰ھ میں علامہ عاملی کی خلاصۃ الحساب کی شرح سپردِ قلم کی۔ فنون ریاضیہ پر تین رسالے تصنیف کیے۔ ۱۱۰۵ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔

زمین کہ پیش دروازہ شاہ طفیل حسین است، کشت کاری می شود وچشم بصیرت مشاہدہ ناہنجاری دنیا می کند[۳۲]

زمانہ انقلاب کی اس قدر تیز لہروں کی زد میں آگیا ہے اور رنگ دہر اس طرح بدل گیا ہے کہ اب اس (مدرسہ اور خانقاہ) کے کوئی آثار باقی نہیں رہے ہوئے اس لیے کہ دروازہ شاہ طفیل حسین کے سامنے کی زمین پر کاشت کاری ہوتی ہے، اور چشم بصیرت اس دنیائے ناہنجار کی عبرت ناکیوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔

مولانا محمد جمیل جون پوری جہاں ایک رفیع القدر عالم دین اور بہترین مدرس تھے وہاں ایک نامور صوفی اور صاحب طریقت بزرگ بھی تھے اور لوگوں کے قلب و باطن کی اصلاح کرتے تھے۔ دیوان عبدالرشید سے باقاعدہ بیعت تھے۔ اس کا ذکر صاحب مشاہیر جون پور ان الفاظ میں کرتے ہیں:

علاوہ فضائل صوری صاحب کمالات باطنی ہم بود و بیعت و ارادت از دیوان عبدالرشید آوردہ[۳۳]

فضائل علم و فضل کے علاوہ باطنی کمالات سے بھی مالا مال تھے اور دیوان عبدالرشید کے حلقہ بیعت و ارادت میں شامل تھے۔

مولانا محمد جمیل نے بے شک بہترین علمی خدمات انجام دیں، لیکن فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب میں ان کی شمولیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے لیے خود بادشاہ وقت اورنگ زیب عالمگیر نے ان کو منتخب کیا۔

چنانچہ مشاہیر جون پور کے مصنف لکھتے ہیں:

وقتیکہ عالمگیر بادشاہ دہلی جہت نمود فتاویٰ منسوب باسم خود، فضلائے نامورانِ دیارِ ہند طلبید، از جون پور ملا جمیل برچیدہ الیشاں را بخود خواستہ

---

[۳۲] مشاہیر جون پور، ص ۸۹

[۳۳] ایضاً، ص ۸۸

شریک مجمع اجتماع نمود[۳۴]

جب بادشاہِ دہلی اورنگ زیب نے ایک ایسا فتاویٰ مرتب کرنے کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی جو اس کے نام سے منسوب ہو تو اس نے دیارِ ہند کے نامور فضلا کو طلب کیا۔ اس کے لیے جون پور سے مُلّا جمیل کو منتخب کیا اور ان سے ذاتی طور پر اس (مرتبین فتاویٰ کی) جماعت میں شریک ہونے کی درخواست کی۔

اس ہمہ اوصاف موصوف عالم و فقیہ نے ۶ رجب ۱۱۲۳ھ میں ۶۸ سال کی عمر پاکر جون پور میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور مفتی محمد صادق کے قبرستان میں اپنے والدِ گرامی مُلّا عبدالجلیل صدیقی جون پوری کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

تاریخ مشاہیرِ جون پور میں ان کے پسماندگان میں تین بیٹوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو غلام معین الدین عرف شاہ امیر علی، شاہ طفیل حسین اور شاہ یتیم الحسن کے ناموں سے موسوم ہیں[۳۵]۔

۲۰۔ قاضی محمد حافظ بلگرامی

قاضی محمد حافظ بن محمد فضیل بن محمد یوسف عثمانی حنفی بلگرامی، بلگرام کے قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ قاضی محمد سلیم عثمانی بلگرامی (متوفی ۲۸ محرم ۱۱۱۴ھ) کے بھتیجے تھے۔ قاضی محمد سلیم بلگرام کے منصب قضا پر متعین تھے، لیکن انھوں نے یہ منصب

---

[۳۴] مشاہیر جون پور، ص ۸۸۔

[۳۵] مولانا محمد جمیل صدیقی جون پوری کے حالات کے لیے یہ کتابیں بھی ملاحظہ ہوں: نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۴، ۲۹۵۔ تاریخ شیرازِ ہند جون پور ص ۴۱۷، ۴۲۷۔ نیز دیکھیے برِصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۲۸۲ تا ۲۸۶۔

ترک کر کے اپنے بھتیجے قاضی محمد حافظ عثمانی کو اس پر فائز کر دیا تھا۔

قاضی محمد حافظ عثمانی نے عمر کے ابتدائی دور میں قرآن مجید حفظ کیا، بعد میں جوانی کی منزل میں داخل ہوئے تو کسب علم کی طرف عنانِ توجہ ملتفت کی۔ اس کے لیے عازم مانک پور ہوئے اور ملا محمود سے مختصرات کی تحصیل کی۔ پھر جائس کا قصد کیا اور معقول و منقول کی کتابیں شیخ غلام مصطفیٰ بن محمد اشرفی جائسی سے پڑھیں۔ بعد ازاں بلگرام واپس آئے اور اپنے چچا قاضی محمد سلیم عثمانی بلگرامی کی جگہ قاضی مقرر کیے گئے۔

قاضی محمد حافظ بلگرامی اپنے دور کے شیخ، عالم اور جلیل القدر فقیہ تھے۔ معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ شگفتہ مزاج، عمدہ خصال، بلند اخلاق اور پیکر جود و سخا تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ پورے بلگرام میں انتہائی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے سب ان کی تعظیم بجا لانے اور سلام کرنے میں سبقت کرتے۔ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق میں مہارت رکھتے تھے۔ فرائضِ قضا انجام دینے میں کمال درجے کے دیانت دار تھے۔

قاضی محمد حافظ عثمانی بلگرامی نے ۲۲ محرم ۱۱۲۳ھ کو موہان میں وفات پائی جو اعمالِ لکھنؤ میں ایک مشہور شہر ہے۔ وہاں سے ان کی میت بلگرام لائی گئی اور ۲۷ محرم ۱۱۲۳ھ کو بلگرام میں دفن کیے گئے۔[۳۶]

۲۱۔ مولانا محمد حسین شافعی گجراتی

مولانا محمد حسین بن محمد علی بن ناخدا حمزہ گجراتی، جید عالم اور اپنے دور کے

---

[۳۶] مآثر الکرام ص ۱۱۹ تا ۱۲۱۔ تقصار جیود الاحرار، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔

نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۵، ۲۹۶۔

عظیم فقیہ تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ خط بہت عمدہ تھا۔ سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے مولانا محمد حسین گجراتی کے ہاتھ کی نہایت شاندار خط میں لکھی ہوئی کتاب "المنہاج" دیکھی ہے جو امام نووی کی تصنیف ہے اور علم فقہ میں ہے۔ اس کی کتابت سے وہ ۲۰ جمادی الاخریٰ ۱۱۵۸ھ کو فارغ ہوئے۔ اس وقت وہ مدرسہ نواب محمد غیاث خاں شہر "خجستہ بنیاد" میں مقیم تھے۔ یہ محمد شاہ غازی کے اٹھائیسویں سال جلوس کا واقعہ ہے[۳۷]

۲۲- سید محمد حکم بریلوی

سید محمد حکم بن سید محمد بن سید علم اللہ حسنی بریلوی، حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اسلاف میں سے تھے۔ صوبہ یو پی کے شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد گرامی سید محمد بریلوی (متوفی ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۵۶ھ) سے جو ایک عارف باللہ بزرگ تھے، فیض حاصل کیا اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ پھر مختلف مقامات کے متعدد بلند مرتبہ علماء و مشائخ سے استفادہ و استفاضہ کیا، جن میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں:

شیخ سعدی بخاری جو اپنے وقت کے اکابر رجال میں سے تھے، شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ) جو شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے اور حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور اپنے عصر کے ممتاز عالم اور محدث تھے۔ شیخ عبدالنبی الشیام چوراسی نقشبندی جو بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر اور مشہور صوفی تھے، شیخ محمد مجتبیٰ۔

---

[۳۷] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۹۔

تکمیل علم کے بعد اپنے وطن رائے بریلی واپس آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ علامۂ وقت اور وسیع المطالعہ بزرگ تھے، فقہ اور دیگر علوم میں عبور رکھتے تھے، کئی عمدہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں:

تفسیر حسنی: یہ قرآن مجید کی فارسی زبان میں تفسیر ہے۔

محکم التنزیل: یہ عربی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر ہے۔

تلخیص الصراح: یہ لغت کی کتاب ہے۔

ملخص البلاغۃ: یہ علم معانی سے متعلق ہے۔

فقہ، میراث اور حساب کے موضوع پر رسائل

لآلی النحو: یہ علم نحو سے متعلق ایک رسالہ ہے جو اپنے بھائی سید محمد عدل بریلوی کے لیے تصنیف کیا۔

وفات

سید محمد حکم بریلوی نے ۲۲ شوال ۱۱۵۰ھ کو صرف بیالیس[۴۲] برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔[۳۸]

۲۳۔ شیخ محمد حیات سندھی

برصغیر میں ارضِ سندھ کو ہمیشہ یہ فخر حاصل رہا ہے کہ اس میں بے شمار نامور علما اور جید فقہا پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف ملکوں اور علاقوں میں علم کی روشنی پھیلائی اور لاتعداد لوگوں کو معارفِ دینیہ اور علوم اسلامیہ سے روشناس کرایا۔ ان اولو العزم اور خوش بخت حضرات کی وسیع فہرست میں علامہ شیخ محمد حیات سندھی کا اسم گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔

۳۸ے نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔ بحوالہ اعلام الہدیٰ۔

شیخ ممدوح بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر، محدث جلیل اور فقیہ ذی مرتبت تھے۔ علم و فضل کے میدان میں انھوں نے عالم گیر شہرت پائی اور حدیث و فقہ کی تدریس و اشاعت میں بلند درجے پر فائز ہوئے۔

والد کا اسم گرامی

شیخ محمد حیات سندھی کے والد کے اسم گرامی کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ علامہ المرادی اور مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کا نام ابراہیم لکھا ہے[۳۹]۔ لیکن شیخ کے شاگرد میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے "فلاریہ" تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

روزے از اصل و نسب شیخ استفسار کردم، بہ خط شریف بر قطعہ کاغذے نوشتہ داد، والد الفقیر محمد حیات السندی المدنی اسمہ ملا فلاریہ...[۴۰]

یعنی ایک روز میں نے شیخ کے وطن اور نسب کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر تحریر فرما کر مجھے بھیجا کہ اس فقیر محمد حیات سندھی مدنی کے والد کا نام مُلا فلاریہ ہے...

حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ محمد حیات سندھی مدنی کے حالات اپنی تین مشہور کتابوں میں رقم فرمائے ہیں، ان کا ماخذ مآثر الکرام ہے، لہٰذا انھوں نے بھی ان کے والد کا نام ملا فلاریہ رقم فرمایا ہے[۴۱]۔ ممکن ہے والدین نے ان کا نام فلاریہ رکھا ہو، اور ابراہیم انھوں نے بعد میں خود رکھ لیا ہو۔

---

[۳۹] سلک الدرر، ج ۴، ص ۳۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۱

[۴۰] مآثر الکرام، ص ۱۴۴

[۴۱] ملاحظہ ہو۔ (۱) اتحاف النبلا، ص ۴۰۳، ۴۰۴۔ (۲) ابجد العلوم ص ۸۹۴، (۳) تقصار جیود الاحرار، ص ۲۲۴

مولد و مسکن اور ابتدائی حالات

مولانا محمد حیات سندھی، موضع عادل پور میں پیدا ہوئے، جو سرزمین سندھ کے علاقہ بھکر کے اطراف میں ایک گاؤں تھا۔ اس وقت یہ گاؤں ضلع سکھر تعلقہ گھوٹکی سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر بہ جانب جنوب واقع ہے اور اس نواح کی ایک پرانی آبادی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس گاؤں میں دینی مدرسہ بھی قائم تھا۔ اس کے آثار اب بھی وہاں موجود ہیں[۴۲]۔

شیخ ممدوح سندھ کے "چاچڑ" قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ عادل پور کے اطراف و جوانب میں "چاچڑ" قبیلے کے لوگوں کی بستیاں اب بھی موجود ہیں۔ حضرت شیخ کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی حالات کا پتا نہیں چلتا، اور کسی تذکرہ نگار نے اس سلسلے میں کوئی معلومات بہم نہیں پہنچائے۔ بہت سے عظیم آدمیوں کے ابتدائی کوائف بعض دفعہ پردۂ خفا میں رہتے ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ کون شخص آگے چل کر آسمانِ علم و فضل کا کس قدر درخشندہ ستارہ بننے والا ہے اور کتنی کثیر تعداد میں اصحابِ فضل و کمال اس سے کسبِ ضیا اور اخذِ فیض کریں گے۔ شیخ محمد حیات سندھی کا اسم گرامی بھی انھی بلند مرتبت حضرات کی فہرست میں شامل ہے، جن کے حصول علم کی ابتدائی سرگرمیوں کا راز نہیں کھلتا اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شروع شروع میں انھوں نے کن کن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، کس کس بزرگ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں، اور عالمِ طفولیت کی منزلیں کہاں طے کیں؟ صرف اتنا سُراغ ملتا ہے کہ سنِ شعور کو پہنچے تو سندھ کے مردم خیز شہر ٹھٹھہ میں چلے گئے اور وہاں مولانا محمد معین سندھی (متوفی ۱۱۶۱ھ) کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔

---

۴۲ ماہنامہ ترجمان الحدیث (لاہور) بابت فروری ۱۹۷۰ء، ص ۲۳۔ از مولانا ارشاد الحق اثری

مولانا محمد معین سندھی اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور نامور فاضل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد اور "دراسات اللبیب" کے مصنفِ شہیر تھے۔

ٹھٹھہ اس زمانے میں علما و فضلا کا مرکز تھا اور وہاں مختلف اہلِ علم کے حلقہ ہائے درس جاری تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی نے جو اپنے عہد کے مشہور شائقِ علم تھے، مولانا محمد معین سندھی کے علاوہ وہاں کے بعض دیگر حضراتِ علما سے بھی اخذِ علم کیا ہوگا، مگر تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

اس کے بعد شیخ سندھی نے ارضِ حجاز کا رُخ کیا۔ سب سے پہلے حج بیت اللہ سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں شیخ عبداللہ بن سالم بصری مکی (متوفی ۱۱۳۴ھ) شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی (متوفی ۱۱۴۵ھ) اور شیخ حسن بن علی العجیمی وغیرہ اربابِ فضل سے مستفید ہوئے اور سند و اجازہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں ان کے ہم وطن اور کشورِ سندھ کے ایک جیّد عالم شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی مدنی (متوفی ۱۱۳۸ھ) کی مسندِ درس آراستہ تھی، محمد حیات ان کی خدمت میں گئے اور حدیث کا زیادہ تر درس ان ہی سے لیا۔ انہی کے فیضِ صحبت سے علمِ حدیث اور اس کے متعلقات میں تبحّر حاصل کیا۔ شیخ ابوالحسن موصوف یوں تو تمام علومِ مروجہ میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، لیکن حدیث نبوی میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے اور اس میں نہایت شہرت کے مالک تھے۔

مدینہ منورہ میں سکونت اور استاد کی جانشینی

شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد میر سیّد غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ) نے استاذ کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ممدوح آغاز جوانی ہی میں حجاز تشریف لے گئے تھے

اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی تھی:

شیخ محمد حیات قدس سرہٗ در عنفوانِ شباب توفیقِ زیارت حرمین شریفین یافت و در مدینہ منوّرہ توطن و تاہل گزید و کمر بہ تحصیل علم بربست، و باوجود فقدانِ وجہِ معاش استقامت را کار فرسود و نزد علمائے حرمین معظمین سیما شیخ ابوالحسن سندی نزیل مدینہ منورہ نور اللہ مضجعہ کسب کمالات نمود۔[۴۳]

شیخ محمد حیات قدس سرہٗ کو اوائلِ شباب ہی میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوگیا تھا۔ انھوں نے مدینہ شریف میں سکونت اختیار کرلی تھی، وہیں شادی کرلی تھی اور حصولِ علم کے لیے کمر بستہ ہوگئے تھے۔ معاش کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باوجود، نہایت استقامت و استقلال سے رہے اور علمائے حجاز بالخصوص شیخ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ مقیم مدینہ منورہ سے کسب کمال کیا۔

تحصیل علم کے بعد مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور استاذِ محترم شیخ ابوالحسن سندھی کی وفات کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے اور ان کی مسند تدریس کو رونق بخشی۔ پھر پورے چوبیس ۲۴ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا درس دیا اور تمام زندگی اسی بابرکت علم کی خدمت میں گزار دی۔

وجلس مجلسہ بعد وفاتہ اربعا وعشرین سنۃ[۴۴]

شیخ ابوالحسن سندھی کی مسندِ درس پر چوبیس سال متمکن رہے۔

علمی رفعت اور تذکرہ نگاروں کا اظہارِ عقیدت

تمام تذکرہ نگار شیخ محمد حیات سندھی کی علمی رفعت، فقہی عظمت، ورع و تقویٰ اور فراوانیِ علم و فضل کا کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں اور

---

۴۳ ماثر الکرام، ص ۱۴۵

۴۴ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۱

ان کی دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور بصیرتِ علمی کو مانتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اتحاف النبلا میں علامہ محمد فاخر زائر الہ آبادی کی ایک فارسی نظم درج کی ہے جو انھوں نے شیخ محمد حیات سندھی کی تعریف میں کہی۔ جی چاہتا ہے، وہ نظم یہاں بھی نقل کر دی جائے، تاکہ شیخ کے اوصاف گوناگوں کا اندازہ ہو سکے۔

علامہ محمد فاخر زائر الہ آبادی کو شیخ محمد حیات سندھی کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ وہ قابلِ احترام استاد کے بارے میں کہتے ہیں :

باد بر رُوئے صفحۂ دوراں — محفل آرائے حلقۂ انساں
شیخ الاسلام عصر علامہ — در فنونِ حدیث فہامہ
مُوشگافِ دقائقِ ایماں — راز دانِ حقائقِ ایماں
رُستہ از حبسِ ربقۂ تقلید — بستہ بر اجتہاد رائے مزید
درس فرمائے مسجدِ نبوی — بطریقِ رشیق مصطفوی
آں محمد حیات بخت بلند — بحدیث نبی قوی پیوند
متع اللہ زمرۃ الاعیان — بافادا تہ الی الازمان
سرِ من خاکپائی او بادا — جانِ من در رضائی او بادا[۴۵]

شیخ سندھی موصوف کے ایک اور تلمیذِ رشید میر سید غلام علی آزاد بلگرامی اپنی مشہور فارسی تصنیف مآثر الکرام میں استاذِ مکرم کا تذکرہ ان پر عظمت الفاظ سے شروع کرتے ہیں :

از علمائے ربانیین و عظمائے محدثین است[۴۶]

شیخ محمد حیات سندھی کا شمار علمائے ربانی اور عظیم القدر محدثین کی جماعت میں

---

۴۵ اتحاف النبلا ص ۴۰۴۔
۴۶ مآثر الکرام ص ۱۴۴۔

ہوتا ہے۔

اپنی ایک عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں آزاد بلگرامی ان کے بارے میں رقم فرماتے ہیں:

ھو من العلماء الربانیین وعظماء المحدثین، قرن العلم بالعمل وزان الحسن بالحلل[۴۷]

وہ عالم ربانی اور عظیم الشان محدث تھے، ان کا علم ہم آہنگِ عمل تھا۔

آزاد مزید لکھتے ہیں:

وشد حزامہ علی درس الحدیث المحمدی وافنی عمرہ فی خدمۃ الکلام الاحمدی، وکان یعظ الناس قبل صلاۃ الصبح بالمسجد المعلی ویقتحم علیہ جم غفیر من اھل السعادۃ فی ذلک الوقت المصفی وانتفع بہ خلق کثیر من العرب والعجم وارتوی بمنھلہ عطاش ھیم من اصحاب الھمم واقبل علیہ قطان الحرمین ومصر والشام والروم والھند بالاعتقاد والانقیاد یلتمسون من برکاتہ ویستمدونہ من فیوضاتہ وفتح اللہ علیہ بمواھب سنیۃ حتّٰی عاش فی عیشۃ مرضیۃ[۴۸]

(شیخ محمد حیات سندھی) درس حدیث کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور ارشادات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عمر صرف کر دی۔ نماز فجر سے پہلے مسجد نبوی میں وعظ فرماتے اور اس بہترین وقت میں سعادت مند لوگ ایک ہجوم کی شکل میں ان کے ارشادات سننے کے لیے آتے اور عرب و عجم کے باشندے وسیع تعداد میں ان سے مستفید ہوتے۔ اس طرح ان کے چشمۂ صافی سے تشنگانِ

---

[۴۷] سبحۃ المرجان ص ۹۵

[۴۸] ایضاً ص ۹۵، ۹۶

فیض کی ایک بڑی جماعت سیراب ہوئی اور بلند ہمت، حضرات نے ان سے استفادہ کیا ——— مکہ، مدینہ، مصر، شام، روم اور ہندوستان کے مختلف گوشوں سے نہایت عقیدت و نیاز مندی کے جذبات کے ساتھ لوگ ان کی خدمت میں آتے، ان کی برکاتِ علوم سے متمتع ہوتے اور فیوضِ گوناگوں سے اپنا دامنِ طلب بھرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جلیل القدر عالمِ دین پر اپنے انعاماتِ بوقلموں کے دروازے کھول دیے اور اس عظیم شخصیت نے رضائے الٰہی کے سائے میں زندگی بسر کی۔

میر شیر علی قانع (متوفی ۱۲۰۳ھ) نے تحفۃ الکرام میں شیخ محمد حیات سندھی کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے:

مخدوم محمد حیات سندھی ... کا مدینہ منورہ میں ایک مدرسہ تھا اور اُس سرزمین میں وہ مقتدر عالم اور ممتاز فاضل شمار ہوتے تھے۔[۴۹]

نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیفات میں خاصی تفصیل سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "تقصار جیود الاحرار" کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

شیخ محمد حیات سندی محدث، مجتہد مدنی از علمائے ربانیین و عظمائے محدثین است۔[۵۰]

یعنی شیخ محمد حیات سندھی محدث، مجتہد مدنی کا اسم گرامی علمائے ربانی اور عظیم اصحاب حدیث کی فہرست میں شامل ہے۔

شیخ عبدالقادر کوکبانی، جن کو عرصۂ دراز تک شیخ محمد حیات سندھی کی مجالسِ علمی اور حلقۂ درس میں بیٹھنے کا شرف حاصل رہا، لکھتے ہیں:

---

۴۹ تحفۃ الکرام، ص ۱۲۷

۵۰ تقصار جیود الاحرار، ص ۲۲۴

میں ایک طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہا، لیکن کبھی نہیں دیکھا کہ
ضوں نے کوئی مباح بات بھی منہ سے نکالی ہو[۵۱]۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ شیخ عام گفتگو میں کتنے محتاط تھے، جو بات زبان
ے نکالتے، اسے پہلے احتیاط کی ترازو میں اچھی طرح تول لیتے۔ واقعہ
یہ ہے کہ اصحاب حدیث اور علمائے ربانی کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔ وہ امور
مباح سے بھی دامن کشاں رہتے ہیں، نہ زبان کو غیر شرعی بات سے ملوث کرتے
ہیں، نہ نوکِ قلم کو۔!

مولوی رحمان علی تذکرہ علمائے ہند میں ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے
ہوئے لکھتے ہیں:

شیخ محمد حیات سندھی از علمائے ربانیین و عظمائے محدثین عالم باعمل
بود، نام پدرش ملا فلاریہ از قبیلہ چاچر ساکن اطراف عادل پور محروسہ
ملک سندھ، شیخ محمد حیات از وطنِ خود بحرمین شریفین در عنفوانِ شباب رفتہ
مناسک بیت حرام دریافت و بہ مدینہ طیبہ رختِ اقامت انداخت، و سوائے
توکل اسبابِ معیشت ذخیرہ نہ ساخت و ہماں حالت موجودہ بہ تحصیل علوم
پرداخت و بازشاگردی مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ سکینہ برداشت و علم
علوم درسیہ بمیامن او برافراخت، و اجازت حدیث از مولانا عبداللہ بن
سالم بصری یافت و تمام سرمایۂ عمرِ خود بہ درس حدیث نبوی درباخت[۵۲]۔

شیخ محمد حیات سندھی باعمل عالمِ دین تھے، ان کا شمار علمائے ربانی اور عظیم القدر
محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کے والد کا نام ملا فلاریہ تھا۔ چاچر قبیلے سے تعلق

---

[۵۱] ماہ نامہ "الرحیم" (حیدر آباد سندھ) بابت جولائی ۱۹۶۳ء "سرزمینِ
سندھ میں علمِ حدیث" از مخدوم امیر احمد

[۵۲] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۶

رکھتے تھے۔ حج کی غرض سے عین عالمِ جوانی میں اپنے وطن سے حرمین شریفین گئے، مناسکِ حج ادا کیے اور پھر مدینہ منورہ میں اقامت گزین ہو گئے۔ توکل علی اللہ کے سوا کوئی ذریعۂ معیشت اور نہ ذخیرۂ مال نہ رکھتے تھے۔ اسی حالتِ غربت میں تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ منورہ کی شاگردی اختیار کی اور علوم درسیہ ان سے پڑھے۔ اجازۂ حدیث مولانا عبداللہ بن سالم بصری سے لیا، پھر خود درسِ حدیث کی مسند آراستہ کی اور تمام عمر اس خدمت میں بسر کر دی۔

علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی ان کے حالات کا آغاز بڑے پُر احترام الفاظ سے کرتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

الشیخ الامام الکبیر المحدث محمد حیات بن ابراہیم السندی المدنی، احد العلماء المشہورین۔[۵۳]

شیخ، امام، عالم کبیر، محدث محمد حیات بن ابراہیم سندھی مدنی، شہرۂ آفاق علما میں سے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی معروف تصنیف "تذکرہ" میں شیخ محمد حیات سندھی کا نام نامی بارھویں صدی ہجری کے ان اکابر و مشاہیر علما و فضلا کی فہرست میں درج فرمایا ہے، جو "بلادِ عربیہ و عثمانیہ" میں خدمات دینیہ انجام دے رہے تھے لکھتے ہیں:

اکثر مشاہیر علم و ارشاد، جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی النجدی سید عبدالقادر کوکبانی، شیخ عمر فاسی تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسماعیل یمانی، سید عبدالخالق زبیدی، علامی خانی صاحب ایقاظ، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم کہ شاہ راہِ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقتِ مستورہ کے

۵۳ھ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۱

شناسا و حق آگاہ تھے۔[۵۴]

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم اپنی تصنیف "رودِ کوثر" میں شیخ محمد حیات سندھی کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

جو علما تکمیلِ تعلیم کے بعد حجاز میں مقیم ہو گئے تھے، ان میں سندھ کے کئی فاضل تھے، جن میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی سب سے ممتاز تھے۔ وہ عادل پور (سندھ) کے قریب پیدا ہوئے۔ عنفوانِ شباب ہی میں حج کے لیے گئے اور حج کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ، اور مولانا عبداللہ سالم بصری سے تکمیلِ تعلیم کی اور اپنے آپ کو درسِ حدیث کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے سب سے نامور محدثوں میں ہوتا تھا۔ آپ مسجد نبوی میں صبح کی نماز سے قبل وعظ کہتے اور ایک جمِ غفیر آپ کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتا۔[۵۵]

تصنیفات

شیخ محمد حیات سندھی جہاں بہت بڑے استاذِ حدیث تھے، وہاں متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے نامور محدث، جلیل القدر فقیہ، عظیم محقق اور عالی دماغ عالم تھے۔ ذیل میں ان کی تصنیفات کا تعارف کرایا جاتا ہے:

۱۔ الایقاف علیٰ سبب الاختلاف: یہ ایک رسالہ ہے جو "تقلید اور عمل بالحدیث" کے اہم موضوع پر مشتمل ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے بصراحت کی ہے کہ صحابہ کرام، تابعینِ عظام، ائمہ مجتہدین اور ان

---

[۵۴] تذکرہ، ص ۳۹۷

[۵۵] رودِ کوثر، ص ۶۱۵

کے تلامذہ عالی مقام کے درمیان فقہی نوعیت کے اختلافات کیوں کر ابھرے، ان اختلافات کی اصل حقیقت کیا ہے اور کن وجوہ و اسباب کی بنا پر بعض مسائل میں وہ مختلف الرائے ہوئے، نیز اس رسالے میں انھوں نے صحابہ کرام کے طریقِ استدلال، اسلوب استنباط اور تخریج مسائل کی بھی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ ہمیشہ کتاب وسنت ہی کو مدارِ عمل ٹھہراتے تھے۔ اگر انھیں اپنے قول وعمل کے خلاف کوئی حدیث پہنچ جاتی تو اسی وقت اس سے رجوع فرما لیتے۔

یہ رسالہ اپنے موضوع میں نہایت عمدہ علمی مباحث کو محیط ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی تقلید کے قائل نہ تھے، بلکہ براہِ راست کتاب وسنت کو بنیادِ عمل قرار دیتے تھے اور اس کی روشنی میں اجتہاد کو صحیح سمجھتے تھے۔

اس مفید رسالے کی طباعت کی طرف سب سے پہلے برصغیر کے مشہور عالم ومحقق حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم (ولادت ۱۷ محرم ۱۲۵۶ھ وفات ۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ/ ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء) نے عنانِ توجہ منعطف کی۔ اس کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور ضروری حواشی لکھے۔ پھر اپنے ماہ نامہ ''اشاعت السنۃ'' کی جلد اوّل (بابت ماہ رجب ۱۲۹۸ھ۔ جنوری ۱۸۸۱ء ضمیمہ نمبر ۴ ص ۲۴ تا ۴۳) میں شائع کیا۔

اس کے بعد یہی ترجمہ زبان کی کچھ اصلاح اور صحتِ الفاظ کے ساتھ پاکستان کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیفؒ کی سعی و کوشش سے ۱۳۷۹ھ (۱۹۵۹ء) میں مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے طبع ہوا۔ مکتبہ سلفیہ کی اشاعت میں یہ خوبی ہے کہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیفؒ صاحب نے ابتدا میں شیخ محمد حیات سندھی اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے مختصر مگر ضروری حالات بھی تحریر فرما دیے ہیں جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

تیسری مرتبہ یہ رسالہ ہندوستان کے ایک فاضل حضرت مولانا عبدالجلیل سامرودی مرحوم کی سعیِ جمیلہ سے دہلی میں شائع ہوا۔ اس پر سِن طباعت مرقوم نہیں۔

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے "رفع الملام عن ائمۃ الاعلام" کے نام سے ایک رسالہ سپردِ قلم کیا تھا، جس میں امام نے تفصیل اور جامعیت سے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ ان کے تلمیذِ رشید امام ابنِ قیمؒ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی مشہور تصنیف "اعلام الموقعین" میں اس اہم موضوع کی عمدہ انداز سے وضاحت کی ہے۔ شیخ محمد حیات سندھی نے "الایقاف علیٰ سبب الاختلاف" میں ان دونوں بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔

شیخ محمد حیات سندھی کے ہم عصر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ نہایت عمدگی سے اس کے متعلقہ پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" کے المبحث السابع میں بھی اس پر مدلل اور مبرہن بحث فرمائی ہے۔ اہلِ علم کے لیے اس موضوع سے متعلق ان تمام کتابوں اور بحثوں کا مطالعہ دلچسپی اور اضافۂ معلومات کا باعث ہوگا۔

۲۔ تحفۃ الانام فی العمل بحدیث النبی علیہ الصلوٰۃ و السلام: حدیث و سنت کو مدارِ عمل ٹھہرانے کے موضوع سے متعلق یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اختصار کے باوجود اس میں نہایت بنیادی باتیں معرضِ بیان میں آگئی ہیں۔ اس کی عمدگی کا ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ علامہ صالح فلانی کی معروف کتاب "ایقاظ ھمم اولی الابصار"

کے بہت سے مندرجات اسی کتاب سے ماخوذ ہیں حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ" میں اس رسالے سے بڑا استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح صاحبِ سبل السلام علامہ امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی کی تصنیف "ارشاد النقاد الی تیسیر الاجتہاد" کے بہت سے مشمولات اسی رسالے سے مقتبس ہیں۔ یہ رسالہ اس درجہ اہمیت کا حامل ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی کے شاگردِ رشید حضرت مرزا مظہر جان جاناں (متوفی ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ) نے اپنے ایک فارسی مکتوب میں اس کی تلخیص کر دی ہے۔[۵۶]

تحفۃ الانام میں شیخ محمد حیات سندھی نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہر حال میں ضروری ہے۔ آنحضرت کے علاوہ کسی کی اتباع کرنا اور اس کے قول وعمل کو صحیح قرار دینا گمراہی اور جہالت کی دلیل ہے۔ پھر اس میں اس اہم مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ بعض لوگ کسی ایک خاص امام کی تقلید کرتے ہیں اور اسی کے قول کو صحیح سمجھتے ہیں جو ان کے امام سے منقول ہو۔ وہ اپنے امام کے مقابلے میں بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ مبارکہ کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، قول صحابہ کو بھی ترک کر دیتے ہیں اور ربانی ائمہ دین کے اقوال وارشادات کی بھی پروا نہیں کرتے۔ شیخ محمد حیات سندھی نے اس قسم کے حضرات کی شدید مخالفت کی ہے اور اس رسالے میں ان کے اس طرزِ عمل کو خلافِ شرع قرار دیا ہے۔

یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے موضوع میں نہایت واضح ہے۔ مکتبہ محمدیہ بمبئی میں یہ رسالہ موجود ہے۔ بمبئی کے ایک عالم دین حضرت مولانا

---

۵۶ ملاحظہ ہو کلمات طیبات ص ۲۸ تا ۳۰۔ نیز دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم حصہ اوّل ص ۱۳۰ تا ۱۴۱۔

عبدالجلیل سامرودی مرحوم کی کوشش سے چند سال قبل مکتبہ سلفیہ دہلی سے یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔ سن طباعت مرقوم نہیں۔

۳- فتح الغفور فی وضع الایدی فی الصلوٰۃ علی الصدور: نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں؟ فقہائے کرام اس مسئلے میں مختلف آرا رکھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام سفیان ثوری رحمہم اللہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ لیکن امام شافعی (علی قول المشہور) اور امام مالک سینے کے نیچے اور ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام احمد سے ایک تیسرا قول یہ بھی منقول ہے کہ ناف کے نیچے یا اوپر سینے کے نیچے جہاں چاہے باندھ سکتا ہے۔ امام شافعی سے ایک قول سینے پر ہاتھ باندھنے کا بھی منقول ہے۔ مولانا محمد حیات سندھی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کے حق میں ہیں، اور ان کا یہ رسالہ اسی کی تائید میں ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے دعوے کو احادیث و آثار سے بادلیل ثابت کیا ہے۔ اور "تحت السرۃ" (ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے) والی حدیث کے بارے میں کھل کر بحث کی ہے بحث ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وبما تقدم ان الوضع الایدی علی الصدور فی الصلوٰۃ اصلا اصیلا ودلیلا جلیلا فلا ینبغی لاھل الایمان الاستنکاف عنہ ۵۷

یعنی گزشتہ بحث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا بنیادی اور صحیح ترین دلائل سے ثابت ہے، پس اہل ایمان کو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔

---

۵۷ فتح الغفور، ص ۸

رسالہ فتح الغفور سب سے پہلے بہت عرصہ پیشتر مع ترجمے کے طبع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا عبد التواب ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش سے ۱۳۶۱ھ میں ملتان سے شائع ہوا۔ لیکن اب نایاب ہے۔

۴۔ تحفۃ المحبین فی شرح الاربعین النوویہ: یہ اربعین نووی کی شرح ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور (ہندوستان) کے کتب خانے میں موجود ہے[۵۸]۔

مولانا ارشاد الحق اثری (ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد) ایک مضمون "علامہ محمد حیات سندھی" میں تحریر کرتے ہیں کہ سید محب اللہ شاہ پیر آف جھنڈا کے مکتبہ علمیہ عالیہ میں بھی شیخ محمد حیات سندھی کی اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو ۳۵ ورق پر مشتمل ہے اور شعبان ۱۳۰۲ھ کا مکتوبہ ہے[۵۹]۔

شیخ محمد حیات سندھی شیدائی سنت تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی سے انھیں بے پناہ قلبی محبت تھی۔ "تحفۃ المحبین" کا ہر مقام اس کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ آنحضرت کی حدیث:

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ[۶۰]۔

(تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اس کی خواہش ان امور کے تابع نہ ہو، جنھیں میں لایا ہوں)

کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے

---

۵۸ علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ ص ۲۸۶۔

۵۹ ماہ نامہ ترجمان الحدیث، لاہور۔ بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء ص ۳۴۔

۶۰ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، فصل ثانی

تین درجے ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ حضور کے فرامین کو اس طرح حق سمجھے کہ اس کے بغیر صحتِ ایمان ممکن نہیں، اس قسم کے لوگ کثرت سے موجود ہیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ کے ارشادات کو حق جانتے ہوئے ان کی مخالفت سے بچنے کی کوشش کرے، ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کوئی حرج اور بوجھ محسوس کیے بغیر حضور کی اطاعت کی جائے، یہاں تک کہ انسان اپنی تمام خواہشات کو آنحضرت کے ارشادات کے تابع کر دے — ان اوصاف کے حامل افراد کی تعداد بہت قلیل ہے، اور یہی وہ خوش بخت لوگ ہیں جنھیں محمدی کہنا چاہیے۔

اس کے بعد انتہائی سوزِ قلب کے ساتھ جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ لکھتے ہیں:

ھذا ھو المحمدی الذی اذا ثبت عندہ قول حبیبہ وفعلہ المحکمات انشرح بھما صدرہ واخذ بھما باعظم الرضاء و السرور واختلط ذٰلک بقلبہ وقالبہ فلو اجتمع من بین اقطار الارض علی ان یصدوہ عن قول محبوبہ وفعلہ لما ترکھما ولم یبال بخلاف کائنا من کان۔ آہ این ھؤلاء المحمدیون فی زماننا ھذا، اللھم اجعل سنۃ حبیبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم احب الینا من ارواحنا وانفسنا۔

انہی اوصافِ حمیدہ کا حامل وہ محمدی ہے کہ جب اس کے نزدیک اس کے محبوب حقیقی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا سینہ کھل جاتا ہے اور بہ درجۂ غایت رضا و رغبت اور کامل مسرت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتا اور اس کی تمام کیفیات اپنے جسم و روح پر طاری کر لیتا ہے۔ اگر ساری دنیا کے لوگ بھی اس کو اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے روکنے کے لیے جمع ہو جائیں تو بھی وہ اسے نہیں چھوڑتا اور

اس میں کسی کی مخالفت کی پروا نہیں کرتا۔ آہ! یہ محمدی گروہ ہمارے اس زمانے میں کہاں ہے؟ اے اللہ! اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ کو ہمارے لیے، ہمارے انفس و ارواح سے عزیز تر کر دے۔

یہ پورا رسالہ اسی طرح کے احوال و کوائف کو محیط ہے۔

۵۔ شرح الترغیب والترہیب للمنذری۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسماعیل پاشا نے اس کو شیخ محمد حیات سندھی کی تصانیف میں شمار کیا ہے [۱۶۱]

۶۔ مختصر الزواجر عن اقتراف الکبائر: "الزواجر" علامہ ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۳ھ) کی مشہور تصنیف ہے، جس میں کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے، تذکیر و ترہیب کے متعلق یہ بہترین کتاب ہے۔ "الزواجر" عرصہ ہوا، مصر میں طبع ہوئی تھی، لیکن اب کم یاب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں محفوظ ہے، جو ۹۸۴ھ کا مکتوبہ ہے یعنی مصنف کی وفات سے صرف گیارہ سال بعد کا۔ اس پر نامور علمائے کرام کے دستخط ثبت ہیں۔ اسی "الزواجر" کا اختصار مذکورہ بالا نام سے شیخ محمد حیات سندھی نے کیا ہے۔ شیخ ممدوح کی اس کتاب کا ذکر اسماعیل پاشا نے بھی کیا ہے [۱۶۲]

۷۔ شرح الحکم العطائیہ: "الحکم" شیخ تاج الدین ابوالفضل احمد بن محمد المعروف بہ ابن عطاء اللہ الاسکندرانی الشاذلی المالکی (متوفی ۷۰۹ھ) کی مشہور تصنیف ہے۔ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ احوال کے موضوع سے متعلق یہ بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں،

---

[۱۶۱] دیکھیے ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷

[۱۶۲] ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷

حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کی سات شرحوں کا ذکر کیا ہے [۶۳]
جن میں شیخ محمد بن ابراہیم بن عباد کی شرح "غیث المواھب العلمیہ"
اور شیخ احمد بن محمد الحسنی کی "ایقاظ الھمم" چھپ چکی ہیں۔ "شرح الحکم
العطائیہ" کے نام سے "الحکم" کی شرح شیخ محمد حیات سندھی نے لکھی ہے۔
اس شرح کا ذکر اسماعیل پاشا نے کیا ہے [۶۴]

۸۔ مقدمہ فی العقائد: خیر الدین زرکلی نے جو شیخ محمد حیات
سندھی کا "عالم بالحدیث" کے الفاظ سے تذکرہ کرتے ہیں، اپنی تصنیف
"الاعلام" میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے [۶۵]

۹۔ شرح اربعین للنووی: شرح الحکم العطائیہ کے ذیل میں شیخ
محمد حیات سندھی کی شرح اربعین نووی کا ذکر ایضاح المکنون میں اسماعیل
پاشا نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے۔ "محمد حیات السندی شارح الاربعین
النوویہ" نیز ڈاکٹر محمد اسحاق نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ
ملا علی قاری کی الاربعون حدیثا فی جوامع الکلم کی شرح ہے [۶۶]

۱۰۔ ارشاد النقاد الی تیسیر الاجتہاد: عمر رضا کحالہ نے معجم
المؤلفین میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور شیخ محمد حیات سندھی کو محدث،
فقیہ، اصولی، مفسر اور صوفی کے پر عظمت الفاظ سے یاد کیا ہے [۶۷] مگر

---

[۶۳] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۷۵، ۲۷۶

[۶۴] ایضاح المکنون ج ۱ ص ۴۱۳ ۔ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷

[۶۵] الاعلام ج ۶ ص ۳۴۴

[۶۶] ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون ج ۱ ص ۴۱۳۔ نیز ملاحظہ ہو علم حدیث میں
پاک و ہند کا حصہ ص ۲۸۲ (اردو ترجمہ "کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی اسٹڈیز آف حدیث لٹریچر" از ڈاکٹر محمد اسحاق)

[۶۷] معجم المؤلفین ج ۹ ص ۲۷۵

مولانا ارشاد الحق اثری اس کتاب کو شیخ محمد حیات سندھی کی تصنیف قرار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک عمر رضا کحالہ کا اس کتاب کو شیخ محمد حیات سندھی کی تصنیف کہنا وہم معلوم ہوتا ہے۔ یہ رسالہ درحقیقت امیر محمد بن اسماعیل یمانی کی تصنیف ہے جو الرسائل المنیریہ میں مطبوع ہے[۶۸] لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نام کی کتاب شیخ محمد حیات سندھی نے بھی لکھی ہو۔

۱۱۔ شرح الحکم الحدادیہ: ہدیۃ العارفین میں اسماعیل پاشا نے شیخ محمد حیات سندھی کی بعض تصانیف کا ذکر کیا ہے، جن میں یہ کتاب بھی شامل ہے[۶۹]

۱۲: رسالہ فی رد بدعۃ التعزیہ: اس کا ذکر نواب صدیق حسن خان نے بھی کیا ہے اور سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی[۷۰]

۱۳۔ رسالہ فی النہی عن عشق المُرد والنسوان: نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلا میں اور سید عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر میں شیخ کی اس تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ نواب صاحب کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود تھا۔ یہ اور شیخ کے بعض دیگر رسائل وہ مکہ معظمہ سے لائے تھے۔ چنانچہ اتحاف النبلا میں لکھتے ہیں: "وبعض ایں رسائل را فقیر از مکہ معظمہ آوردہ"۔ نواب صاحب نے اس کے چند اقتباسات بھی اتحاف میں درج کیے ہیں[۷۱]

لفظِ مُرد، لفظِ اَمرَد کی جمع ہے۔ لغت میں اَمرَد کی تعریف یہ ہے:

---

[۶۸] ماہ نامہ "ترجمان الحدیث" (لاہور۔ بابت مارچ ۱۹۷۹ء ص ۳۷)

[۶۹] ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷

[۷۰] اتحاف النبلا ص ۴۰۴ — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۲

[۷۱] اتحاف النبلا ص ۴۰۴

الشاب طرشاربہ ولم تنبت لحیتہ۔

یعنی وہ جوان جس کی مونچھیں پھوٹ رہی ہوں اور داڑھی نہ اُگی ہو۔

اس رسالے میں شیخ نے نو عمر لڑکوں اور غیر محرم عورتوں سے عشق و تعلق قائم کرنے کی سخت مذمت کی ہے اور تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ قطعی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔ جو صوفیا "عشق" کے نام سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کی سخت تردید کی ہے۔ یہ رسالہ ان "صوفیا" کے رد میں ہے، جنھوں نے "عشق" کی اصطلاح قائم کر کے عوام کو غلط راہ پر لگا دیا ہے۔ مندرجات اور دلائل کے اعتبار سے یہ رسالہ نہایت عمدہ ہے۔

۱۴۔ اعفاء اللحیۃ: یہ رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، داڑھی بڑھانے کے مسئلے پر ہے۔ اس کا خطی نسخہ مولانا پیر وہب اللہ راشدی کے کتب خانے میں موجود ہے[1]۔ یہ رسالہ چھوٹے سائز کے دس صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالے کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے شیخ محمد حیات سندھی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک رسالے میں پڑھا کہ داڑھی بڑھانا مستحب ہے، یہ مسئلہ سنتِ تعبدی کے ذیل میں نہیں آتا بلکہ اس کا تعلق سنتِ عادیہ سے ہے، جو شخص ایک "قبضہ" سے کم داڑھی رکھتا ہے وہ تارکِ مستحب ہے۔ چنانچہ بعض دوستوں نے رفع وہم کے لیے ان سے سوال کیا کہ اس مسئلے کے بارے میں قولِ فیصل کیا ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے یہ رسالہ تحریر کیا۔

ان الفاظ کے بعد شیخ نے احادیث و آثار کی روشنی میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ داڑھی بڑھانا سنتِ عادیہ سے ہے۔ ان کے نزدیک داڑھی بڑھانا وجوب کے درجے میں داخل ہے۔ چنانچہ اس مسئلے میں مفصل بحث کے بعد

---

[1] ترجمان الحدیث، لاہور۔ بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ ص ۳۸

وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں رسالے کے آخر میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وھذا کلہ تبین ان اصل الاعفاء واجب کما اوضحنا، فتارکہ تارك واجب، یستحق ما یستحقہ تارك الواجب، ولو تنزل عن الوجوب فلا اقل من انہ سنۃ مؤکدۃ، یستحق تارکہ ما یستحق تارك السنۃ المؤکدۃ، ولیس بمندوب ولا من سنن کما زعم صاحب الرسالۃ بل ھو امر تعبدی شرعہ اللّٰہ لانبیائہ وحثھم علیہ۔

یعنی جیسا کہ ہم نے واضح کر دیا ہے، اس بحث سے ثابت ہو گیا کہ داڑھی بڑھانا واجب ہے، اور اس کا تارک اسی سزا کا مستحق ہے، جو تارکِ وجوب کے لیے مقرر ہے، اور اگر اسے وجوب سے کم درجہ دیا جائے تو بھی بہر حال سنت مؤکدہ سے کم نہیں، اور اس کا تارک اسی سزا کا مستحق ہے جو سنتِ مؤکدہ کے تارک کے لیے مقرر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ نہ تو مستحب ہے اور نہ عادی سنت کے ذیل میں آتا ہے، جیسا کہ مصنفِ رسالہ کا خیال ہے بلکہ یہ تعبدی امر ہے، جس پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو حکم دیا ہے۔

اخلاق و عادات اور تدین و تقویٰ

شیخ محمد حیات سندھی کا شمار بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر فضلا اور رفیع المرتبت ہندی علما میں ہوتا ہے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور دیگر علومِ مروّجہ پر انھیں کامل عبور حاصل تھا اور مسائل شرعیہ میں گہری اور عمیق نظر رکھتے تھے۔ درس و تدریس میں منفرد اور وعظ و تبلیغ میں اپنی مثال آپ تھے۔ ورع و تقویٰ کے اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ زہد و عبادت میں اپنے عصر کے فقید المثال عالم تھے۔ پابندیٔ شریعت میں بے نظیر تھے۔ تنہائی پسند اور خلوت نشین تھے۔ مگر قلب کی دنیا بے حد آباد اور فکر کا جہان پُر ہجوم تھا۔ ان کے نہاں خانۂ دل میں جو عالم بس رہا تھا، اسی کی رونق میں مگن رہتے۔ گفتگو میں نہایت محتاط اور اخلاقِ حسنہ کا دل آویز پیکر تھے۔ ان کا معمول تھا کہ

ہمیشہ پہلی صف میں شریک ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے۔ فرائض تدریس باقاعدگی سے انجام دیتے اور طلبا سے بہ درجہ غایت شفقت سے پیش آتے۔ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں احکام شرع کو پیش نگاہ رکھتے اور امور دین کے سلسلے میں کسی کی پروا نہ کرتے۔ متحمل مزاج اور عمدہ خصائل کے حامل تھے۔ قول و عمل میں کتاب و سنت کے حسین سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ تبلیغ اسلام کا اس درجے اہتمام فرماتے کہ مسجد نبوی میں نماز فجر سے قبل وعظ کہتے۔ ان کی مجلس وعظ میں بے شمار لوگ شامل ہوتے اور ان کے انداز کلام اور تفہیم مسائل کے اسلوب سے بے حد متاثر ہوتے۔ اس عظیم الشان عالم دین کو یہ شرف حاصل ہے کہ اپنے استاذ گرامی شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کی وفات کے بعد ان کی مسند درس پر پورے چوبیس برس تک مدینہ منورہ میں تدریس حدیث کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں کسی کے سامنے دست طلب دراز نہیں کیا۔ ہر حال میں اللہ پر توکل رکھا۔ ان کا ذریعۂ معاش، اور وسیلۂ آمدنی صرف توکل علی اللہ تھا۔

شیخ محمد حیات سندھی اپنے بوقلموں اوصاف فکری اور گوناگوں کمالات علمی کی بنا پر تمام معاصر علما اور عرب ممالک کے اصحاب فضل میں بے حد عزت و تکریم کے مالک تھے۔ دور دراز کی مسافت طے کر کے اور دشوار گزار منزلیں عبور کر کے ارباب کمال اور طلبائے علم ان کی خدمت میں آتے اور استفادہ کرتے۔ مستفدین و مسترشدین کے لیے ہر آن ان کے دروازے کھلے رہتے۔ حجاز کی ارض مقدس میں انھیں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا اور لوگ ان کی تحقیق و کاوش کی وسعتوں سے حد درجہ متاثر تھے۔

صحت عقیدہ کا بہ درجہ غایت اہتمام

شیخ محمد حیات سندھی کے حالات میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ عقیدے کے بارے میں نہایت سخت تھے یا نرم الفاظ میں یوں کہیے کہ بہت ہی محتاط تھے۔

وہ اس بات کا بہ درجہ غایت اہتمام فرماتے کہ کوئی امر خلافِ سنت نہ ہو، جس سے عقیدے کے مجروح ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ ان کے تلمیذ رشید میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے بیان کیا ہے، جو خود انھی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ "غلام علی" وغیرہ قسم کے ناموں کو بھی خلافِ شرع قرار دیتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس قسم کی اضافت صرف اللہ کی طرف ہونی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے اس شاگرد کے نام "غلام علی" کو محلِ اعتراض ٹھہرایا۔

اس ضمن میں آزاد کو استاد نے جو خط لکھا اور پھر انھوں نے اس کی وضاحت میں جو جواب تحریر کیا، وہ خود آزاد نے اپنی دو کتابوں، مآثر الکرام (فارسی) اور سبحۃ المرجان (عربی) میں نقل کیا ہے۔ اسے انھی کے الفاظ میں پڑھنا چاہیے۔ آزاد لکھتے ہیں:

شیخ قدس سرہٗ مکتوبے نامزد فقیر نمود و اسم فقیر غلام علی بے اضافتِ غلام تحریر فرمود، از جہتِ آں کہ در حدیث شریف آمدہ کہ ہمہ کس عباد اللہ اند، اطلاقِ عبودیت نسبت بہ مخلوق نباید کرد۔ فقیر در جواب نامہ نوشت بایں مضمون کہ مسلم روایت می کند۔ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یقولن احدکم عبدی و امتی، کلکم عبید اللہ و کل نساءکم اماء اللہ، ولکن لیقل غلامی وجاریتی وفتای وفتاتی [۳۷]

و بخاری روایت می کند: لا یقل احدکم عبدی و امتی

---

[۳۷] اس حدیث کے لیے دیکھیے صحیح مسلم جلد ۲۔ کتاب الالفاظ من الادب وغیرھا باب حکم اطلاق لفظۃ العبد والامۃ والمولیٰ والسید ص ۲۳۸

ولیقل فتای وفتاتی وغلامی [۱۷۴] نیز قلمی ساختم کہ اگر واضع اسم غلام را بہ معنی عبد ارادہ کردہ باشد و دیگرے معنی فرزند ارادہ کردہ تلفظ نماید، او را می رسد کہ لکل امرءٍ مانوی۔

شیخ قدس سرہ بعد وصولِ خط دادِ انصاف داد و بعد ازیں اسم فقیر غلام علی تحریر فرمود [۱۷۵]

یعنی ایک مکتوب میں شیخ محترم نے میرا نام "غلام علی" لکھنے کے بجائے صرف "غلام" تحریر فرمایا اور لکھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ تم سب اللہ کے بندے ہو، لہٰذا عبدیت کی نسبت مخلوق کی طرف نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے جواب میں اس فقیر (غلام علی آزاد) نے لکھا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کسی کو "عبدی" (میرا بندہ) اور "امتی" (میری لونڈی) نہ کہو، کیونکہ تم سب اللہ کے بندے

---

[۱۷۴] صحیح بخاری کی یہ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں: انہ قال لا یقل احد کم اطعم ربک، وضئ ربک، اسق ربک، ولیقل سیدی ومولای و لا یقل احدکم عبدی وامتی ولیقل فتای وفتاتی وغلامی۔ (صحیح بخاری ج ۱، کتاب العتق باب کراہیۃ التطاول علی الرقیق وقولہ عبدی وامتی ص ۳۴۶)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ اپنے مالک کو کھانا کھلاؤ، اپنے مالک کو وضو کراؤ، اپنے مالک کو پانی پلاؤ۔ بلکہ سیدی ومولائی کہے۔ میرا بندہ یا میری لونڈی بھی نہ کہے۔ بلکہ فتای، فتاتی، غلامی کہے۔

[۱۷۵] مآثر الکرام ص ۱۴۵، ۱۴۶۔ یہ واقعہ آزاد نے اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں بھی بیان کیا ہے۔ دیکھیے صفحہ ۹۶

ہو اور تمھاری سب عورتیں اللہ کی لونڈیاں ہیں۔ بلکہ "غلامی وجاریتی" یا "فتائی وفتاتی" کہنا چاہیے۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کسی کو "عبدی وامتی" نہ کہے بلکہ "فتائی وفتاتی" کہے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ اگر نام رکھنے والے نے "غلام" کے معنی "عبد" کے مراد لیے ہیں تو یہ ممنوع ہے اور اگر فرزند کے معنی لیے ہیں تو اس حکم کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ہر شخص کی بات کا دارو مدار اس کی نیت پر ہے۔ شیخ کو یہ خط ملا تو میری تحسین فرمائی اور اس کے بعد ہمیشہ میرا نام غلام علی لکھتے رہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عقیدے کے بارے میں شیخ نہایت محتاط تھے اور اس کی صحت کا پورا خیال رکھتے تھے۔ لیکن کتاب وسنت کے دلائل سے اگر کوئی بات ان کے قائم کردہ خیال کے خلاف ثابت ہو جاتی تو اس سے فوراً رجوع فرما لیتے، جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، شیخ محمد حیات سندھی عقیدے کا انتہائی تحفظ کرتے تھے۔ امورِ بدعت سے نفور اور شائبہ شرک سے دامن کشاں رہتے تھے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے، اور وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات کے حلقۂ درس میں شریک تھے، انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارک پر کھڑے دعا واستغاثہ میں مشغول ہیں اور کئی قسم کی بدعات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ادھر سے شیخ محمد حیات بھی تشریف لے آئے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب انھیں دیکھ کر احترام بجا لائے، استاد کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھے اور سوال کیا کہ ان لوگوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شیخ نے جواب میں یہ آیت پڑھی:

إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ۝ (الاعراف ۹

یعنی یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں، وہ برباد ہونے والا ہے اور

جو کام یہ کرتے ہیں، سب بے سُود ہے۔

شیخ کا مسلک

نواب صدیق حسن خاں اور مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی نے شیخ محمد حیات سندھی کے فقہی مسلک کی بھی وضاحت کی ہے۔ مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی ان کے شاگرد تھے۔ استاد کی تعریف میں زائر نے جو نظم کہی، وہ گزشتہ سطور میں درج کی جا چکی ہے۔ اس میں انھوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ وہ مقلد نہ تھے۔

رُستہ از حبس ربقۂ تقلید ۔ بستہ بر اجتہاد رائے مزید

یعنی شیخ محمد حیات تقلیدِ شخصی سے آزاد تھے اور اجتہاد کے قائل تھے۔

اسی طرح نواب صدیق حسن خاں اتحاف النبلا میں لکھتے ہیں:

در وقتِ خود شیخ محمد حیات مرتبۂ اجتہاد داشت، تقلید ہیچکس نمے کرد[۷۶]

شیخ محمد حیات اپنے دور میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے، کسی کے مقلد نہ تھے۔

نواب صاحب اپنی ایک اور تصنیف تقصار میں شیخ موصوف کے حالات بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

تمام عمر در خدمتِ حدیث شریف صرف ساخت، و تبحر عظیم دریں فنِ اشرف اندوخت و بمرتبۂ اجتہاد برآمدہ، و قلادۂ تقلید از گلو فرو افگند[۷۷]

شیخ نے تمام عمر حدیث شریف کے علم کی خدمت میں صرف کر دی۔ اس پاکیزہ ترین فن میں بے حد تبحر حاصل کیا اور قلادۂ تقلید کو گلے سے اتار کر مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے۔

---

[۷۶] اتحاف النبلا ص ۴۰۴

[۷۷] تقصار جیود الاحرار ص ۲۲۴

لیکن اس صراحت کے باوجود بعض علمائے احناف نے شیخ محمد حیات کو فقہی لحاظ سے حنفی مسلک کے اعیان و اکابر میں شمار کیا ہے [۷۸] ممکن ہے ابتدا میں ان کا تعلق حنفیت سے رہا ہو، لیکن ان کی تصنیفات اس کی تائید نہیں کرتیں۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے شیخ کی تصنیف "الایقاف علیٰ سبب الاختلاف" کے شروع میں جو مقدمہ تحریر کیا ہے، اس میں وہ ان کے مسلک کے بارے میں لکھتے ہیں:

اُس دور کے عام حالات کے مطابق ابتداءً گو حنفی طریقے پر گامزن ہوں گے، لیکن محقق علمائے حدیث و فقہ کے فیضِ تربیت اور علومِ حدیث میں براہِ راست ممارست کی وجہ سے بالآخر تحقیق کی راہ پسند کر لی اور تقلید سے دست بردار ہو گئے، جیسا کہ آپ کی تصنیفات سے اندازہ ہو سکتا ہے [۷۹]

مولانا عطاء اللہ حنیف کا یہ تجزیہ بالکل قرینِ صحت ہے۔ عین ممکن ہے ابتدائی دور میں وہ فروعِ فقہ میں حنفیت کو ترجیح دیتے ہوں، کیوں کہ ان کے عہد میں برصغیر میں زیادہ تر اہلِ علم فقہی لحاظ سے اسی مسلک کے حامل تھے لیکن بعد میں وہ فکر و عمل کے اعتبار سے بالکل بدل گئے تھے۔ چنانچہ ان کی بعض تصنیفات انھی مسائل پر مشتمل ہیں جو فقہِ حنفی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً انھوں نے تقلیدِ شخصی کی مضبوط دلائل سے شدید مخالفت کی ہے اور براہِ راست کتاب و سنت کو مدارِ عمل ٹھہرانے پر زور دیا ہے۔ پھر نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے مسئلے کو بہ دلائل ثابت کیا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر مسائل پر بھی بحث کی ہے جن میں اہلِ حدیث اور احناف الگ الگ آرا کے حامل ہیں۔ ان میں شیخ محمد حیات سندھی نے اسی نقطۂ نظر کی تائید فرمائی ہے جو اہلِ حدیث کا ہے،

---

[۷۸] دیکھیے مقدمہ نصب الرایہ، ص ۴۹

[۷۹] مقدمہ بر "الایقاف علیٰ سبب الاختلاف" ص ۵

اور اسی کو احادیث صحیحہ سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں نے بھی اپنی متعدد تحریروں میں ان مسائل کا ذکر فرمایا ہے اور شیخ محمد حیات کے نقطۂ نظر کو ان کا نام لے کر اپنے بعض فارسی مکتوبات میں بیان کیا ہے۔ مرزا صاحب ممدوح نے ان تمام مسائل یعنی تقلید شخصی، براہ راست کتاب وسنت سے استنباط، نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے اور رفع سبابہ وغیرہ سے متعلق صاف الفاظ میں شیخ محمد حیات سندھی کے نقطۂ فکر کی تائید کی ہے اور ان کی بہت سی عربی عبارات کو جو ان مسائل سے متعلق ہیں، فارسی میں منتقل کر دیا ہے۔

علاوہ ازیں شیخ کے مسلک کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کی مشہور تصنیف "الایقاف علی سبب الاختلاف" کا اردو ترجمہ بھی معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے کیا اور مختلف اوقات میں ان کی تصانیف بھی اہل حدیث کے اشاعتی اداروں نے شائع کیں۔ کسی حنفی ادارے نے ان کی کوئی تصنیف شائع نہیں کی۔

تلامذہ

شیخ محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا پورے چوبیس سال مدینہ طیبہ میں غلغلۂ تدریس بلند رہا۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے رسول اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی انتہائی استقلال اور کامل اخلاص و محبت کے ساتھ اشاعت کی۔ حجاز، مصر، شام، نجد، یمن اور ہندوستان کے بے شمار حضرات نے ان سے حصول علم کا شرف حاصل کیا۔ پھر جن لوگوں کو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، خود ان کو اللہ نے فضل و کمال کے مختلف گوشوں میں بے پناہ اعزاز سے نوازا اور بے حد شہرت و ناموری عطا فرمائی۔ ان کے شاگردوں کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ معرفت و ادراک کے لحاظ سے بوقلموں اوصاف سے متصف اور فضل و کمال کے اعتبار سے

گوناگوں خصوصیات سے بہرہ مند ہیں۔

شیخ کے شاگردوں کی طویل فہرست میں چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ) مختلف اقسام علم مثلاً حدیث و فقہ، تاریخ و رجال اور ادب و شعر میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے اور تصنیف و تالیف میں بے حد شہرت کے مالک تھے۔[۹۸۰]

۲۔ شیخ محمد صادق سندھی (متوفی ۱۱۸۷ھ) جو اصولِ حدیث کے ماہر اور بہجۃ النظر شرح نخبۃ الفکر کے مصنفِ شہیر تھے۔

۳۔ شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی (متوفی ۱۱ ذوالحجہ ۱۱۶۴ھ) جو تحقیق و تدقیق میں اپنے دور کے ممتاز سلفی العقیدہ عالم، متبعِ سنت اور نامور محدث و فقیہ تھے۔ بہت اچھے شاعر اور ادیب بھی تھے۔

۴۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب جو مجاہد فی سبیل اللہ، مبلغِ دین، مصلحِ وقت اور مجددِ عصر تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں اور اپنے عصر اور علاقے میں توحید کی بے پناہ اشاعت کی۔ ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) میں پیدا اور ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۲ء) میں فوت ہوئے۔

۵۔ امیر محمد بن اسماعیل یمانی سبل السلام اور کئی کتابوں کے مصنف، مشہور شارحِ حدیث اور معروف محدث اور فقیہ تھے۔ ۱۰۷۶ھ کے لگ بھگ کحلان میں پیدا ہوئے۔ بارھویں صدی ہجری میں انھوں نے نہایت شاندار علمی خدمات انجام دیں۔

۶۔ سید حاجی فقیر اللہ علوی شکارپوری، ان کا شمار بارھویں صدی ہجری کے ارضِ سندھ کے ممتاز علما میں ہوتا ہے۔ ۱۱۰۰ھ میں درۂ خیبر

۹۸۰۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم حصہ اول از صفحہ ۲۵۸ تا ۳۰۹

کے ایک پہاڑ "روتاس" کے حدود میں پیدا ہوئے، جو پشاور سے بجانب مغرب تقریباً ۸ میل اور جمرود سے ۹ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کا طالب علمی (۱۱۳۰ھ تک) کا زمانہ موضع خرقئی (علاقہ پشاور) اور جلال آباد (افغانستان) کے نواح میں موضع "حصارک" کے مقام پر گزرا۔ اس کے بعد ۱۱۵۰ھ تک قندھار میں رہے۔ پھر آخر عمر ۱۱۶۵ھ تک شکارپور (سندھ) میں اقامت گزیں رہے۔ ہندوستان، افغانستان، حجاز اور یمن کے علما و مشائخ سے استفادہ کیا اور مختلف علوم میں ان سے سند و اجازہ کی سعادت حاصل کی۔ علم حدیث کی متعدد کتابیں شیخ محمد حیات سندھی اور شیخ محمد ہاشم ٹھٹھوی سے پڑھیں۔ عارف باللہ، عالم باعمل اور فقیہ تھے۔ تفسیر اور حدیث پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں قطب الارشاد، براہین النجاۃ، الفتوحات الغیبیہ، الازہار فی ثبوت الآثار زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی علمی رفعت کا اصل اندازہ ان کے مکتوبات سے ہوتا ہے، جو اُن کی اولاد میں سے ایک جیّد عالم سید میر علی نواز علوی کی کوشش سے لاہور میں چھپ چکے ہیں۔ یہ مجموعہ ۸۵ مکتوب کو محتوی ہے اور تفسیر، حدیث، فقہ، تصوّف اور سیاست وغیرہ کے بہترین معلومات کو دامن صفحات میں لیے ہوئے ہے۔

سیّد فقیر اللہ علوی کی ایک اہم تصنیف "وثیقۃ الابرار" ہے، جس میں انھوں نے اپنے سلاسلِ اسانید و اجازات کی پوری تفصیل درج کی ہے۔ یہ ایک قلمی کتاب ہے جو ایک مقدمہ، آٹھ فصول اور خاتمے پر محیط ہے۔ کتاب کے ابتدا میں مصنف نے مولانا محمد صادق بن دیندار حصارکی جلال آبادی، شیخ محمد حیات سندھی، شیخ محمد ہاشم ٹھٹھوی، شیخ محمد مسعود پشاوری اور اس زمانے کے مفتی مکہ شیخ عبدالقادر وغیرہ علما و محدثین کا ذکر کیا ہے۔ آگے چل کر ہر فصل میں ان تمام علوم کی تفصیل سے سند بیان کی ہے جو مصنف نے

مختلف اساتذہ سے حاصل کیے۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔

سید فقیر اللہ علوی عربی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۱۶۵ھ میں شکارپور (سندھ) میں فوت ہوئے اور وہیں محلہ ہزاری میں دفن کیے گئے۔[۱۵۸]

۷۔ شیخ ابوالحسن ٹھٹھوی سندھی صغیر۔ یہ ۱۱۳۵ھ کو ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں حجاز چلے گئے اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں وہاں شیخ محمد حیات سندھی کا حلقۂ درس جاری تھا، اس میں داخل ہو گئے اور خوب استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ علمِ حدیث کے شیخ ہوئے اور اجتہاد کے مرتبے کو پہنچے۔ حنفی المسلک تھے لیکن مذہبی تعصب سے بالکل پاک۔ اگر کوئی حق بات اپنے امام کے مذہب کے خلاف دیکھتے تو مذہب امام کو چھوڑ کر حق پر عمل پیرا ہوتے۔ شاگردوں کو بھی یہی ہدایت فرماتے کہ اگر کسی مسئلے میں فقہی روایات کو حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پائیں تو فقہی روایات پر حدیث نبوی کو ہر حال میں ترجیح دی جائے۔

شیخ ابوالحسن نے نخبۃ الفکر کی شرح لکھی۔ انھوں نے ابن اثیر کی جامع الاصول کی شرح بھی لکھنی شروع کی تھی، لیکن صرف ایک ہی جلد کی شرح لکھ سکے۔

---

[۱۵۸] تفصیل کے لیے دیکھیے ماہ نامہ "الحق" (اکوڑہ خٹک) بابت جنوری ۱۹۷۸ء، "ایک نادر مخطوطہ۔ وثیقۃ الابرار۔ حضرت شیخ فقیر اللہ شکارپوری کا سلسلۂ اسانید" از ڈاکٹر سید سعید اللہ، استاد شعبۂ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی ــــ نیز دیکھیے ماہ نامہ "الرحیم"، (حیدرآباد سندھ) بابت اگست ۱۹۶۳ء ــ "سرزمینِ سندھ میں علم حدیث"، از مخدوم امیر احمد۔

شیخ ممدوح نہایت خوش خط تھے۔ ان کا معمول تھا کہ صحیح بخاری کی انتہائی احتیاط سے اعراب ڈال کر کتابت کرتے۔ جب کتابت مکمل ہو جاتی تو اہلِ ذوق بڑے شوق سے ایک سو ریال میں اسے خرید لیتے۔ ان کے ہاتھ کا صحیح بخاری کا مکتوبہ نسخہ امام یمن کے کتب خانے میں موجود ہے[۸۲]

شیخ ابوالحسن سندھی صغیر نے ۱۱۸۷ھ میں مدینہ منورہ میں رحلت کی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

شیخ محمد حیات سندھی مدنی کے ان جلیل القدر تلامذہ کرام کے علاوہ شیخ احمد بن عبدالرحمٰن سندھی، شیخ محمد سعید صفر، شیخ عبدالقادر خلیل کدک، شیخ عبدالقادر بن احمد، شیخ احمد، شیخ عبدالکریم بن عبدالرحیم داغستانی، شیخ علی بن ابراہیم علبسی، شیخ عبدالکریم بن احمد الشراباتی، شیخ علی بن عبدالرحمٰن الاسلامبولی، شیخ علی بن محمد الزہری، مفتی محمد بن عبداللہ مدنی، شیخ علیم اللہ بن عبدالرشید لاہوری المدفون بہ دمشق، شیخ خیرالدین بن محمد زاہد سورتی اور علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے تحصیلِ علم کی۔

شیخ ممدوح کے تلامذہ بھی استاد کی طرح علم حدیث سے از حد تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کے دلوں میں اس علم کا اثر نہایت گہرا اور راسخ تھا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ اعنہم۔

وفات :

شیخ محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں عمر بھر حدیث نبوی کی مقدس شمع جلائے رکھی، اسی کی روشنی میں وہ زندگی کی منزلیں طے کرتے رہے اور پھر اسی کی خدمت کرتے ہوئے ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ

---

۸۲ ماہ نامہ "الرحیم" (حیدرآباد سندھ) بابت اگست ۱۹۶۳ء۔ "سرزمینِ سندھ میں علم حدیث" از مخدوم امیر احمد۔

کو مدینہ منورہ میں ہمیشہ کے لیے اللہ کے حضور پہنچ گئے۔ انھیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا، جہاں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، محدثین و فقہا اور علما و صلحا کی بہت بڑی تعداد مدفون ہے۔ ان کے شاگردِ رشید میر غلام علی آزاد بلگرامی نے "رحلتِ یثیخی" تاریخ وفات نکالی۔

شیخ کے استادِ گرامی — شیخ ابوالحسن سندھی کبیر

شیخ محمد حیات سندھی کے اساتذۂ کرام میں سے ایک بزرگ شیخ ابوالحسن سندھی تھے۔ ابوالحسن سندھی نام کے دو حضرات تھے۔ ایک ابوالحسن صغیر اور دوسرے ابوالحسن کبیر۔ جن کا تذکرہ ان سطور میں مقصود ہے، وہ ابوالحسن سندھی کبیر تھے۔ یہی شیخ محمد حیات سندھی کے استاد گرامی تھے، جن کا مدینہ منورہ میں ہنگامۂ تدریس گرم تھا، اور جن کی وفات کے بعد، ان کی مسندِ تدریس پر شیخ محمد حیات سندھی متمکن ہوئے۔

شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کا سنِ ولادت معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ علاقۂ سندھ کے مرکزِ علم ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور بارھویں صدی ہجری کے اکابر علمائے ہند میں گردانے گئے۔ ان کا اصل نام محمد تھا، والد کا نام نامی عبدالہادی تھا۔ کنیت ابوالحسن تھی اور کنیت ہی سے مشہور ہوئے۔ شیخ ممدوح نے اپنے آبائی شہر ٹھٹھہ میں تربیت حاصل کی اور حصولِ علم کی منزلیں بھی اسی شہر کے اعاظم رجال اور اکابر علما کی نگرانی میں طے کیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں ان کے علمی کمالات کی شہرت پھیل گئی اور طلبائے علم دور دراز کی مسافت طے کر کے شاملِ درس ہونے لگے۔ طلبا ان کے اندازِ تعلیم اور اسلوبِ تدریس سے نہایت متاثر ہوتے، کیونکہ وہ اس نہج سے مشکل اور دقیق مسائل کی عقدہ کشائی کرتے تھے کہ ہر بات آسانی سے مخاطب کے ذہن نشین ہو جاتی، لیکن خود استاد اس علم پر قانع نہ تھا۔ اس کے اندر مزید تحصیل کا جذبہ موجزن تھا۔ چنانچہ ٹھٹھے کی مسندِ درس کو خیرباد کہا اور

اسلامی ملکوں کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے تستر گئے، وہاں کے علما سے استفادہ کیا۔ پھر حجاز مقدس کی راہ لی اور راستے کی بے پناہ دشواریوں سے گزرتے ہوئے حرم پاک میں پہنچے۔ کچھ عرصے تک مکہ معظمہ میں قیام کیا، پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ وہاں سید محمد برزنجی اور شیخ ابراہیم کُردی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور ان حضراتِ گرامی سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے بھی مستفید ہوئے۔ پھر اسی خطۂ مبارکہ کو وطن بنا لیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

واقعات کی ترتیب اور حالات کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں سندھ کی سکونت ترک کر کے حجاز پہنچے تھے۔ کیوں کہ ان کے استاد شیخ ابراہیم کُردی کا جو ولی اللّٰہی سلسلۂ اسناد کی ایک کڑی ہیں، سالِ وفات ۱۱۰۲ھ ہے یعنی بارھویں صدی ہجری کا اوائل۔ اس سے لازم آتا ہے کہ شیخ ابوالحسن کا ان سے مستفید ہونے کا واقعہ اس سے پہلے کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ہندوستان کے تختِ حکومت پر اورنگ زیب عالمگیر متمکن تھا۔

شیخ ابوالحسن سندھی طبعاً تنہائی پسند تھے، اس لیے حرمِ نبوی میں اقامت کے ابتدائی ایام گوشہ نشینی میں گزارے، لیکن مسجد نبوی میں سلسلۂ درس شروع کیا تو لاکھوں دلوں کے مالک تھے اور تشنگانِ علم ہجوم در ہجوم ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کا حلقۂ درس ہر ملک کے علما اور طلبا کا مرکز تھا۔ عرب ملکوں کے علاوہ ہندوستان، افغانستان اور روم کے طالبانِ فیض بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اخذِ علم کرتے تھے۔ وہ دیارِ ہند کو چھوڑ چکے تھے، لیکن اس ملک کے حضرات بھی ان کے حلقۂ درس میں شریک تھے، جن میں شیخ محمد حیات سندھی کا اسمِ گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ وہ شیخ ابوالحسن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ استاد کی وفات کے بعد ہی اس

خزانۂ علم کے وارث ہوئے، اور ان کی مسندِ تدریس کا تاجِ زریں اسی تلمیذِ رشید کے سر کی زینت بنا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس لائق شاگرد نے استاذ کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا اور اس درس گاہِ عظیم کو جو مرجعِ خلائق بن گئی تھی، نہایت کامیابی سے چلایا۔ پھر آگے چل کر شیخ محمد حیات سندھی کی مساعیِ جمیلہ سے اس درس گاہ کے اثرات ہندوستان کے اہلِ علم پر بھی خوب نمایاں ہوئے اور شیخ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی اور میر سید غلام علی آزاد بلگرامی جیسے جلیل القدر علما اور متنوع خوبیوں کے حامل حضرات اس سے فیض یاب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اہلِ ہند کے ذہن کو نئی جلا بخشی اور ان کے فکر کو تحقیق و کاوش کی تابندہ راہوں سے آشنا کیا۔

شیخ ابوالحسن سندھی قرآن، حدیث اور فقہ پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ ان بنیادی علوم کی متعدد اولیں اور اونچے درجے کی کتابوں پر انھوں نے حواشی تحریر کیے جن سے علما و طلبا بہت استفادہ کرتے ہیں اور حلقۂ اہلِ علم میں ان کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان حواشی سے ان کی دقتِ نظر، قرآن و حدیث میں عبور و مہارت اور فقہ میں وسعتِ معلومات کا پتا چلتا ہے۔

تفسیر قرآن مجید کے سلسلے میں ان کی قابلِ قدر خدمت یہ ہے کہ دو مشہور تفسیروں، تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین پر شاندار حواشی تحریر فرمائے۔ قرآن کے ضمن میں ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک مستقل تفسیر لکھی۔

علمِ حدیث کے وہ بہت ماہر تھے اور اس کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ اس بنیادی علم کی انھوں نے بے پناہ خدمت کی۔ یہ خدمت تدریس کی صورت میں بھی کی اور تحریر کی صورت میں بھی۔ ان کا یہ بہت بڑا علمی کارنامہ ہے

کہ صحاح ستہ پر حواشی لکھے۔ صحیح بخاری اور ابن ماجہ کا حاشیہ مصر میں طبع ہوا۔ نسائی کا حاشیہ ہندوستان میں چھپا۔ صحیح مسلم کا حاشیہ پاکستان کے نامور اہل حدیث عالم حضرت مولانا عبدالتواب ملتانی مرحوم نے علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ ابوداؤد کا غیر مطبوعہ حاشیہ سیّد احسان اللہ شاہ مرحوم (المعروف پیر جھنڈا) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ترمذی کا حاشیہ غالباً مکمل نہیں ہو سکا تھا۔

احادیث کی ان بنیادی کتابوں کے حواشی کے علاوہ شیخ ابوالحسن سندھی نے مسند امام احمد پر بھی حاشیہ لکھا۔

شیخ ممدوح کو مسند امام ابوحنیفہ، ہدایہ اور فتح القدیر شرح ہدایہ پر بھی حواشی لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

ان کی بوقلموں خدماتِ علمیہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بہ یک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ مفسّر قرآن، شارحِ حدیث، فقیہ نامدار، مدرس، مبلّغ، محشّی، مصنف، سب کچھ تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بے شمار کمالات سے نوازا تھا۔

شیخ ابوالحسن سندھی کی تصنیفات و حواشی سے پتا چلتا ہے کہ وہ عامل بالحدیث تھے اور کتاب و سنت ہی کو مرکزِ التفات ٹھہراتے تھے۔ ان کے شاگرد شیخ محمد حیات سندھی لکھتے ہیں:

کان زاھدًا متورعًا کثیر الاتباع لکتاب اللہ وسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یعنی شیخ ابوالحسن عابد و زاہد اور متبع کتاب و سنت تھے۔

مولانا محمد عابد سندھی رقم طراز ہیں:

کان الشیخ عاملًا بالحدیث لایعدل عنہ الی مذھب۔

کہ شیخ ابوالحسن حدیث پر عمل پیرا تھے۔ حدیث کے علاوہ کسی مذہب کو قابل

اعتنا نہیں قرار دیتے تھے۔

جس زمانے میں شیخ ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اس زمانے میں ان کے ایک ہم وطن شیخ ابوالطیب سندھی بھی وہاں اقامت گزین تھے۔ وہ بھی جلیل القدر عالم اور وسیع المطالعہ فاضل تھے۔ جامع ترمذی کے شارح اور درمختار کے محشی تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کا غلغلہ درس بلند تھا، حکام وقت اور ارباب اختیار کے درباروں میں انھیں رسائی حاصل تھی۔ مذہباً حنفی اور طریقتاً نقشبندی تھے۔ اپنے مسلک میں نہایت متشدد تھے اور جزئیاتِ فقہ میں عبور رکھتے تھے۔ اختلافِ مسلک کی بنا پر شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کے زبردست حریف تھے۔ ان کی وجہ سے شیخ ابوالحسن سندھی کو بارہا شدید آزمائشوں اور ابتلاؤں میں سے گزرنا پڑا۔ شیخ محمد عابد سندھی نے اس دور کے بعض واقعات بیان کیے ہیں، جن میں دونوں کے درمیان وجہ مخالفت کا اصل راز سامنے آجاتا ہے اور شیخ ابوالحسن کو اپنے ہم وطن و ہم عصر حریف کے باعث جو تکلیفیں اٹھانا پڑیں، ان کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ شیخ محمد عابد سندھی فرماتے ہیں:

شیخ ابوالحسن سندھی عامل بالحدیث تھے۔ حدیث سے صرفِ نظر کر کے کسی مذہب کی طرف عنانِ توجہ مبذول نہیں فرماتے تھے۔ رکوع سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے اور دو رکعتوں سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرتے اور سینے پر ہاتھ باندھتے تھے، ان کے زمانے میں شیخ ابوالطیب سندھی جو حنفی المذہب تھے، اپنے مسلکِ فقہی سے ہرگز ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ اس قسم کے مسائل میں شیخ ابوالحسن سے شیخ ابوالطیب مناظروں کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ شیخ ابوالحسن متنازعہ فیہ مسائل میں اپنے دلائل بیان کرتے تو شیخ ابوالطیب ان کے جواب میں عاجز آجاتے۔ یہی مخاصمت ان دونوں علما میں ہمیشہ قائم رہی۔ ایک مرتبہ روم کے قضاۃِ احناف میں سے ایک شخص قاضی

کی حیثیت سے مدینہ منورہ میں آئے تو شیخ ابو الطیب ان کے پاس تشریف لے گئے اور شکایت کی کہ شیخ ابو الحسن ان کے فقہی مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بعض مسائل کا ذکر کر کے یہ بھی کہا کہ وہ ان مسائل میں ائمۂ احناف کے مخالف ہیں۔ قاضی نے اپنے طور پر شیخ ابو الحسن کے حالات اور فقہی نظریات کے بارے میں معلومات فراہم کیے تو انھیں پتا چلا کہ شیخ ابو الحسن تمام علوم متداولہ میں درجۂ امامت پر فائز ہیں اور مختلف فنون میں ماہر کامل ہیں۔ ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ اہلِ مدینہ شیخ ابو الحسن کے شاگرد ہیں اور انھیں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد قاضی مذکور شیخ ابو الحسن سے نہایت احترام کے ساتھ پیش آئے، اپنے لیے دعا کی درخواست کی اور عزت کے ساتھ ان سے ہم کلام ہوئے۔

شیخ ابو الطیب سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عادت بنالی تھی کہ جو قاضی بھی مدینہ منورہ میں آتا، اس کے پاس جاتے اور شیخ ابو الحسن کی شکایت کرتے لیکن کوئی قاضی بھی انھیں کچھ نہ کہتا۔ ہر قاضی انھیں اپنے ہاں بلاتا اور ان سے گفتگو کرتا تو ان کے علم اور نیکی سے اس قدر متاثر ہوتا کہ احترام کے ساتھ رخصت کرتا۔ ایک مرتبہ ایک متعصب قاضی وہاں آیا۔ شیخ ابو الطیب نے حسب معمول اس کے پاس شیخ ابو الحسن کی شکایت کی تو اس نے شیخ کو دربار میں طلب کیا اور نہایت سخت لب و لہجے میں حکم دیا کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھا کریں اور پہلی تکبیر کے سوا رفع الیدین نہ کیا کریں۔ شیخ نے جواب دیا، میں آپ کی یہ بات نہیں مانوں گا، وہی کچھ کروں گا، جو حدیث میں مذکور ہے اور اسی طرح نماز پڑھوں گا جس طرح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی یا پڑھنے کا حکم دیا۔

قاضی سخت مزاج اور متعصب تھا، وہ شیخ ابو الحسن سے یہ صاف جواب سننے کو تیار نہ تھا، اس نے غصے میں آکر شیخ کو جیل بھیج دیا اور ایسی تنگ کوٹھڑی

میں محبوس کرنے کا حکم دیا جس میں ہر وقت تاریکی چھائی رہتی تھی، کوئی چیز نظر نہ آتی تھی، حوائج ضروریہ کے لیے بھی ان کو باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ شیخ چھ دن اس کال کوٹھڑی میں بند رہے۔ پھر اہل مدینہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ وہ قاضی کی بات مان لیں اور جیل سے باہر آجائیں۔ شیخ نے ان کو جواب دیا کہ جو بات صحیح حدیث سے ثابت نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں، میں اسے ہرگز نہیں مانوں گا، اور جو عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث کی رُو سے ثابت ہے، اسے کسی صورت نہیں چھوڑوں گا۔ یہ بات انھوں نے قسم کھا کر کہی۔

اس کے بعد اہل مدینہ پھر قاضی کے پاس گئے اور پُرزور الفاظ میں شیخ کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ قاضی نے قسم اٹھا کر کہا کہ اگر میں نے ان کو نماز میں سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے دیکھ لیا تو دوبارہ جیل بھیج دوں گا۔ اہل مدینہ نے شیخ سے عرض کیا کہ ایک کپڑا لے کر پشت پر اوڑھ لیں اور اس کو دونوں طرف سے دونوں کندھوں پر ڈال لیں۔ اس کے نیچے سینے پر بھی ہاتھ باندھ لیا کریں اور رفع الیدین بھی کر لیا کریں۔ شیخ نے یہ تجویز منظور فرمالی۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصے بعد قاضی وفات پا گیا اور شیخ نے دوبارہ پہلے کی طرح کھلے بندوں سینے پر ہاتھ باندھنا اور رفع الیدین کرنا شروع کر دیا۔

بہرحال شیخ ابوالحسن سندھی کبیر بہت بڑے محدث اور عامل بالحدیث عالم تھے۔ ان کا سلسلۂ درس حدیث بہت وسیع تھا جو مسجد نبوی میں جاری تھا۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے شاگرد رشید شیخ محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ ان کے جانشین ہوئے، جو تقلید شخصی کے مخالف اور متبع کتاب و سنت تھے۔

تذکرہ ورجال کی کتابوں میں ارضِ سندھ کے اس جلیل القدر محدث کو شیخ ابوالحسن سندھی کبیر لکھا جاتا ہے، اس لیے کہ شیخ ابوالحسن دو تھے اور دونو سندھی تھے۔ دونوں نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ امتیاز کے لیے ایک کو شیخ ابوالحسن سندھی صغیر کہا جاتا ہے جو شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی صغیر تھے۔ ان کی تاریخِ وفات ۲۵ رمضان ۱۱۸۷ھ ہے۔ مقامِ وفات مدینہ منورہ ہے۔

دوسرے شیخ ابوالحسن سندھی کبیر ہیں، ان کا پورا نام شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی تھا، لقب نورالدین تھا۔ یہی وہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر ہیں، جن کے حالات قارئین کرام کے زیرِ مطالعہ ہیں۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ایک روایت کے مطابق ۱۱۴۱ھ میں وفات پائی۔ ایک روایت میں ۱۱۳۹ھ اور ایک میں ۱۲ شوال ۱۱۳۸ھ منقول ہے۔ ایک اور روایت ۱۱۳۶ھ کی بھی ہے۔

مدینہ منورہ میں اس جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت محدث کی وفات پر انتہائی حزن و ملال کا اظہار کیا گیا۔ نمازِ جنازہ میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے تدین و تقویٰ اور بے پناہ خدمتِ حدیث سے ہر طبقہ و خیال کے لوگ انتہائی متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان کے انتقال پر عورتوں نے بھی بے حد افسوس کیا اور جنازہ اٹھا تو ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھروں کے دروازوں میں کھڑی ہوگئیں۔ دکان داروں نے فرطِ غم سے دکانیں بند کردیں، حکومت کے اہل کاروں اور ولاۃ و عمال نے میت کو کندھا دیا۔ میت کو مسجد نبوی میں لایا گیا اور وہیں نماز جنازہ پڑھی گئی، اور پھر اس عظیم سندھی الاصل محدث و فقیہ کو جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ علما و طلبا اور عوام و خواص نے ان کی وفات کو ایک عظیم سانحہ قرار دیا اور اس پر نہایت غم و اندوہ کا اظہار کیا۔

شیخ ابوالحسن کے حالات[۱۷۸] ماہ نامہ "الرحیم" (حیدر آباد) میں بھی مرقوم ہیں جو "سرزمین سندھ میں علم حدیث" کے عنوان کے تحت مخدوم امیر احمد مرحوم نے تحریر کیے ہیں۔ اس میں شیخ ممدوح کے حالات مندرجہ ذیل ہیں:

"نور الدین محمد بن عبد الہادی ٹھٹھوی ثم مدنی معروف بہ شیخ ابوالحسن کبیر۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر مدینہ تشریف ہجرت کر گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

"آپ نے مدینہ منورہ میں "مدرسۃ الشفا" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ آج تک موجود ہے۔ اور ترکی اوقاف میں شامل ہے۔ راقم الحروف کو جب اللہ تعالیٰ نے ۱۹۵۲ء میں حرم نبوی کی زیارت کی توفیق عطا کی تو اس مدرسے کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس مدرسے کو "مدرسۃ الشفا" کیوں کہا گیا؟ اس کے متعلق دو روائتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس مدرسے میں قاضی عیاض کی مشہور کتاب "الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ" کا درس لازمی طور پر اور خاص اہتمام سے دیا جاتا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شیخ کے زمانے میں ایک سالارِ فوج بیمار پڑ گیا تھا اور زندگی کی امید منقطع ہو چکی تھی۔ آخر اس نے شیخ ابوالحسن کی طرف رجوع کیا جو اس وقت مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیتے تھے، اور نذر مانی کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے صحت عطا کی تو وہ حضرت شیخ کی تدریس کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کرائیں گے۔ اس نے اپنی نذر پوری کی اور شیخ کے لیے ایک مدرسہ بنایا۔ اس مدرسے کا نام "مدرسۃ الشفا" رکھا۔

"ہمارے خیال میں ان دونوں روائتوں میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے۔

---

[۱۷۸] شیخ ابوالحسن سندھی کے حالات کے لیے دیکھیے ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور۔ مورخہ ۴ مارچ و ۱۱ مارچ ۱۹۵۵ء مضمون بہ عنوان "علامہ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ"۔ از مولانا ابوالفضل فیض الرحمٰن الثوری۔

ہوسکتا ہے کہ مدرسے کے نام میں دونوں مناسبتوں کا خیال رکھا گیا ہو۔

"اس مدرسے میں ایک اچھا خاصا کتب خانہ ہے، جس میں مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کتابیں اکثر وبیشتر شیخ ابوالحسن کے شاگردوں کی لکھی ہوئی ہیں۔

"مسند امام احمد بن حنبل کے ایک مخطوطہ نسخے پر میں نے دیکھا کہ آخر میں ایک طالب علم نے لکھا تھا کہ میں نے یہ کتاب شیخ ابوالحسن سندھی کی خدمت میں مسجدِ نبوی میں فلاں وقت پڑھ کر پوری کی اور حلقۂ درس میں اتنے طالب علم شامل تھے۔

"آپ کے اساتذہ میں شیخ شمس بن محمد برزنجی، برہان کورانی اور عبداللہ بصری جیسے شیوخ شامل تھے۔

"مخدوم ابوالحسن نے صحاح ستہ پر حواشی لکھے تھے، جن میں سے اکثر مصر اور ہندوستان میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مسند امام احمد بن حنبل، اذکارِ نبویہ پر بھی حواشی تحریر کیے تھے۔ علامہ ابن حجر کی کتاب "شرح نخبۃ الفکر" پر بھی حاشیہ لکھا تھا۔ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کی شرح بھی لکھی تھی۔ خلاصہ یہ کہ آپ فنِ حدیث کے ایک محقق حافظ اور صاحبِ تدقیق فاضل تھے۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ علامہ کتانی ۱۱۳۹ھ اور علامہ عبدالرحمٰن الجبرتی ۱۱۳۶ھ بتاتے ہیں۔ آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا۔[۷۹]

۲۴- قاضی محمد حیات برہان پوری

قاضی محمد حیات برہان پوری بارھویں صدی ہجری کے نامور فقیہ تھے

---

۷۹ ماہ نامہ "الرحیم" (حیدرآباد سندھ) مطابق جولائی ۱۹۶۳ء مضمون "سرزمینِ سندھ میں علم حدیث" از مخدوم امیر احمد

اور ان کا شمار فقہائے حنفیہ کی بلند مرتبت جماعت میں ہوتا تھا مغل حکمران محمد شاہ اور بعض دیگر بادشاہوں کے عہد میں برہان پور کے منصب قضا پر متمکن رہے۔ ایک مغل بادشاہ نے ان کی فقہی اور علمی قابلیت کی بنا پر ان کو قاضی شریعت خاں کے پُراعزاز لقب سے سرفراز کیا تھا۔ ممدوح محکمۂ قضا کی اہم ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ درس و افادۂ طلبا میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ان سے علما کی بہت بڑی تعداد نے اخذِ علم کیا۔[۵۸۰]

۲۵- سیّد محمد مخدوم پھلواروی

سیّد محمد مخدوم بن امان اللہ بن محمد امین بن محمد جنید ہاشمی جعفری پھلواروی، صوبہ بہار کے مردم خیز شہر پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ حصولِ علم کا آغاز اپنے والد گرامی سیّد امان اللہ پھلواروی سے کیا، جو اپنے دَور کے صاحب علم بزرگ تھے۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے مختلف بلاد و انصار میں گئے اور متعدد اساتذہ سے اخذِ علم کیا۔ شیخ محمد وارث حسینی بنارسی (متوفی ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۶ھ) کی خدمت میں بھی گئے، جن کا بنارس میں سلسلۂ درس جاری تھا۔ ان سے کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر اپنے عصر کے مشہور عالم و فقیہ اور شیخ مانے گئے۔ نیکی اور تقوے کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔

سیّد محمد مخدوم پھلواروی فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن پھلواری واپس آگئے تھے۔ وہاں انھوں نے خود درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور تمام عمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

پھلواری کے اس عالم و فقیہ نے ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ کو وفات پائی۔[۵۸۱]

---

۵۸۰ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۲ بحوالہ تاریخ برہان پور

۵۸۱ ایضاً ص ۳۰۳ بحوالہ حدیقۃ الازہار

۲۶- قاضی محمد دولت فتح پوری

قاضی محمد دولت فتح پوری، اپنے عصر کے فاضل علمائے حنفیہ میں سے تھے۔ ان کا آبائی تعلق موضع سہالی سے تھا جو نواحِ لکھنو میں واقع ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

قاضی محمد دولت بن محمد یعقوب بن فرید بن سعد اللہ بن احمد بن حافظ الدین انصاری سہالوی۔ قاضی محمد دولت کے والد محمد یعقوب، شیخ محب اللہ عمری الہ آبادی کے بھانجے تھے جو اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔

قاضی محمد دولت موضع سہالی میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور وہیں شیخ قطب الدین شہید سہالوی سے علم حاصل کیا۔ رسالہ قطبیہ کے بیان کے مطابق شیخ شہید نے ان کو متبنّیٰ بنالیا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ میں سہالی سے فتح پور منتقل ہو گئے اور وہاں اپنے خسر ابو الرافع حسامی کے گھر میں رہنے لگے۔ پھر فتح پور سے دہلی گئے۔ اس زمانے میں بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے حکم سے شیخ نظام برہان پوری کی نگرانی میں علما کی ایک جماعت فتاویٰ ہندیہ کی ترتیب پر مامور تھی۔ یہ وہی فتاویٰ ہے جو آگے چل کر فتاویٰ عالم گیری کے نام سے معروف ہوا۔ قاضی محمد دولت چوں کہ علم فقہ اور اس کے متعلقات میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور حلقۂ علما میں خاص شہرت کے مالک تھے، لہذا فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جلیل القدر جماعت میں شامل کیے گئے۔ بعد ازاں عالم گیر نے ان کو شہر سورت کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ یہ منصب قضا کے لیے بادشاہ سے ان کی سفارش سیّد محمد حسینی قنوجی نے کی تھی اور اس سفارش کی وجہ شیخ محب اللہ عمری الہ آبادی سے ان کا تعلقِ قرابت تھا۔

اغصان الانساب کی روایت کے مطابق یہ قاضی مقرر ہو کر سورت جا رہے تھے کہ اثنائے سفر میں راہزنوں کے چنگل میں پھنس گئے اور قتل

کر دیے گئے۔[۵۸۲]

۲۷۔ سیّد محمد راجے جون پوری

سیّد محمد راجے حسینی واسطی جون پوری مشہور عالم و صوفی سیّد محمد حفیظ حسینی واسطی جون پوری (متوفی ۲۰ شوال ۱۱۲۸ھ) کے پوتے تھے، عالم باعمل تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بہت سی کتب درسیہ اپنے جدّ امجد سیّد محمد حفیظ جون پوری سے پڑھیں۔ ان کی وفات کے بعد اپنے شہر۔ جون پور۔ کے اساتذہ کرام سے استفادہ کیا، یہاں تک کہ فقہ و اصول میں کامل مہارت پیدا کر لی اور جماعتِ علما میں "افقہ الفقہا" کے طور پر شہرت پائی۔ نہایت قانع، متوکل علی اللہ اور پاک باز بزرگ تھے، شاعر بھی تھے۔ بڑے متین اور صاحبِ اعزاز و اکرام عالمِ دین تھے، ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہتے۔ ۱۷ ربیع الاوّل ۱۱۸۳ھ کو فیض آباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔[۵۸۳]

۲۸۔ مولانا محمد رضا انصاری سہالوی

مولانا محمّد رضا سہالوی، شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے چوتھے بیٹے تھے جو باپ کی شہادت کے وقت سب سے چھوٹے تھے۔ سہالی میں پیدا ہوئے اور ابھی بارہ سال کی عمر کے تھے کہ ان کے والد گرامی۔ شیخ قطب الدین سہالوی۔ شہید کر دیے گئے۔ اس کے بعد یہ خاندان سہالی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا اور بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو مستقل سکونت کے لیے فرنگی محل

---

[۵۸۲] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۳ — برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ ص ۳۱۷
[۵۸۳] تجلی نور، ج ۲ ص ۶۹ — تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۴۳۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۳، ۳۰۴۔

عطا کیا۔ لکھنؤ پہنچ کر اس خاندان کے اہلِ علم نے فرنگی محل میں درس و تدریس کا وہی قدیم سلسلہ شروع کر دیا جو سہالی میں جاری تھا۔ اس سے بے شمار حضرات نے فیض حاصل کیا۔

مولانا محمد رضا سہالوی نے لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی شیخ نظام الدین سہالوی سے کسبِ علم کیا، یہاں تک کہ علوم مروجہ میں کامل دسترس حاصل کی اور فقہ میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود بھی لکھنؤ میں مسندِ تدریس بچھائی اور طویل عرصے تک علما و طلبا کو مستفید فرماتے رہے۔ اس اثنا میں شیخ عبدالرزاق حسینی بانسوی سے اخذِ طریقت بھی کیا۔ بعد ازاں ارضِ حجاز کا قصد فرمایا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد کوئی پتا نہیں چل سکا کہ کہاں گئے اور کب فوت ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے بغداد چلے گئے تھے، وہیں انتقال کیا۔ ایک خیال یہ ہے کہ شاید اپنے برادرِ کبیر شیخ نظام الدین سہالوی کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ شیخ نظام الدین سے عمر میں سات سال چھوٹے تھے۔

رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق مولانا محمد رضا سہالوی نے قاضی محب اللہ بہاری کی مشہور درسی کتاب "مسلم الثبوت" کی شرح بھی سپردِ قلم کی تھی مسلم الثبوت اصول فقہ کی معروف کتاب ہے اور درس نظامیہ میں شامل ہے۔ اس قسم کی کتاب کی شرح وہی عالم لکھ سکتا ہے جو علم فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں پوری مہارت رکھتا ہو۔

بہر حال مولانا محمد رضا سہالوی کے حرمین شریفین جانے کے بعد ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان کے سنِ وفات اور مقامِ وفات کا بھی کسی کو علم نہیں[۱۸۹]

---

[۱۸۹] احوال علمائے فرنگی محل ص ۳۲، ۳۳۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۵۹۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۴

۲۹۔ شیخ محمد رضا لاہوری

شیخ محمد رضا حنفی قادری لاہوری، سرزمینِ پنجاب میں بارھویں صدی ہجری کے نامور فاضل اور مشہور عالم تھے۔ ہر وقت درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی میں مصروف رہتے۔ حسنِ قبول، کثرتِ تلامذہ اور مسترشدین کی تعداد میں اس دور کے پنجاب کا کوئی عالم ان کا ہمسر نہ تھا۔ خطۂ پنجاب کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۸ھ کو اپنے شہر لاہور میں وفات پائی۔[۵۸۵]

۳۰۔ مولانا محمد سعید انصاری سہالوی

مولانا محمد سعید سہالوی، شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے دوسرے بیٹے تھے۔ موضع سہالی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والدِ گرامی قدر شیخ قطب الدین شہید سے علم حاصل کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ والد کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ میں مظلومی کا محضر لے کر بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کی بارگاہ میں دکن گئے اور بادشاہ سے لکھنؤ کی مشہور عمارت فرنگی محل کی معافی اور عطیے کا فرمان حاصل کیا۔ واپس آکر اس عمارت پر قابض ہوئے۔ بعد ازاں اپنے تمام بھائیوں اور اعزہ و اقربا سمیت اس میں سکونت گزین ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد دوبارہ فرنگی محل کی معافی اور عطیے کے فرمان کی توثیق و استحکام وغیرہ کے لیے بادشاہ کی خدمت میں گئے اور اسنادِ قبضہ حاصل کر کے تمام کاغذات بھائیوں کے پاس بھیجے۔

مولانا محمد سعید انصاری سہالوی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم و فقیہ، باعمل اور صاحبِ عفت و حیا تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت

---

۵۸۵ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۵ — حدائق الحنفیہ ص ۴۳۱

میں شامل ہونے کا بھی انھیں فخر حاصل ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے اس عالم دین نے مغل حکمران شاہ عالم کے عہدِ حکومت میں عالم جوانی میں وفات پائی۔

ایک روایت کے مطابق بادشاہ سے دوسری مرتبہ فرنگی محل کی اسنادِ توثیق لے کر لکھنؤ میں بھائیوں کو بھجوادی تھیں اور خود مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ پھر وہیں بیمار ہو کر راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔[۵۸۶]

۱۳۱- شیخ محمد سعید انبالوی

شیخ محمد سعید بن محمد یوسف بن غلام محمد بن محمد افضل حسینی ترمذی انبالوی، کبار علما میں سے تھے۔ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر انبالہ کے رہنے والے تھے اور وہاں کی مسندِ مشیخت پر فائز تھے۔ انتہائی متبع سنت اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہ درجہ غایت پابند تھے۔ اسلافِ کرام کے ان آثار و روایات کو جو کتاب و سنت سے ہم آہنگ ہوں، ماننا ضروری قرار دیتے تھے۔ معاملاتِ دنیا سے منقطع ہو کر زہد و عبادت میں مشغول رہتے تھے اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اپنا مشغلۂ حیات قرار دے لیا تھا۔ بہت بڑے فقیہ اور جیّد عالم تھے۔ دین کی تبلیغ و اشاعت ان کا مطمحِ نظر تھا۔ اسباب دنیا سے اس قدر بے نیاز تھے کہ کوئی شی اپنے پاس نہ رکھتے اور کھانے پینے کی کسی چیز کا ذخیرہ نہ کرتے۔ جو کچھ کہیں سے ملتا، بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے، کل کی بالکل پروا نہ کرتے۔ ملوک و امرا ان کو لاکھوں روپے نقد اور کئی قسم کی چیزیں بھیجتے، ان میں سے کوئی چیز گھر میں نہ رکھتے، سب فقرا و مساکین اور مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ ان کی عادت تھی کہ دنیا کے مال و متاع میں سے

---

[۵۸۶] تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۶۲، ۶۳ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۱۱

کوئی شے بھی رات کو اپنے پاس نہ رہنے دیتے، جس وقت کچھ ہاتھ آتا، اسی وقت اصحابِ حاجت کو دے دیتے۔

شیخ محمد سعید انبالوی نہایت عمدہ اوصاف و کمالات کے حامل عالم و فقیہ تھے۔ انھوں نے ۵ رمضان المبارک ۱۱۰۳ کو وفات پائی۔ ان کی قبر بکھرام میں ہے [۵۸۷]

۳۴۲۔ مولانا محمد شجاع ہنگامی

مولانا محمد شجاع بن معزالدین ہنگامی، موضع ہنگام میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمالِ الٰہ آباد (یو پی) میں ایک اچھا خاصا قریہ تھا۔ وہیں تربیت پائی۔ علامہ محمد برکت الٰہ آبادی اور قاضی محمد پناہ جون پوری سے حصولِ علم کیا۔ اس کے بعد شیخ محمد معصوم کاکوردی سے اخذِ طریقت کیا، طویل مدت تک ان سے منسلک رہے اور علم و معرفت کی بلند منزلوں تک پہنچے۔ پھر جب ان کے علاقے پر کفار کا غلبہ ہوگیا تو افغانستان چلے گئے۔ خاصا عرصہ وہاں سکونت اختیار کیے رکھی۔ بعد ازاں وطن واپس آئے تو "منہج الرشاد لنجاۃ العباد" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ صاحب نزہۃ الخواطر علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی کے پاس خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا، اس کا سِن کتابت ۱۱۸۱ھ ہے۔

کتاب تین مقالات اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ دو مقالے اعتقادیات کو محیط ہیں۔ مقالۂ اول مبدا اور مقالۂ ثانی معاد کا احاطہ کیے ہوئے ہے، مقالۂ ثالث اوراد و وظائف سے متعلق ہے۔ خاتمۂ کتاب بعض اولیائے کرام اور علمائے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کے بارے میں ہے۔

---

[۵۸۷] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۱۱، ۳۱۲ بحوالہ بحرِ زخار۔

اس کتاب کے چند اقتباسات علامہ سیّد عبدالحی حسنی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر کی جلد ششم میں نقل کیے ہیں۔ ان میں ایک اقتباس تشہد میں رفعِ سبابہ کے متعلق ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

اختلف علماءنا فی رفعھا وعدمہ فی التشھد فاجازہ قوم ونفاہ اٰخرون فالمثبتون کثیرون والنافون شرذمۃ قلیلون والحق ان الرفع ھو الموافق للاحادیث الصحاح والروایات الفقھیۃ۔

یعنی ہمارے علما کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ تشہد میں انگشت شہادت اٹھانی چاہیے یا نہیں۔ ایک جماعت نے اٹھانے کی اجازت دی ہے اور دوسروں نے اس سے روکا ہے، جو لوگ رفع سبابہ کے ثبوت کے قائل ہیں، ان کی تعداد زیادہ ہے اور روکنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ رفعِ سبابہ احادیثِ صحاح اور روایاتِ فقہیہ کے عین مطابق ہے۔

ایک زمانے میں طبقۂ علما میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا تھا کہ نمازِ جمعہ کے بعد احتیاطاً نماز ظہر پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ بعض اس کے قائل تھے اور بعض مخالف۔ دونوں طرف کے علما اس سلسلے میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ شیخ محمد شجاع ہنگامی نے بھی اس مسئلے پر بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ نماز جمعہ کا وجوب کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ فقہا میں اس کے وجوب سے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ اختلاف شرائطِ جمعہ میں ہے۔ مصنف نے اس ضمن میں دونوں نقطہ ہائے نظر بیان کر دیے ہیں اور آخر میں یہ کہا ہے کہ روایاتِ فقہیہ کی رُو سے نمازِ جمعہ کے بعد بطور احتیاط نمازِ ظہر پڑھ لینی چاہیے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت اور ان کا اپنا حکمران نہ ہو۔

شیخ محمد شجاع ہنگامی نے اس کتاب میں یزید بن معاویہ اور حجاج بن

یوسف پر لعنت بھیجنے کی بھی سخت الفاظ میں مخالفت کی ہے اور اس سلسلے میں مختلف دلائل دیتے ہوئے ایک دلیل یہ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ قبلہ اور نمازیوں پر لعنت بھیجنے سے منع فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

لا ینبغی اللعن علیه ولا علی الحجاج ومن کان من اھل القبلۃ لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن لعن المصلین۔

یعنی نہ تو یزید کو ملعون کہنا چاہیے نہ حجاج بن یوسف کو، نہ کسی ایسے شخص کو جو اہلِ قبلہ میں سے ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیوں کو ملعون قرار دینے سے منع فرمایا ہے۔

کتاب کے جو بعض اقتباسات سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں نقل کیے ہیں، وہ بڑے دلچسپ اور مدلل ہیں۔ مصنف نے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض افکار سے بھی شدید اختلاف کیا ہے۔

بہر حال بارھویں صدی ہجری کے یہ عالم قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر علومِ مروجہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔[۵۸۱]

۳۳۔ مولانا محمد شفیع بدایونی

صوبہ یو پی کے شہر بدایوں کو طویل عرصے تک علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مولانا محمد شفیع بدایونی بھی اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے، اور عہدِ اورنگ زیب کے جید علما اور ممتاز فقہا میں سے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی دانیال تھے جو عراق سے آئے اور بدایوں کے قاضی مقرر

۵۸۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۱۵ تا ۲۱۸

کیے گئے۔ انھوں نے مستقل طور پر بدایوں ہی میں اقامت اختیار کر لی تھی ان کی اولاد میں سے ایک شخص شیخ مصطفیٰ تھے، جو تصوف و معرفت میں یگانۂ روزگار تھے اور شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیفات کے دقیق مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ فقہ پر بھی عمیق نظر رکھتے تھے۔ یہ مولانا محمد شفیع بدایونی کے والدِ گرامی قدر تھے۔ مولانا محمد شفیع بدایونی نے اپنے بلند مرتبت باپ سے علم حاصل کیا، اور فقہ، اصول اور تصوف کے اونچے درجے کو پہنچے۔ تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور تشنگانِ علوم کو بے حد مستفید کیا۔ ۹۷ سال کی عمر پا کر ۲۲ شوال کو گیارھویں صدی ہجری کے آخر یا بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں فوت ہوئے۔ دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ ایک کا نام مولانا محمد شریف تھا اور دوسرے کا خطیب عبداللطیف ۵۹

۳۴۔ قاضی محمد شفیع گجراتی

قاضی محمد شفیع گجراتی حنفی المسلک تھے۔ اپنے علاقے کے شیخ و فاضل بزرگ تھے اور فقہ و اصول میں یگانۂ روزگار شمار کیے جاتے تھے اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں میرٹھ کے منصبِ قضا پر مامور کیے گئے، جو اعمالِ احمد آباد میں واقع ہے ۶۰

۳۵۔ شیخ محمد صادق ٹھٹھوی سندھی

شیخ محمد صادق ٹھٹھوی سندھی شیخ عنایت اللہ ٹھٹھوی سندھی کے فرزند ارجمند تھے جو دیارِ سندھ کے بہت بڑے صوفی تھے۔ شیخ محمد صادق سندھی،

---

۵۹ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۹۳، ۱۹۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۱۸

۶۰ مرآۃ احمدی ص — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۱۹

ٹھٹھے میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علم نحو اور علوم عربیہ یعنی فقہ و اصول اس دور کے جید عالم شیخ محمد معین سندھی سے حاصل کیے اور علوم منقول و معقول کے فحول علما میں گردانے گئے۔ حصول علم کے بعد حج کو روانہ ہوئے اور شہر سورت میں پہنچے تو وہاں شیخ عبدالولی بن شیخ سعداللہ سلونی کا حلقۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور شیخ سے علوم حکمیہ کی تکمیل کی۔ پھر اپنے وطن سندھ واپس آگئے اور درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ انھیں پیری مریدی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ صرف تدریس سے تعلق رکھتے تھے۔[۹۱]

۳۶۔ شیخ محمد صالح بنگالی

شیخ محمد صالح حنفی بنگالی، فقہ و اصول، فلسفہ و حکمت، منطق و کلام اور تمام فنون نقلیہ و عقلیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کتب درسیہ پہلے قاضی شہاب الدین گوپاموی (متوفی تقریباً ۱۱۲۰ھ) سے پڑھیں۔ اس کے بعد سید محمد زاہد حسینی ہروی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ پھر خود درس و تدریس کی مسند بچھائی اور بہت سے طلبائے علم کو مستفید فرمایا۔[۹۲]

۳۷۔ مولانا محمد صدیق لاہوری

مولانا محمد صدیق بن محمد حنیف بن محمد لطیف لاہوری، مسلکاً حنفی تھے۔ اپنے زمانے میں لاہور اور اس کے گرد و نواح کے بہت بڑے فقیہ اور جلیل القدر

---

۹۱ تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۶۵، ۳۶۶ — نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۲۰۔

۹۲ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۲۱ بحوالہ رسالہ قطبیہ۔

عالم تھے۔ ان کے والد محمد حنیف کابل سے لاہور آکر مقیم ہوئے تھے اور مسجد وزیر خاں میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ محمد صدیق اتوار کے روز ۲۹ محرم ۱۱۲۸ھ کو پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو صاحب تعلیقات بیضاوی مولانا محمد عابد لاہوری سے قرآن پڑھنا شروع کیا، قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مرزا احمد اللہ، ملا حفیظ اللہ، ملا عبداللہ، مولانا شہریار، مولانا محمد عابد لاہوری اور بعض دیگر علما کے حلقۂ شاگردی داخل ہوئے اور تحصیل علم کی، یہاں تک کہ بحث و اشتغال اور علم و فضل میں مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے۔ علما میں صاحب فضل و کمال قرار پائے اور افتا و تدریس کی مسندِ جلیلہ کو رونق بخشی۔ طویل مدت تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ پھر ۱۱۷۰ھ میں ارضِ حجاز کا سفر کیا اور حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ اس زمانے میں وہاں متعدد اصحاب حدیث تعلیمِ حدیث کے فرائض انجام دیتے تھے، مولانا محمد صدیق بھی ان کی خدمت میں گئے اور شیخ یحییٰ بن صالح مکّی مدرس مدرسہ مسجد الحرام اور نامور محدث شیخ ابوالحسن سندھی مدرس مدرسہ مدینہ منورہ سے حدیث کی سند حاصل کی۔

مولانا محمد صدیق متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن کے نام یہ ہیں:

سلك الدرر ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر منقوط سیرت ہے۔ مدار الاسلام فی علم الکلام ۔ القول الحق فی ترك الشعر والحلق، شروط الایمان، دعاء التعسف عن ساحة عصمة یوسف، هدم الطاغوت فی قصة هاروت وماروت، نور حدقة الثقلین فی تمثال النعلین، شرح النفحات الباهرہ فی جواز القول بالخمسة الطاهرہ المسمّٰی بہ توضیح السنة فی تفضیح البدعة، ازالة الفسادات فی شرح مناقب السادات ۔ یہ کتاب شیخ شہاب الدین دولت آبادی کی مناقب السادات کی شرح ہے۔ تبییض الورق فی تبیین الحق فی رد ما تساهل

فیہ الشیخ عبد الحق، جامع الوظائف، لقطۃ الحطب، الدیوان مزیل الاحزان، زبدۃ الفرح، جامع طب احمدی، ترجمہ فقر محمدی، ھدیۃ انام، یہ کتاب خطیبوں کے لیے ہے۔ ان کے علاوہ ان کی بعض اور تصانیف بھی تھیں۔

مولانا محمد صدیق لاہوری، جلیل القدر عالم، بہت بڑے فاضل، نامور فقیہ، کثیر التصانیف مصنف، بہترین ادیب اور انشا پرداز، مشہور مدرس اور صاحب تحقیق مفتی تھے۔ خطۂ لاہور کے اس ہمہ اوصاف عالم نے ۱۱۹۳ھ میں اس دنیائے فانی سے سفرِ آخرت اختیار کیا[۹۳]۔

گزشتہ سطور میں مولانا محمد صدیق لاہوری کے اساتذہ میں ایک عالمِ دین مولانا شہر یار کا نام نامی بھی آیا ہے۔ یہ بہت بڑے صاحبِ علم بزرگ تھے اور لاہور کی مشہور مسجد چینیانوالی میں امامت و خطابت اور تدریس و افتا کے منصب پر فائز تھے۔ ان کے تفصیلی حالات تو افسوس ہے، معلوم نہیں ہو سکے، البتہ ان کا ایک واقعہ پروفیسر مولانا علم الدین سالکؔ مرحوم نے روزنامہ "امروز" (لاہور مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۰) کے عید نمبر میں اپنے ایک مضمون میں بیان کیا تھا، جو "لاہور کی تاریخی عید" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس واقعہ کا تعلق مولانا محمد صدیق سے بھی ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا، جب لاہور میں احمد شاہ ابدالی اور میر منو کا مقابلہ ہوا، اور ابدالی نے میر منو کو شکست دے کر لاہور فتح کیا۔ اتفاقاً ان دنوں عید الفطر آئی تو احمد شاہ ابدالی نے مسجد وزیر خاں میں مولانا محمد صدیق کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ اس واقعہ کو سمجھنے کے لیے اس کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے تاکہ اس عہد کے پنجاب اور لاہور کے

---

۹۳ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۹۴ — حدائق الحنفیہ ص ۴۵۱، ۴۵۲ — نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۳، ۳۲۴

سیاسی حالات کا علم ہو سکے۔

نواب معین الملک عرف میر منو مغل حکمران محمد شاہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے وزیر اعظم نواب قمر الدین خاں کا خلف الرشید تھا۔ اس نے سرہند کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے خلاف لڑتے ہوئے غیر معمولی شجاعت اور بے مثال استقلال کا مظاہرہ کیا تھا، جب اس کا باپ توپ کے گولے سے زخمی ہو کر دارو گیر جہاں سے آزاد ہو گیا تو محمد شاہ نے اسے لاہور کا ناظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ جس قدر جلد ہو سکے حالات پر قابو پایا جائے اور پنجاب سے ان عناصر کو ختم کر دیا جائے جو فتنہ و فساد پھیلانے کا باعث ہیں۔ مرکز اس سلسلے میں اس کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرے گا۔

میر منو ان ہدایات کے مطابق لاہور پہنچا، ارد گرد کے حالات کا جائزہ لیا اور مقابلہ کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی۔ ابھی وہ اپنے اس فرض سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا، کہ اطلاع ملی کہ احمد شاہ ابدالی سرہند کی جنگ کا انتقام لینے کے لیے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ لاہور کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ میر منو نے اپنی فوج کو جمع کیا اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ دونوں جانب کی فوجیں عرصے تک ایک دوسرے کے سامنے پڑی رہیں۔ کبھی کبھار کوئی چھوٹی موٹی جھڑپ ہو جاتی، لیکن اس کے ساتھ ہی صلح کے لیے گفت و شنید بھی جاری رہی۔ آخر دونوں فریق ــ میر منو اور احمد شاہ ابدالی ــ اس بات پر متفق ہو گئے کہ لاہور کے چار محال یعنی سیالکوٹ، پسرور، گجرات اور اورنگ آباد کا مالیہ خراج کے طور پر سالانہ احمد شاہ کی خدمت میں پیش ہوتا رہے گا۔ یہ معاہدہ طے ہونے کے بعد ابدالی واپس چلا گیا۔

اس طرح ابدالی کے بیرونی خطرے کو دور کر کے میر منو داخلی فتنوں کی طرف متوجہ ہوا، اور ان کو ختم کرنے کے لیے اسے وقت مل گیا۔ اس نے اپنے علاقے میں نہایت مؤثر اقدامات کیے اور تھوڑے ہی عرصے میں پورے علاقے کو

پہلے تو مرہٹوں سے نجات دلائی، پھر کامل حزم و احتیاط سے سکھوں کی طاقت کو ختم کیا اور ان کی دہشت گردی کی وجہ سے شہری اور دیہاتی زندگی میں جو تعطل پیدا ہو گیا تھا، اس کو رفع کیا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملتان اور لاہور کے صوبے امن و سلامتی کا گہوارہ بن گئے۔

ان معاملات سے فارغ ہو کر میر منو نے ابدالی کے متوقع حملوں کی روک تھام کے لیے عملی تدابیر اختیار کیں۔ سرحدوں پر مورچے بنائے اور وہاں تازہ دم فوج متعین کی۔ وسائل رسل و رسائل اور آمد و رفت کا پورا انتظام کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام علاقہ خطرات کی زد سے محفوظ ہو گیا اور ہر شخص امن و اطمینان کا سانس لینے لگا۔

۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) کے آخر میں محمد شاہ نے وفات پائی۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی وفات کا پتا چلا تو اسے میر منو سے صلح کرنے پر بہت افسوس ہوا، کیونکہ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ ایک بادشاہ کی موت اور دوسرے کی تخت نشینی سے کس قدر جھمیلے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر چند وہ میر منو کے مقابلے میں اترنا چاہتا تھا، مگر معاہدے کی پابندیوں سے جکڑا ہوا تھا، تاہم وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے بہانے تلاش کرتا رہا، لیکن اس وقت اسے کوئی بہانہ نہ مل سکا۔ ادھر میر منو بھی اس کے عزائم سے غافل نہ تھا، اس نے چار محال کے خراج کا چکمہ دے کر اور ایک سال کی رقم ادا کر کے اگرچہ اسے وقتی طور پر شمالی ہند پر حملہ آور ہونے سے روک دیا تھا، لیکن خراج کی پوری رقم چوں کہ ادا نہیں کی گئی تھی، اس لیے اس کو بہانہ بنا کر کسی وقت بھی وہ شمالی ہند کو پامال کرنے کے لیے خراج کی بقایا رقم کو وجہ نزاع قرار دے سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ابدالی نے بقایا رقم کا مطالبہ کیا اور میر منو نے حسب معمول اسے الفاظ کی شیریں سے ٹالنا چاہا۔ ابدالی نے یہ سوچ کر کہ فوج کشی کے بغیر یہ رقم وصول نہ ہو گی، فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ ایک لشکر جرار کے ساتھ دریائے

سندھ کو عبور کیا اور پوری تیزی سے چناب کے کنارے پہنچ کر دم لیا۔ وہاں سے اپنے دیوان راجہ سکھ جیون لال کو میر منو کے پاس بھیجا تاکہ وہ اس جھگڑے کو مصالحت کے ساتھ طے کر لے اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ راجہ سکھ جیون لال لاہور پہنچا تو میر منو نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور پوری خاطر مدارات کی، لیکن اسے خراج کی رقم وصول نہ ہو سکی اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا، جس سے احمد شاہ ابدالی کو سخت صدمہ پہنچا۔

دیوان راجہ سکھ جیون لال کو خالی ہاتھ واپس بھیجنے کے فوراً بعد میر منو نے اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور ایک زبردست فوج کے ساتھ چناب کی جانب روانہ ہوا۔ اس سے اس کا مقصد احمد شاہ ابدالی پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس کی دھمکیوں کی اسے پروا نہیں اور وہ لڑنے کو تیار رہے۔ لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے اس نے والیِ ملتان دیوان کوڑا مل اور والیِ دوآب (جالندھر) آدینہ بیگ کو لکھا کہ وہ اپنی اپنی فوجوں کو حرکت دیں اور دریائے چناب کے کنارے آ کر اس سے ملیں۔ ساتھ ہی احتیاط کے پیشِ نظر اپنی والدہ اور اہل و عیال کو (جموں) کشمیر بھیج دیا تاکہ وہ حملہ آور کی دست بُرد سے محفوظ رہیں۔

احمد شاہ ابدالی نے میر منو کے عزم و ثبات کو دیکھ کر اپنے مورچے وزیر آباد اور سوہدرہ کے درمیان قائم کیے، مگر یہ مقام بھی اسے پسند نہ آیا تو وہاں سے آہستہ آہستہ سرکتا ہوا شاہدرہ کے قریب پہنچ گیا۔ میر منو بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اس نے دریائے راوی عبور کیا اور خندقیں کھود کر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ ابدالی کا لشکر اس کے سامنے اور لاہور شہر اس کی پشت پر تھا۔ اب خندقوں کی اوٹ میں اکاّ دکاّ جھڑپیں ہونے لگیں، کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ البتہ فریقین کی فوجوں کی کثرت

سے راوی اور چناب کا درمیانی علاقہ بالکل برباد ہو گیا اور قحط کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ایک رات ابدالی نے نہایت خفیہ طریقے سے راوی کو عبور کیا اور محمود بوٹی، اور شالامار باغ کے گرد و نواح میں اپنا کیمپ قائم کر لیا اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

اِدھر میر منو کو اس کا علم ہوا تو اس نے بھی شمشیر بند ہو کر غنیم سے معرکہ آرا ہونے کا عزم کر لیا، شہر پناہ، قلعہ اور دوسرے اہم ناکوں کو درست کیا اور خندق کا دوبارہ جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس کے مورچے روز بروز کمزور ہو رہے ہیں، سامانِ رسد میں کمی واقع ہو گئی ہے اور جانوروں کے لیے چارہ کم یاب ہو گیا ہے۔ ابدالی کے فوجی دستے ہر چیز کی درآمد کو سختی کے ساتھ روک رہے ہیں، جھڑپیں بدستور جاری ہیں اور شکستہ دیواروں اور فصیلوں کی مرمت ہو رہی ہے۔ اس طرح چار مہینے گزر گئے۔ قحط نے باشندگانِ شہر کو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لیا ہے، مگر فوج کے لوگ پوری دلیری سے ابدالی کی ہر تدبیر کو ناکامی سے بدل دینے میں مصروف ہیں اور اس کے ہر حملے کا دنداں شکن جواب دے رہے ہیں۔ اُس کے آدمی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو میر منو کے فوجی پوری طاقت کے ساتھ ان کو پیچھے مورچوں میں ڈھکیل دیتے ہیں۔

بہرحال احمد شاہ ابدالی کو یقین ہو گیا تھا کہ میر منو آخر دم تک لڑے گا، وہ لاہور شہر کا دفاع کرتا ہوا مر جائے گا مگر شہر اس کے حوالے نہیں کرے گا۔ یہ سوچ کر اس نے محاصرے کو اور زیادہ سخت کر دیا، اور جن جن راستوں سے شہر میں کھانے پینے کا سامان آتا تھا، ان پر قبضہ کر لیا۔ اس سے شہر کے لوگ بہت زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو گئے، ان کی حالت اس درجے ابتر ہو گئی کہ انھوں نے چھپر کاٹ کاٹ کر چارے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر میر منو نے مجلسِ مشاورت منعقد کی، جس میں دیوان کوڑا مل، آدینہ بیگ اور متعدد چھوٹے بڑے امیر شریک ہوئے، انھوں نے

تمام حالات کا جائزہ لیا اور افغانوں کے جبر و تشدد اور ظلم و ستم پر سخت نفرت کا اظہار کیا۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد متفقہ طور سے فیصلہ کیا گیا کہ یا تو شہر سے باہر نکل کر دشمن پر شدید حملہ کیا جائے اور پوری قوت سے کام لے کر اسے ختم کر دیا جائے یا پھر مصالحت کی کوشش کی جائے، مگر دیوان کوڑا مل نے اس کے خلاف رائے دی، اس نے کہا کہ جنگ کو طول دیا جائے کیونکہ دو ہفتے تک گرمی شروع ہو جائے گی، افغان اس کو برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں، وہ اس سے گھبرا جائیں گے اور محاصرہ ختم کر کے واپس جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن دیوان مذکور کے اس دُور اندیشانہ مشورے پر کسی نے کان نہ دھرا، اور سب لوگ پہلی تجویز پر عمل کرنے اور حملے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۷۵۲ء کو زوردار حملہ کیا گیا اور نتیجۃً پہلے ہی حملے میں محمود بوٹی کے کئی مورچوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنی فوجوں کی کمزوری دیکھی تو سواروں کو حکم دیا کہ وہ بھی توپ خانے کے ساتھ مل کر حملہ کریں۔

دو پہر تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، توپیں آگ برسا رہی تھیں اور لڑائی پوری شدت سے جاری تھی۔ اتنے میں دیوان راجہ کوڑا مل کا ہاتھی ایک قبر میں دھنس گیا اور ایک افغان سپاہی نے پوری تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا اور بطور نذر کے ابدالی کی خدمت میں پیش کیا۔ میر منو کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا، اور اس کی فوج میں اس سے بد دلی اور انتشار پھیل گیا۔ آدینہ بیگ میدانِ جنگ سے بھاگ گیا اور فوج تتر بتر ہو گئی۔ میر منو نے حالات پر قابو پانے کی بے حد کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجبوراً باقی ماندہ فوج کو ساتھ لے کر شہر پناہ کے اندر داخل ہوا، لیکن اس کی حالت بالکل قابلِ اعتماد نہ رہی تھی۔

میر منو کے لیے یہ سخت آزمائش اور شدید ابتلا کا وقت تھا، اس نے

ہر طرف سے مایوس ہو کر صلح کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع کیا، اور ابدالی کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور اس کے صدرِ اعظم شاہ ولی خاں کی وساطت سے گفتگوئے مصالحت کا آغاز ہوا۔ ابدالی بھی تنگ آچکا تھا اور یہ سب اس کی منشا کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ معمولی سی ابتدائی گفت وشنید کے بعد اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے ایک معتمد امیر جان خاں کو میر منو کے پاس بھیجا کہ اس کو کامل اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کے پاس لائے۔ ابدالی اس وقت شالامار باغ میں مقیم تھا۔ امیر جان خاں میر منو کو اپنے ساتھ لے کر دربار میں داخل ہوا تو بادشاہ نے نہایت اعزاز واحترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، مزاج پُرسی کی اور بہترین الفاظ میں خیر خیریت پوچھی۔ اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے میر منو سے کہا۔

"تم نے ابھی تک اپنے آقا (یعنی میرے) حضور اپنی نیاز مندی کا اظہار کیوں نہیں کیا اور خاص اسی مقصد کے لیے ہمارے دربار میں حاضری نہیں دی؟"

میر منو نے کہا۔ "میرا تعلق دوسرے آقا سے ہے"۔

احمد شاہ ابدالی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ "اس آڑے وقت میں تمہارا آقا تمہاری مدد کے لیے کیوں نہیں آیا"؟

میر منو نے جرأت مندانہ لہجے میں جواب دیا۔ "اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اس کے خادم اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں، کسی کے محتاج نہیں ہیں"۔

اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے میر منو سے پوچھا۔ "فرض کرو، میں اس جنگ میں تمہارے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے؟"

میر منو نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ "میں اسی وقت اعلیٰ حضرت کا سرِ اقدس، جناب کے جسمِ مبارک سے علیحدہ کرتا اور اسے بطور نذر کے

شہنشاہِ دہلی کے حضور پیش کرتا۔"

احمد شاہ نے سوال کیا۔ "اب تم مجھ سے اپنے ساتھ کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"

میر منو نے پہلے سے زیادہ سنجیدہ شکل بنا کر جواب دیا۔ "میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں، اگر آپ قصاب ہیں تو میرا سر قلم کر دیں، اگر بردہ فروش ہیں تو میرا جسم فروخت کر دیں اور اگر بادشاہ ہیں تو مجھے شاہانہ سلوک کا مستحق قرار دیں۔"

میر منو کے اس جواب سے احمد شاہ ابدالی نہایت متاثر ہوا، اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اپنی نشست سے اٹھ کر میر منو سے بغل گیر ہوا اسے فرزند خاں بہادر رستم ہند کا خطاب عطا کیا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ابھی احمد شاہ ابدالی کا قیام لاہور میں تھا کہ عید کا دن آ گیا۔ احمد شاہ کے حکم سے عید کی نماز کا انتظام مسجد وزیر خاں میں کیا گیا، اس کا باقاعدہ اعلان ہوا، اور امرا و وزرا کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں لوگ مسجد میں جمع ہوئے۔ ان دنوں مسجد وزیر خاں کے خطیب یہی مولانا محمد صدیق لاہوری تھے، جن کا اوپر کی سطروں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ متبحر عالم دین اور ایک علمی خاندان کے فاضل جلیل تھے۔ ان کے والد بھی مسجد وزیر خاں کے منصبِ خطابت پر فائز رہ چکے تھے اور سب کے نزدیک قابلِ احترام تھے۔ نماز ختم ہوئی تو مولانا محمد صدیق خطبے کے لیے منبر پر تشریف لائے، خطبہ شروع ہوا، خطبے کے دوران انھوں نے احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کر کے اسے "سلطان العادل" کے لقب سے پکارا۔

اس وقت مولانا شہریار بھی مسجد میں موجود اور نماز میں شریک تھے، وہ عالم گیر علمی شہرت کے مالک تھے، خطیب سے کچھ دور بیٹھے ہوئے تھے۔

اہلِ لاہور کے نزدیک وہ انتہائی قدر و منزلت کے حامل تھے مسجد چینیاں والی میں گزشتہ بلیس پچیس برس سے ان کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جو ہندوستان کے علاوہ، ایران، توران، افغانستان بلخ، بدخشاں اور ترکستان تک پھیلا ہوا تھا اور ان تمام ممالک کے طلبائے علم باقاعدہ ان کی خدمت میں آتے اور شریکِ درس ہوتے تھے۔ خود مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا محمد صدیق لاہوری بھی ان کے شاگرد تھے۔

جب خطبہ ختم ہوا اور مولانا شہر یار اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھے تو کسی نے انھیں بتایا کہ آپ کے شاگرد رشید نے محض خوشامد کی غرض سے احمد شاہ ابدالی کو "سلطان العادل" کہا ہے، حالاں کہ افغانوں کے بے پناہ ظلم سے تمام ملک چیخ اٹھا ہے۔ مولانا شہر یار امام کے قریب پہنچے، احمد شاہ بھی وہاں کھڑا تھا۔ مولانا محمد صدیق نے احتراماً استاد کے ہاتھ چومے اور انتہائی تکریم بجا لائے۔ احمد شاہ نے پوچھا "یہ کون بزرگ ہیں"؟ مولانا محمد صدیق نے کہا "میرے استاد مولانا شہر یار"! وہ آپ کی شہرت و قابلیت سے واقف تھا۔ چنانچہ وہ بھی آداب بجالایا، اور سلام کیا، قدم بوسی کرنا چاہی تو آپ نے منع کر دیا، اور فرمایا "یہ شریعت کے خلاف ہے۔ اس قسم کی حرکت بالکل نہیں کرنی چاہیے۔" پھر اپنے شاگرد سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹا! تم خوب جانتے ہو کہ افغانوں نے اہلِ شہر کو انتہائی پریشان کیا اور ہر قسم کے ظلم کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے ظلم و تشدد کی فریاد کتنی مرتبہ بادشاہ کے حضور کی گئی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی، کیا بادشاہ نے اس کا کوئی ازالہ کیا؟ اپنے ظالم سپاہیوں اور ستم گر سرداروں کو سزا دی؟ انھیں مظلوم شہریوں پر ظلم ڈھانے سے روکا؟ یاد رکھو، اسلام ایسے بادشاہ کو عادل کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

تمام حاضرین مولانا شہر یار کی اس پُر تاثیر تقریر سے کانپ اٹھے احمد شاہ ابدالی نے مولانا کو چپ کرانا چاہا مگر انھوں نے پروا نہ کی، اور اپنی بات مکمل

کر کے رہے۔ آخر بادشاہ نے کہا۔

"حضرت مولانا! آپ کس کے بارے میں اور کس کے سامنے یہ باتیں کر رہے ہیں؟

مولانا شہر یار نے جواب دیا۔ "میں خوب جانتا ہوں کہ میرا مخاطب کون ہے اور میں کس کے سامنے کھڑا یہ باتیں کر رہا ہوں۔"

احمد شاہ نے کہا۔ "اس گفتگو کا انجام بھی آپ کو معلوم ہے؟"

مولانا شہر یار نے کہا۔ "ہاں! شہادت یا جلاوطنی، میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔"

احمد شاہ ابدالی نے غصّے میں آکر آپ کی جلاوطنی کا حکم دیا، اور پھر مولانا شہر یار موضع ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور میں جاکر آباد ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔

۳۸۔ مولانا محمد طاہر عباسی الٰہ آبادی

مولانا محمد طاہر عباسی الٰہ آبادی، عالمِ کبیر، شیخ وقت اور علامۂ زماں تھے اور علم و عمل میں یکتا، فضل و کمال میں منفرد اور درس و افادہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ برصغیر کے معروف عالم دین شیخ محمد یحییٰ عباسی الٰہ آبادی المعروف شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی کے فرزند گرامی قدر اور نامور فاضل مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی کے برادرِ محترم تھے۔ ۱۱۰۰ھ کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے، جو ہندوستان کے صوبہ یو پی کا ایک مشہور شہر ہے۔ تفسیر بیضاوی کے محشّی مفتی جار اللہ حسینی الٰہ آبادی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تعلیم بھی انہی سے پائی۔ یہاں تک کہ تمام علومِ مروّجہ میں ماہر کامل ہوئے اور سب سے فوقیت لے گئے۔ تصنیف و تدریس اور افتا میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ نہایت ذہین، تیز حافظہ اور وسعتِ معلومات کے مالک تھے۔ معقولات و منقولات میں دسترس رکھتے اور مذاہب سلف و خلف سے پوری طرح

آگاہ تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ان کے دو بھائی، مولانا محمد ناصر الہ آبادی اور مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی جن کا شمار برصغیر کے فحول علما میں ہوتا ہے، ان کے شاگرد تھے، مولانا محمد الیسین عثمانی جون پوری بھی ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

سلسلۂ تدریس کے ساتھ ساتھ مولانا محمد طاہر الہ آبادی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب "تحقیق الحق" ہے جو انھوں نے قاضی نور اللہ شستری کی "احقاق الحق" کے جواب میں لکھی۔ قاضی شستری نے یہ کتاب شیخ روزبہان کی "ابطال الباطل" کے رد میں لکھی تھی، اور روزبہان نے اسے مطہر حلی کی "منہج الحق" کی تردید میں تصنیف کیا تھا۔ تحقیق الحق کے علاوہ مولانا محمد طاہر نے ابن العربی کی فصوص الحکم کی شرح سپردِ قلم کی۔ بحث فدک کے بارے میں ایک رسالہ تالیف کیا۔ الشجرۃ القادریہ کی شرح قلم بند کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ثبوت میں ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ تفسیر بیضاوی پر تعلیقات لکھیں، قصیدہ طمطرانیہ کی شرح لکھی اور آیاتِ تطہیر کی تفسیر لکھی۔ بہرحال مولانا محمد طاہر الہ آبادی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے والدِ محترم مولانا محمد یحییٰ الہ آبادی بھی جلیل القدر عالم اور صوفی تھے۔ مولانا محمد طاہر نے سوموار کے دن ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ کو عین عالمِ شباب میں صرف تینتیس سال کی عمر میں وفات پائی اس وقت مولانا محمد یحییٰ زندہ تھے۔ وہ بیٹے سے ٹھیک ایک سال بعد ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ کو فوت ہوئے [۹۴]

۹۴؎ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۵، ۳۲۶ بحوالہ ذیل الوفیات

۳۹۔ مولانا محمد طاہر حسینی شاہ جہان پوری

مولانا محمد طاہر حسینی شاہ جہان پوری، فاضلِ اجل اور شیخ نامدار تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے اور حصولِ علم کے شوق میں مختلف اساتذہ کی خدمت میں حاضری دی، جن میں درسِ نظامیہ کے مرتب مولانا نظام الدین سہالوی لکھنوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ) اور مولانا صبغۃ اللہ خیر آبادی (متوفی ۱۸ ذی قعدہ ۱۱۵۷ھ) کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ سلسلۂ قادریہ کے مطابق مولانا نظام الدین سہالوی سے اخذِ طریقت بھی کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شہر شاہ جہان پور میں مسندِ درس بچھائی اور زندگی بھر درس و افادہ میں مصروف رہے بارھویں صدی ہجری میں یہ اپنے علاقے اور شہر کے جید علما میں گردانے جاتے تھے[۹۵]

۴۰۔ مولانا محمد عابد سنامی لاہوری

مولانا محمد عابد سنامی لاہوری اپنے وقت اور علاقے کے شیخ، عالم کبیر اور مفسر و فقیہ تھے۔ مسلکاً حنفی اور طریقۃً نقشبندی تھے، حضرت ابوبکر صدیق کی نسل سے تھے۔ ولادت اور نشو و نما لاہور میں ہوئی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے اور شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ طویل مدت تک ان سے استفادہ کرتے اور اخذِ علم اور کسبِ معرفت میں مصروف رہے۔ بلند ہمت اور مستقل مزاج اتنے تھے کہ دل میں حج بیت اللہ کے شوق نے کروٹ لی تو لاہور سے پاپیادہ روانہ ہو گئے اور راستے کی

---

۹۵ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۶

تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچ گئے، فریضۂ حج ادا کیا، مدینۂ طیبہ گئے اور پھر عازمِ وطن ہوئے۔

مولانا محمد عابد لاہوری نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے۔ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت کرتے اور شب و روز کا بیشتر وقت وظائف و اوراد اور ذکرِ الٰہی میں گزارتے۔ اس کے ساتھ ہی ہنگامۂ درس بھی جاری رکھتے اور بے شمار لوگ ان سے علمی استفادہ کرتے۔ ان کے حلقۂ درس میں تقریباً دو سو آدمی روزانہ آتے، جو علم و معرفت سے بہرہ مند ہوتے۔ یہ عالمِ دین بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی گہرا ذوق رکھتے تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں تفسیر بیضاوی کے حواشی و تعلیقات (لیکن نامکمل) خلاصۂ کیدانی کی بسیط و مفصل شرح، قصیدۂ بانت سعاد کی شرح، وجوہِ اعجازِ قرآن، رسالہ فی الاربعۃ الاحتیاطیہ بعد صلوٰۃ الجمعہ، العشرۃ المبشرہ، فضائل الامۃ المرحومہ کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

مولانا محمد عابد سنامی لاہوری نے ۱۸ رمضان المبارک ۱۱۶۰ھ کو وفات پائی اور لاہور میں دفن کیے گئے۔[۹۶]

۱۴۔ قاضی محمد عاشق کرانوی

قاضی محمد عاشق بن عبدالواحد بن محمد یعقوب انصاری سہالوی ثم کرانوی اپنے دور کے شیخ اور فقیہ تھے۔ شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے خاندان سے تھے۔ مولد و منشا موضع سہالی ہے، جو لکھنؤ کے نواح میں واقع ہے۔ برِ صغیر کے نامور عالم اور درسِ نظامیہ کے مرتب شیخ نظام الدین انصاری سہالوی،

---

۹۶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۱، ۲۰۲۔ معمولات مظہریہ ص ۱۸ و ۱۴۳ — حدائق الحنفیہ ص ۴۴۴، ۴۴۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ۳۲۶، ۳۲۷

(متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ) کے ہم درس تھے۔ شرح شمسیہ سے لے کر شرح مواقف تک درسی کتابوں میں دونوں ایک دوسرے کے شریکِ درس رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عازمِ دہلی ہوئے اور مغل بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر ۱۱۲۱ھ میں ان کو اعمالِ مظفر نگر کے دو گاؤں کرانہ اور شاملی کے منصبِ قضا پر مامور کیا۔ ان کے علم و فضل کی بنا پر اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے جو اس زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ تھا، انھیں "معین العلما" کا عظیم لقب عطا کیا۔ تمام عمر مسندِ قضا پر متمکن رہے۔ نہایت نیک، پابندِ شرع اور عبادت گزار تھے۔ فرائض قضا بڑی محنت اور مستعدی سے انجام دیتے، اس اہم خدمت کے ساتھ ساتھ درس و افادے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ دور دراز سے تشنگانِ علوم حاضرِ خدمت ہوتے اور اخذِ علم کرتے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۱۳۸ھ میں کرانہ میں وفات پائی[۹۶]

۴۲- سیّد محمد عدل بریلوی

سیّد محمد عدل بن سیّد محمد بن سیّد علم اللہ حسنی بریلوی کا شمار کبار مشائخ نقشبندیہ میں ہوتا ہے۔ اپنے عصر اور علاقے کے شیخ، عارفِ کبیر اور فقیہِ نامدار تھے۔ برصغیر کے جلیل القدر مجاہد حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد میں سے تھے۔ زہد و تقویٰ، ورع و عبادت، ایثار و استغنا، علوِ ہمت، اخلاقِ فاضلہ، لوگوں کی مدد اور اپنے رفقا کی اعانت کے سلسلے میں ان کا مقام بہت بلند تھا اور اس ضمن میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی۔

سیّد محمد عدل یوپی کے مشہور شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما

---

۹۶ مناقب رزاقیہ، انغسان الانساب — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۲۸

پائی تحصیلِ علم اپنے بڑے بھائی سید محمد حکم بریلوی (متوفی ۲۲ شوال ۱۱۵۰ھ) سے کی۔ سید محمد حکم نے صرف اور نحو کے موضوع سے متعلق ان کے لیے کچھ رسالے بھی تصنیف کیے۔ بھائی سے تحصیلِ علم کے بعد والدِ محترم سید محمد حسنی بریلوی (متوفی ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۵۶ھ) سے وابستہ ہو گئے۔ ان سے اخذِ طریقت کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ والد کی وفات کے بعد علاقۂ اودھ کی مشیخت انہی کے حصے میں آئی اور بہت سے علما و مشائخ اور خلقِ کثیر کو مستفید و مستفیض فرمایا۔

سید محمد عدل حسنی بریلوی نے ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۹۲ھ کو بریلی میں وفات پائی اور وہیں اپنے جدِ مکرم سید علم اللہ حسنی کے زاویہ میں دفن کیے گئے۔[۹۸]

۴۳۔ شیخ محمد علی بدایونی

شیخ محمد علی بن محمد نظیف بن عبداللطیف بن محمد شفیع عثمانی بدایونی، اپنے زمانے کے نامور فقہا اور مشاہیر اصحاب فضل و صلاح میں سے تھے۔ ان کے دادا عبداللطیف بدایوں کی اس مسجد کے خطیب تھے، جسے سلطان شمس الدین التمش نے ۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ محمد علی ۱۱۳۴ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کی طرف توجہ کی، کچھ عرصہ تو اپنے شہر کے علما سے اخذِ علم کرتے رہے، بعد ازاں دہلی کا عزم کیا، وہاں قاضی مبارک فاروقی گوپاموی (متوفی ۵ ربیع الاول ۱۱۶۲ھ) کا ہنگامۂ درس جاری تھا، جو اپنے عہد کے بہت بڑے عالم، مدرس اور مصنف تھے، محمد علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ اسی اثنا میں انھوں نے قاضی محمد پناہ جون پوری کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا جو بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم اور معقول و منقول کے ماہر تھے۔ قاضی محمد پناہ جون پوری

---

۹۸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۳۰، ۳۳۱۔ بحوالہ ...

کے ذکر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں نادر شاہ دہلی آیا تو بہت سے علما بھی اس کے ہم رکاب تھے۔ قاضی محمد بناہ نے اس کے سامنے ان علما سے مسئلۂ قتال پر مناظرہ کیا، اور وہ ایک اہم مناظرہ تھا جس میں قاضی ممدوح نے نادر شاہ کے علما کو اپنے علم وفضل کے زور سے لاجواب کر دیا تھا۔ اس موقع پر ان کے کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ معلومات سے متاثر ہو کر نادر شاہ نے انھیں مستعد خاں کا خطاب عطا کیا اور محمد شاہ نے ان کو جون پور کے منصب قضا پر مامور کیا، جس پر یہ عمر بھر متعین رہے۔ بہرحال شیخ محمد علی بدایونی کے یہ استاد بڑے صاحبِ کمال بزرگ تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیخ محمد علی بدایونی شیخ عبداللہ حسینی دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنھیں نیکی اور تقوے کی فراوانی کی وجہ سے اپنے عصر کے ابدال میں شمار کیا جاتا تھا، ان سے انھوں نے اخذِ طریقت کیا اور مستفیض ہوئے۔ بعد ازاں اپنے شہر بدایوں گئے اور تمام تر توجہ درس و افادۂ طلبا میں مبذول کر دی۔ اس اثنا میں بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ شیخ محمد علی بدایونی نے ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۹۹]

۴۴۔ شیخ محمد غوث کاکوروی

شیخ محمد غوث کاکوروی نہایت فاضل آدمی تھے۔ کاکوری کے مردم آفرین خطّے سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحبِ تذکرۃ الانساب نجم الدین خاں کاکوروی کی روایت کے مطابق بہت بلند مرتبے کے مالک تھے، سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ۱۰۵۶ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے

---

۹۹ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۳۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۳

اور علم و عمل کے ماحول، فضل و کمال کی فضا اور تدین و مشیخت کی گود میں پرورش پائی۔ مختلف علوم کی مختصر اور چھوٹی کتابیں شیخ محمد زمان کاکوروی[۱۰] سے پڑھیں اور مطولات کے لیے شیخ ابو اعظ ہرگامی[۱۱] (یکے از مرتبین فتاویٰ عالم گیری) اور شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی[۱۲] کے باب عالی پر دستک دی۔ علم حدیث شیخ محمد یعقوب بنانی لاہوری[۱۳] سے حاصل کیا۔ حصولِ علم کے بعد شیخ محمد غوث کاکوروی نے بادشاہِ ہند اورنگ عالم گیر سے ملاقات کی، ان دنوں علمائے ہند کی ایک جماعت فتاویٰ عالم گیری مرتب کر رہی تھی۔ شیخ محمد غوث چوں کہ علمِ فقہ پر عبور رکھتے تھے اس لیے اورنگ زیب نے ان کو بھی علما کی اس جلیل المرتبت جماعت میں شریک کر لیا اور وہ یہ اہم خدمت انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کا سلسلہ تکمیل کو پہنچا تو بادشاہ نے ان کو علاقہ اودھ میں جزیہ وصول کرنے پر مامور کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ ممدوح نے درس و تدریس اور افادۂ طلبا کا کام بھی بہ دستور جاری رکھا، اس میں بھی وہ نہایت کامیاب تھے، بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ محمد غوث کاکوروی نے ۱۱۱۸ھ میں اس دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھا۔[۱۴]

---

[۱۰] شیخ محمد زمان کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب "برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ"، ص ۳

[۱۱] شیخ ابوالواعظ ہرگامی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۳۰۵ تا ۳۰۸ اور فقہائے ہند جلد چہارم حصہ اوّل ص ۶۱، ۶۲۔

[۱۲] شیخ قطب الدین شہید سہالوی کے حالات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم حصہ اوّل ص ۳۲۲ تا ۳۳۵۔

[۱۳] شیخ محمد یعقوب بنانی لاہوری کے حالات کے لیے دیکھیے برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۳۲۳۔ نیز ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد چہارم حصہ دوم ص ۳۶۳

[۱۴] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۳۹ — برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۳۲۶ تا ۳۲۷

۵۴ شیخ محمد فاخر زائر عباسی الہ آبادی

شیخ محمد فاخر زائر عباسی الہ آبادی کے والدِ ماجد کا اسم گرامی شیخ محمد یحییٰ تھا جو برصغیر کے ممتاز عالم تھے اور شیخ خوب اللہ الہ آبادی کے عرف سے معروف تھے۔ ان کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آرہا ہے۔

شیخ محمد فاخر کی ولادت ۱۱۲۰ھ میں ہوئی۔ مولد و منشا ہندوستان کے صوبہ یوپی کا شہر الہ آباد ہے۔ شعور کی آنکھ کھولی تو گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور پوری فضا تقویٰ و پرہیزگاری سے معمور!

علم و فضل

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے "سرو آزاد" میں شیخ محمد فاخر زائر کا ذکر نہایت محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ زائر کے علم و فضل اور تدین و تقویٰ سے انتہائی متاثر تھے۔ ان کی علمی سرگرمیوں، ان کی تصنیفات، وسعتِ معلومات، ان کے جذبۂ اتباعِ سنت، ان کی مہمان نوازی، ان کی فراخیٔ قلب، کشادہ دستی، ان کے ذوقِ شعری اور ملکۂ ادبیت کا شاندار الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کے فارسی الفاظ جذباتِ عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

شیخ محمد فاخر جن کا تخلص زائر تھا اور شیخ محمد یحییٰ المعروف شاہ خوب اللہ الہ آبادی عباسی کے فرزندِ رشید تھے، عمدہ ترین اوصاف سے متصف اور بلند ترین مناقب سے بہرہ مند تھے۔ ان کی اساسِ فکری بدرجۂ غایت محکم تھی اور وہ کمالاتِ بوقلموں میں مدارجِ علیا پر فائز تھے۔ نیکی میں ولایتِ کبریٰ کے مرتبے کو پہنچے ہوئے، علومِ نقلیہ میں میزانِ عدل اور فنونِ عقلیہ میں برہانِ اصل تھے۔ کمال درجے کے پابندِ شرع، ہمیشہ ہر معاملے میں احکامِ شریعت کو مشعلِ راہ قرار دینے والے، انتہائی کشادہ دست اور شگفتہ مزاج تھے۔ کسی چیز کو بچا کر اور ذخیرہ

بنا کر نہ رکھتے، اپنے بیگانے سب پر بے دریغ احسان کرتے۔ ان کے شب و روز کا زیادہ تر حصہ سفر میں گزرتا اور دورانِ سفر مسافروں کی کثیر تعداد ان کے ہمراہ ہوتی۔ ہر شخص کو سامانِ اکل و شرب خود مہیا فرماتے اور اس کے لباس و پیرہن کی کفالت کرتے۔ جب تک تمام رفقا کے سامنے کھانا نہ آجاتا، دسترخوان پر نہ بیٹھتے۔[۱۰۵]

شیخ محمد فاخر آغازِ عمر ہی میں اپنے والدِ مکرم شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی اور برادرِ اکبر شیخ محمد طاہر الہ آبادی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے۔ تمام کتبِ درسیہ خاص ترتیب اور محنت کے ساتھ پڑھیں اور پھر عین جوانی میں خود مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔ ان کے نانا کا اسمِ گرامی شیخ محمد افضل تھا جو اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم اور صاحبِ کمال فاضل تھے۔ وہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ میں فوت ہوئے۔ انھوں نے وقتِ ولادت ہی سے محمد فاخر کو اپنی آغوشِ تربیت و ارادت میں لے لیا تھا، لیکن نواسے کی پیدائش سے صرف چار سال بعد شیخ محمد افضل کا انتقال ہو گیا، اس لیے پھر وہ ان کے والد شیخ محمد یحییٰ کی تربیت میں دے دیے گئے تاکہ وہ اپنے سایۂ پدری میں بیٹے کی تربیت و تحصیل علم کا خاطر خواہ انتظام کریں اور ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کے نشو و نما کے لیے بہترین اسباب مہیا فرمائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و عمل کی بے پناہ دولت سے مالا مال کیا اور اپنے والدِ گرامی شیخ محمد یحییٰ کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ یہ ان کی عین جوانی کا زمانہ تھا۔

حج بیت اللہ کے لیے مختلف سفر

شیخ محمد فاخر ۱۱۴۹ھ میں عازمِ حرمین شریفین ہوئے اور ۱۱۵۰ھ میں سعادتِ حج حاصل کی۔ اس سال شیخ محمد فاخر کے بعد سید غلام علی آزاد بلگرامی بھی

---

۱۰۵ سروِ آزاد ص ۲۱۸

حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے۔ جب آزاد جہاز سے جدّہ کی بندرگاہ سے اترے تو شیخ ممدوح وہاں موجود تھے، انھوں نے آزاد کا شاندار استقبال کیا اور دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان دونوں کے درمیان پہلے ہی سے بہت اچھے اور مخلصانہ تعلقات تھے اور ایک دوسرے کی انتہائی قدر کرتے تھے۔ دونوں اکٹھے مکہ مکرمہ گئے اور زیارتِ بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی کا ہنگامۂ درسِ حدیث جاری تھا، جس سے عرب و عجم کے بے شمار علما و طلبا مستفید ہو رہے تھے، شیخ محمد فاخر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور طلب حدیث کے لیے اس میں شامل ہو گئے اور خوب استفادہ کیا۔ شیخ محمد حیات سے انھوں نے حدیث کی مروّجہ کتابیں پڑھیں، صحیح بخاری مکمل کی اور صحیح مسلم کا کچھ حصہ پڑھا۔ شیخ محمد حیات نے یکم شعبان ۱۱۵۰ھ کو انھیں سندِ اجازہ سے سرفراز کیا۔ بعد ازاں اسی جہاز سے جس پر آزاد بلگرامی گئے تھے، شیخ محمد فاخر واپس ہندوستان تشریف لائے، ارضِ حجاز سے واپسی پر صحیح مسلم کا ایک نسخہ بھی اپنے ساتھ لائے، جس کی کچھ برس پیشتر ایک نقل کتب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں موجود تھی۔ طباعت و اشاعت کے اس دور میں شاید اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ اس برصغیر میں حدیث کی کسی کتاب کا قلمی نسخہ کسی کے پاس پایا جانا بہت بڑی بات تھی۔

۱۱۵۴ھ میں شیخ محمد فاخر کے دل میں دوسری مرتبہ داعیۂ حج پیدا ہوا، اور وہ الٰہ آباد سے حجاز کی مقدس سرزمین کو روانہ ہوئے۔ اس عہد کے سفر کی صعوبتوں اور راستوں کی طوالت کا اندازہ کیجیے کہ الٰہ آباد سے روانہ ہونے سے کئی ماہ بعد شیخ بندرگاہ سے جہاز میں سوار ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے ہندوستان میں یہ دور بڑا ہی پُر آشوب تھا اور بحرِ ہند کے ساحلی

علاقوں کی بندرگاہوں میں مرہٹوں کے ظلم و ستم کا انتہائی الم ناک سلسلہ جاری تھا، وہ لوگوں کو لوٹتے اور ان پر بے حد مظالم ڈھاتے تھے جس جہاز میں شیخ محمد فاخر سوار تھے، سوئے اتفاق سے وہ بھی مرہٹوں کی گرفت میں آگیا، مرہٹے اس پر حملہ آور ہوئے اور بمبئی کی بندرگاہ میں لے گئے، جہاز میں جتنے لوگ سوار تھے ان کا سامان لوٹ لیا۔ شیخ محمد فاخر کے سامان کی طرف متوجہ ہوئے تو دیگر سامان کے علاوہ ان کے پاس کتابوں کا ایک صندوق بھی تھا، راہزن مرہٹوں نے شیخ کا سامان تو لوٹ لیا، البتہ کتابوں کا صندوق واپس کر دیا اور یہ مہربانی بھی کی کہ اپنی طرف سے سواری کا انتظام کر کے انھیں سورت کی بندرگاہ میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد دوسرا جہاز روانہ ہونے تک شیخ ممدوح سورت ہی میں اقامت گزین رہے۔ کئی مہینوں کے شدید انتظار کے بعد صفر ۱۱۵۶ھ میں جہاز روانہ ہوا۔ لیکن قدرت الٰہی کا فیصلہ دیکھیے کہ بندرگاہِ مخا میں پہنچ کر یہ جہاز تباہ ہوگیا اور دوسرے جہاز کے انتظام تک مجبوراً کئی مہینے اس بندرگاہ میں ٹھہرنا پڑا۔ ان دنوں سمندر کے مدّ و جزر کا اندازہ کر کے کشتیاں چلتیں اور جہاز روانہ ہوتے تھے اور صاف موسم کی آمد تک لوگ بندرگاہوں میں پڑے رہتے تھے۔ خدا خدا کر کے کشتی چلنے کا موسم آیا تو شیخ اس میں سوار ہوئے اور مکہ معظمہ کا قصد فرمایا۔ وہاں سے روانہ ہو کر ۲۲ رمضان ۱۱۵۶ھ کو حرم کعبہ میں داخل ہوئے اور حج بیت اللہ کیا۔ اس سال حج جمعۃ المبارک کو ہوا تھا، جسے عرف عام میں "حجِ اکبر" کہا جاتا ہے۔ تین سال بعد ۱۱۵۹ھ میں ہندوستان کا قصد فرمایا اور بندرگاہ سورت میں اُترے۔ جمادی الاولیٰ ۱۱۵۹ھ میں سورت سے وطن روانہ ہوئے۔ اس عہد کی مشکلاتِ سفر دیکھیے کہ رجب ۱۱۵۹ھ کو شیخ دہلی پہنچے، یعنی سورت سے دہلی تک کا سفر تین مہینے میں طے ہوا۔ میرزا مظہر جانِ جاناں جن کا شمار بارھویں صدی ہجری میں برصغیر کے رفیع القدر علما میں ہوتا تھا ان دنوں دہلی میں فروکش تھے، وہ شیخ ممدوح سے ملے اور نہایت محظوظ ہوئے۔ شیخ کے قیام

دہلی کے زمانے میں ان دونوں کی کئی صحبتیں ہوئیں اور مختلف قسم کے مسائل زیرِ بحث آئے۔

دہلی سے شیخ محمد فاخر اپنے وطن الٰہ آباد پہنچے اور صرف ایک سال وہاں ٹھہرے تھے کہ تیسری مرتبہ دل میں جذبۂ حج بیت اللہ نے پھر انگڑائی لی اور شوال ۱۱۶۰ھ میں الٰہ آباد سے عازم بنگال ہوئے۔ اس مرتبہ وہ بنگال سے جہاز میں سوار ہونا چاہتے تھے۔ الٰہ آباد سے عظیم آباد، پٹنہ اور مرشد آباد وغیرہ بلاد و امصار کو روانہ ہوئے۔ اپنے اوصافِ بوقلموں کی بنا پر وہ دیارِ ہند میں انتہائی اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ راستے میں جن جن شہروں اور علاقوں کے حکام و امرا اور عوام و خواص کو ان کی تشریف آوری کا علم ہوجاتا وہ استقبال کے لیے آتے اور انتہائی عزت و تکریم کا ثبوت بہم پہنچاتے۔ اس طرح ہگلی کی بندرگاہ میں پہنچے اور وہاں سے جہاز پر سوار ہوئے، لیکن جہاز نے ابھی چند ہی روز کا سفر کیا تھا کہ اس کے تختے ٹوٹ گئے اور جہاز بے کار ہوگیا۔ آخر چاٹ گام واپس آئے اور دوسرے جہاز کا انتظار کرنے لگے، چار مہینے چاٹ گام میں مقیم رہے، لیکن موسم کی خرابی کے باعث جہاز روانہ نہ ہوسکا۔ بالآخر واپس الٰہ آباد کو مراجعت فرما ہوئے۔ اثنائے راہ میں جس طرف سے گزر ہوتا لوگ بے حد عقیدت سے پیش آتے۔

اب کی مرتبہ شیخ محمد فاخر تقریباً دو مہینے الٰہ آباد میں مقیم رہے اور چوتھی مرتبہ قصدِ حج فرمایا۔ اس کے لیے انھوں نے دہلی کا عزم کیا اور ۲۵ رمضان ۱۱۶۲ھ کو واردِ دہلی ہوئے۔ چند روز دہلی میں قیام رہا۔ ان دنوں سید غلام علی آزاد بلگرامی دکن میں قیام پذیر تھے اور شیخ محمد فاخر سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ شیخ نے محض ان سے ملاقات کے لیے دہلی سے دکن کا قصد کیا۔ وہ یکم شعبان ۱۱۶۴ھ کو اس مقصد کے لیے دہلی سے روانہ ہوئے اور ۵ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ کو برہان پور پہنچے۔ یعنی دہلی سے برہان پور تک کا سفر چار مہینے میں طے ہوا۔ لیکن آزاد بلگرامی

افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ قسمت نے یاوری نہ کی اور وقت نے مہلت نہ دی کہ دو پرانے دوست ایک دوسرے سے ملاقات کر سکیں۔ شیخ دریائے نربدا عبور کر کے سرسام کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اسی حالت میں برہان پور پہنچے تو مرض نے شدت اختیار کر لی اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ کو یک شنبہ کے روز اشراق کے وقت اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو تشریف لے گئے۔ آزاد بلگرامی کے الفاظ میں "جانِ عزیز را در راہِ بیت اللہ فدا ساخت"۔ تاریخ ولادت جو ۱۱۲۰ھ ہے۔ "خورشید" سے اور تاریخِ وفات "زوالِ خورشید" سے نکلتی ہے۔

شیخ کے متعلق اکابر علما کی رائے

شیخ محمد فاخر نے صرف چوالیس[۴۴] برس عمر پائی۔ آزاد بلگرامی جو ان کے جگری دوست تھے، بدرجہ غایت عمدہ الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ انھیں وہ متقی، پرہیزگار، عبادت گزار، بدرجۂ کمال پابندِ شرع، متبع سنت، خوش مزاج، وسیع القلب، شگفتہ بیان، علومِ عقلیہ و نقلیہ کے ماہر، صاحبِ صفاتِ رضیہ، ولی اللہ، حاملِ میزانِ عدل، پیکرِ جود و سخا، اور محسنِ انسانیت قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کے علمی کمالات اور ذاتی محاسن کی وجہ سے ان کی موت پر نہایت حزن و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

واحسرتا کہ ایں چنیں صاحبِ کمال در ایامِ شباب ازیں عالم رحلت کرد و داغِ مفارقت بر دلِ یاراں گزاشت، سپہرِ دوّار اگر عمر ہا چرخ زند مشکل کہ چنیں ذاتِ قدسی صفات بہم رساند[۱۰۶]

نہایت حسرت و ملال کی بات ہے کہ ان اوصاف کے حامل اور صاحبِ کمال نے عالم

---

[۱۰۶] سروِ آزاد، ص ۲۱۸۔

جوانی میں اس دنیا سے کوچ کیا اور دوستوں کے دل پر داغ جدائی چھوڑا، آسمان اگر تمام عمر گھومتا رہے تو مشکل ہے کہ اس قسم کا قدسی صفات شخص پیدا ہو۔

میرزا مظہر جان جاناں بارھویں صدی ہجری کی عظیم شخصیت اور شیخ محمد فاخر کے معاصر تھے، وہ شیخ کی انتہائی تعظیم کرتے تھے۔ وسعتِ علم اور کشادگیِ فکر و نظر کے باوجود وہ ایک گوشہ گیر بزرگ تھے، کسی کے ہاں آمد و رفت نہ رکھتے تھے، لیکن شیخ محمد فاخر کے پاس ضرور جاتے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

میرزا خلافِ وضعِ خود بملاقاتِ شیخ محمد فاخر اکثر می رسد ۱۰۷؎

میرزا مظہر جان جاناں اپنی عادت کے خلاف، اکثر شیخ محمد فاخر کی ملاقات کو جاتے۔

وہ شیخ کے علم و فضل اور اتباعِ سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بسیارے از کبرائے دین را مشاہدہ نمودم، بعد از یازدہ صد سال یک شخص کہ عبارت از شیخ محمد فاخر باشد موافقِ کتاب و سنت دریافتم ۱۰۸؎

بہت سے اکابرِ دین کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، مگر گیارہ سو سال کے بعد صرف ایک شخص کو جس کا نام شیخ محمد فاخر ہے قرآن و حدیث کے موافق پایا۔

وہ یہ بھی فرماتے ہیں:

بسیار اربابِ کمال را برخوردم، آں قدر کہ نزد شیخ محمد فاخر ارزاں شدم ہیچ جا اتفاق نیفتاد ۱۰۹؎

یعنی بہت سے اہل کمال کو آزما دیکھا، لیکن جو چیز شیخ محمد فاخر کے پاس وافر مقدار میں حاصل ہوئی وہ کسی دوسری جگہ نہ مل سکی۔

۱۰۷؎ سروِ آزاد ص ۲۱۸   ۱۰۸؎ ایضاً
۱۰۹؎ ایضاً

نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

شیخ محمد فاخر اگرچہ در جمیع فنون و تمام علوم ید بیضا داشت و علم سبقت بر سابقین می افراشت لیکن علم حدیث بروے بحدے غالب آمدہ کہ گویا غیر آں را آشنا نہ بودہ است۔ غالب تصانیف او در انتصار سنت است و مختار اہل حدیث و رد بدعت و اہل اوست [۱۱۰]

شیخ محمد فاخر یوں تو تمام علوم و فنون میں کامل دسترس رکھتے تھے اور اپنے سے پہلے اہل علم کے مقابلے میں ان کے معلومات کا جھنڈا سب سے اونچا تھا، لیکن خصوصیت کے ساتھ علم حدیث تو ان پر اس قدر غالب تھا کہ گویا اس کے علاوہ انھیں کسی چیز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ ان کی زیادہ تر تصانیف سنت محمدیہ کی تائید اور مسائل اہل حدیث کی وضاحت اور اہل بدعت کی تردید میں ہیں۔

دوسری جگہ نواب صاحب لکھتے ہیں :

وے رحمہ اللہ تعالیٰ امام ائمہ متبعین سنت سرزمین ہند و شیخ الشیوخ اکابر علمائے ارجمند، ظاہرش محدث بود و باطنش صوفی [۱۱۱]

یعنی شیخ محمد فاخر رحمۃ اللہ علیہ کو سرزمین ہند میں ائمہ متبعین سنت کے امام کی حیثیت حاصل تھی اور اکابر علمائے مشاہیر میں ان کا درجہ شیخ الشیوخ کا تھا، وہ ظاہر میں محدث اور باطن میں صوفی تھے۔

شاہ غلام علی نے مقامات مظہریہ میں ان کو کبار علمائے حدیث میں شمار کیا ہے [۱۱۲]

---

[۱۱۰] اتحاف النبلاء ص ۴۰۶

[۱۱۱] تقصار، ص ۱۱۵ [۱۱۲] ایضاً

مولوی رحمان علی نے شاندار الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

شاہ محمد فاخر الہ آبادی زائر تخلص بن شاہ خوب اللہ الہ آبادی جامع علوم ظاہر و باطن بود۔ اکتساب علوم ظاہر بخدمت برادرِ کلان خود شیخ محمد طاہر کردہ، حق سبحانہ تعالیٰ شانہٗ اورا شانِ عظیم دادہ بود، بعمر بست و یک سالگی بجائے پدر بزرگوار وسادہ آرائے خلافت شدہ [۱۱۳]

شاہ محمد فاخر الہ آبادی جن کا تخلص زائر تھا، شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے بیٹے تھے، ظاہری و باطنی علوم میں پوری جامعیت کے مالک تھے۔ انھوں نے علوم ظاہری اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے حاصل کیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شانِ عظمت سے نوازا تھا، اکیس برس کی عمر میں اپنے جلیل القدر باپ کی جگہ وسادۂ خلافت پر متمکن ہو گئے تھے۔

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کا ذکر کرتے ہوئے بڑے عمدہ الفاظ استعمال کیے ہیں، انھوں نے "الشیخ العالم الکبیر المحدث محمد فاخر..." کے الفاظ سے ان کے تذکرے کا آغاز کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

وکان فرید زمانه فی الاقبال علی الله والاشتغال بالعبادة و المعاملة الربانية، قد غشيه نور الايمان وسيماء الصالحين، انتهى اليه الورع وحسن السمت والتواضع والاشتغال بخاصة النفس واتفق الناس على الثناء عليه والمدح لشمائله وصار مشارا اليه فى هذا الباب وكان لا يتقيد بمذهب ولا يقلد فى شئ من امور دينية بل كان يعمل بنصوص الكتاب والسنة ويجتهد برأيه وهو اهل لذلك [۱۱۴]

---

[۱۱۳] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶ [۱۱۴] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۱۱

وہ (شیخ محمد فاخر) رجوع الی اللہ، اشتغال بالعبادۃ اور امورِ ربانی میں یکتائے دوران تھے۔ ان کو نورِ ایمانی اور عاداتِ نیکو کاراں نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا، ورع و تقویٰ، حسن عادات، انکسار و تواضع اور خدمتِ خلق کا سلسلہ ان پر ختم ہو گیا۔ سب لوگ ان کے خصائل کے مداح اور ان کے حسنِ اطوار کے معترف تھے۔ اس باب میں ان کی شخصیت خاص اہمیت کی حامل تھی، وہ کسی ایک فقہی مذہب کے پابند نہ تھے، بلکہ کتاب و سنت کے نصوص کو مدارِ عمل ٹھہراتے اور اجتہاد کرتے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے علم و فضل اور کثرتِ معلومات کی بنا پر وہ اجتہاد کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملاقات

شیخ محمد فاخر جب (غالباً) پہلی مرتبہ دہلی میں رونق افروز ہوئے تو انھیں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں نماز پڑھی تو آمین بالجہر پکاری، ان لوگوں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی اور وہ شیخ کے مرتبۂ علم و فضل سے بھی واقف نہ تھے۔ نماز میں آمین بالجہر کی آواز ان کے پردۂ سماع سے ٹکرائی تو سخت حیران ہوئے، نماز کے بعد شیخ کو گھیر لیا اور مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے۔ شیخ نے ہر چند حدیث کا حوالہ دے کر انھیں اپنی بات سمجھانے اور مطابقِ سنت ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر کسی نے ایک نہ مانی اور بدستور بحث کرتے رہے۔ آخر شیخ نے فرمایا کہ میری بات تم نہیں مانتے تو مجھے اپنے شہر کے کسی عالم کے پاس لے چلو، ان سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ وہ لوگ آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ کے پاس لے گئے اور ساری بات ان کے گوش گزار کی۔ شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی حدیث سے آمین بالجہر پکارنا ثابت ہے۔ شاہ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر لوگ چلے گئے اور بھیڑ چھٹ گئی، شیخ محمد فاخر اور شاہ ولی اللہ دونوں رہ گئے۔ موقع پا کر شیخ محمد فاخر نے شاہ صاحب سے

کہا۔ "آپ کھلتے کیوں نہیں؟" شاہ صاحب نے جواب دیا۔ "اگر کھل جاتا تو آج آپ کو کیسے بچاتا۔" [۱۱۵]

قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ محمد فاخر الہ آبادی کے درمیان یہ پہلی ملاقات تھی، اس سے قبل غائبانہ طور پر تو ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے، لیکن ملاقات کا موقع میسر نہ آیا تھا۔ ملاقات ہوئی تو دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے اور لوگوں کے جانے کے بعد قریب سے ایک دوسرے کے افکار و تصورات کو سمجھنے اور باہم کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

تصانیف

شیخ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی تمام تصانیف سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انتصار و حمایت اور بدعات و اہل بدعت کے رد میں ہیں۔ بارھویں صدی ہجری میں ان کا شمار برصغیر کے ان علمائے عظام میں ہوتا ہے، جو مسلکاً اہل حدیث اور قول و عمل میں متبع کتاب و سنت اور اس کے زوردار مبلغ تھے۔ شیخ محمد فاخر ایک فارسی شعر میں اپنے مسلک کا اظہار صاف الفاظ میں کرتے ہیں:

ما اہل حدیثیم دغا را نہ شناسیم ۔۔۔ صد شکر کہ در مذہب ما حیلہ و فن نیست

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ مجموعۂ نور السنۃ و قرۃ العینین در اثبات سُنّیت رفع الیدین: یہ حضرت شیخ کی دو کتابوں کا مجموعہ ہے اور فارسی نظم میں ہے۔ دونوں کتابوں کا یہ مجموعہ نماز اور اس کے متعلقہ مسائل پر مشتمل ہے شعر کی زبان میں یہ مسائل نہایت عمدہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں اور ان کا اصل ماخذ کتاب و سنت ہے۔

---

[۱۱۵] تراجم علمائے حدیث ہند، جلد اوّل، ص ۳۹۔

نور السنۃ در حقیقت شیخ مجد الدین فیروز آبادی کی مشہور کتاب "سفر السعادۃ" کا مختصر اور منظوم ترجمہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سنت کے مطابق نماز ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوئی تھی، پھر نایاب ہوگئی۔ اس کے بعد ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں جمعیۃ اہل حدیث گوجرانوالہ نے شائع کی۔ ابتدا میں "تذکار فاخر" کے عنوان سے حضرت مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے حضرت شیخ کے مختصر حالات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ کتاب چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی "مثنوی قرۃ العین در اثبات سنیّۃ رفع الیدین" ہے۔ یہ بھی شیخ محمد فاخر کی منظوم تصنیف ہے۔ اس میں رفع الیدین کے مسئلے پر تحقیق کی گئی ہے اور حدیث کی رُو سے یہ مسئلہ بہ دلائل ثابت کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اکتیس (۳۱) صفحات کو محیط ہے۔ دونوں کتابوں کے مجموعے کے صفحات مسلسل درج کیے گئے ہیں۔ کل صفحات ۷۱ ہیں اور اسے گوجرانوالہ کی جمعیۃ اہل حدیث نے شائع کیا ہے۔

۲۔ رسالہ نجاتیہ: یہ رسالہ عقائد کے بارے میں ہے اور نواب سیّد محمد صدیق حسن خاں (متوفی ۱۳۰۷ھ) کے ضروری اضافوں کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔ اصل رسالہ فارسی میں ہے۔ مولانا حافظ محمد اسحاق (شیخ الحدیث دار العلوم تقویۃ الاسلام، لاہور) نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور یہ جمعیۃ اہل حدیث لاہور کی طرف سے اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ ساتھ ہی فارسی متن دیا گیا ہے۔ شروع میں فاضل مترجم نے شیخ کے ضروری حالات بیان کیے ہیں۔ یہ رسالہ ۵۶ صفحات کو محتوی ہے۔

۳۔ مثنوی در تعریف علم حدیث: شیخ کی یہ مثنوی علم حدیث کی تعریف میں ہے۔

۴۔ دیوان فارسی: یہ شیخ کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس دیوان میں حدیث کو رائے اور قیاس پر ترجیح دی گئی ہے۔ بدعات کے ترک اور سنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ عقائد میں متکلمین اور معقولیوں کی روش کو اپنانے سے منع فرمایا گیا ہے اور ان عقائد کے اخذ و قبول کی ترغیب دی گئی ہے جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں۔ ان اشعار میں خالص دینی مسائل بیان کیے گئے ہیں اور شاعرانہ نقطہ نگاہ سے بھی ان کا درجہ بڑا بلند ہے۔

شعر و شاعری

شیخ محمد فاخر بو قلموں اوصاف کے حامل اور گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے جگری دوست سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کے ذوقِ شعری کی بڑی تعریف کی ہے۔ نواب محمد صدیق حسین خاں نے بھی ان کے چند اشعار اپنی مشہور تصنیف "اتحاف النبلا" میں نقل کیے ہیں اور انھیں بہترین شاعر قرار دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

ببارغِ عاشقی از میوہ و گل نیست سامانے ۔۔۔ کنم بادام و نرگس را فدائے چشم گریانے

دارم دلے کہ بر دم تیغ ست راہِ او ۔۔۔ مژگانِ چشم یار بود سبزہ گاہِ او

بر میان بر زدہ دامان زِ کجا می آئی ۔۔۔ مرحبا اگر بشکارِ دلِ ما می آئی

حُبِّ دنیا می فریبد خاطرِ افسردہ را ۔۔۔ گوشمالی می دہد روباہ شیرِ مردہ را

مرا از آمد و رفتِ نفس روشن شد ایں معنی ۔۔۔ کہ اقبالِ جہاں در دم زدن ادبار می گردد

آئینہ با صفائے رخت رو گرفتہ است ۔۔۔ گل پیش آں دہن دہن بُو گرفتہ است

کنند گور پرستاں زیارت زاہد | کہ زیرِ گنبدِ دستار زندہ در گور ست

تا پیر و چار یار اخیار نہٗ | از چار اصولِ دیں خبردار نہٗ
در طبعِ تو ایں چار عنصر باہم | تا ہست باعتدال بیمار نہٗ

بقولِ مصطفےٰ زآئر ز رائے دیگراں ہا ندم | شہود یار مانع گردد از اغیار عاشق را

زآئر ز رائے قوم مرا نیست بہرۂ | علمِ حدیث کرد ز خود بے خبر مرا

زآئر از کشکولِ اہلِ رائے نتواں لقمہ خورد | بر سرِ خوانِ رسول اللہ مہمانیم ما

جز شرعۂ سنت نرود جانبِ جنت | زآئر بکجا رائے برد اہلِ جہاں را

از احادیثِ رسول آوردہ ام اسرارِ دِیْن | نیست غیر از گوہر شہوار در دکانِ ما

زآئرہ ہمہ علم و عملِ او ز حدیث است | بیچارہ جز یں خانہ دگر ہیچ ندارد

بہر حال شیخ محمد فاخر زآئر جو بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم مفسر، محدث اور فقیہ تھے، بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار توحید الٰہی، اتباعِ سنت اور عمل بالحدیث کے موضوع پر مشتمل ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا کمال ہے کہ کاروانِ فکر و خیال برابر جادۂ مستقیم پہ قائم رہا ہے، کسی مقام اور موقع پر ذرہ بھی ادھر ادھر قدم نہیں رکھا۔

وصیت اور تدفین

شیخ محمد فاخر کو ارضِ حجاز میمنت طراز سے انتہائی محبت اور بے حد تعلقِ خا

تھا۔ وہ ایک حج سے واپس آنے کے فوراً بعد دوسرے کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ اس سفر میں ان کو بے شک کتنی ہی تکلیف پہنچتی، اس کی کوئی پروا نہ کرتے۔ ان کی موت بھی اسی سفر کے دوران ہوئی، وہ چوتھے حج کے لیے جارہے تھے کہ برہان پور پہنچ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ برہان پور میں بہت سے بزرگانِ دین اور مشائخ کرام مدفون ہیں، ان میں ایک نامور بزرگ شیخ عبداللطیف ہیں۔ شیخ محمد فاخر نے وفات کے وقت وصیت کی کہ انھیں شیخ عبداللطیف کی قبر کے جوار میں دفن کیا جائے، کیوں کہ وہ بہت پابندِ شریعت بزرگ تھے اور ان کی قبر پر بدعات کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ غلام علی آزاد بلگرامی ان کی اس وصیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

در حالتِ مرض وصیت کرد کہ از مشائخ برہان پور شیخ عبداللطیف قدس سرہٗ در کمال تشرع بودند و بر مرقد مبارک ایشاں بدعت ہائے اہلِ زماں بعمل می آید، مرا در جوارِ ایشاں دفن سازند، موافق وصیت بعمل آوردند[۱۱۶]

حالتِ مرض میں انھوں (شیخ محمد فاخر) نے وصیت کی کہ مشائخ برہان پور میں شیخ عبداللطیف قدس سرہٗ حد درجہ پابند شریعت بزرگ تھے اور ان کا مرقدِ مبارک لوگوں کے ارتکاب بدعت سے محفوظ ہے، مجھے ان کی قبر کے نزدیک دفن کیا جائے، چنانچہ ان کی اس وصیت پر عمل کیا گیا۔

اولاد

شیخ زائر کے دو بیٹے تھے۔ ایک شاہ قطب الدین تھے، جن کا انتقال مکہ معظمہ میں ۱۱۸۷ھ یا ۱۱۸۸ھ کو ہوا۔ دوسرے شاہ محمد اجمل تھے، جو اپنے آباد اجداد کے وسادۂ خلافت پر متمکن تھے اور الٰہ آباد میں ان کا دائرہ بہت مشہور تھا۔ انھوں نے ۱۲۳۶ھ میں وفات پائی۔

---

[۱۱۶] سروِ آزاد ص ۲۲۰

تلامذہ

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی کے تلامذہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات کا بھی ایک خاص حلقہ تھا۔ اپنے والد گرامی کی وفات کے بعد الہ آباد میں عین جوانی میں انھوں نے مسندِ درس و افادہ آراستہ کر لی تھی۔ پھر ان کا سلسلۂ سفر بھی جاری رہتا تھا، جس میں عقیدت مندوں کی کثیر تعداد ان کے ہم عنان ہوتی تھی جنھیں وہ رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ سے بہرہ مند کرتے تھے۔ اس لیے یہ حقیقت ہے کہ ان کے تلامذہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ملک کے ہر حلقۂ فکر اور طبقۂ خیال کے لوگ ان کی انتہائی تعظیم کرتے تھے، جس طرف کو جاتے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے استقبال کو آتے اور ان سے استفادہ و استفاضہ کرتے۔ وفورِ علم اور تقویٰ و تدین میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

۴۶۔ مولانا محمد فاضل سورتی

مولانا محمد فاضل کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد فاضل بن محمد حامد بن عبدالمجید بن احمد بن صالح عبیدی حجازی یزدی ثم ہندی سورتی۔ ان کے آبا و اجداد سرزمین حجاز کے رہنے والے تھے اور قبیلۂ بنی عبید سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد ازاں ان میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے اور گجرات کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔ مولانا محمد فاضل کی ولادت اور نشو و نما گجرات ہی میں ہوئی۔ بڑے ہوئے تو اس زمانے کے جلیل القدر عالم شیخ زین العابدین احمد آبادی (متوفی ۱۱۱۳ھ) سے اخذِ علم کیا اور علومِ مروجہ میں مہارت حاصل کی۔

مولانا محمد فاضل کا اصل پیشہ تجارت تھا۔ ان کا تجارتی سلسلہ اتنا وسیع تھا کہ لوگ انھیں "ملک التجار" کہتے تھے اور اللہ نے مال و دولت کثرت

سے عطا فرمایا تھا۔

تجارت کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق سے بھی پورا تعلق رکھتے تھے اور تصنیف و تالیف کا بھی صاف ستھرا ذوق تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:

نصیحۃ الصغار، ھدایۃ المسلمین، حزب المحزوب، معین الفضائل فی شرح الشمائل، شرح دلائل الخیرات، حاشیہ الدرر۔ یہ کتاب فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔

نہایت عابد و زاہد اور عالم باعمل تھے۔ ارضِ حجاز میں گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ پھر جب ہندوستان واپس آئے تو پہلے کچھ عرصہ شہر سورت میں ٹھہرے، پھر وہاں سے احمد آباد کو روانہ ہو گئے۔ احمد آباد میں ان کے بیٹے تھے اور وہ بیٹوں کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن راستے ہی میں لوگوں نے ان کو قتل کر دیا۔ یہ حادثہ ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ کو پیش آیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف پینتالیس برس تھی[۱۷۱]۔

۴۷۔ سیّد محمد فیض بلگرامی

سیّد محمد فیض حسینی واسطی بلگرامی کا مولد و منشا بلگرام ہے۔ سیّد اسماعیل بلگرامی سے اخذِ علم کیا، کتبِ حدیث سیّد مبارک حسینی بلگرامی سے پڑھیں اور حدیث و فقہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ میر سید عبدالجلیل بلگرامی سے بھی فیض حاصل کیا۔ سیّد محمد فیض بلگرامی اور میر سیّد عبدالجلیل بلگرامی کے درمیان انتہائی مخلصانہ تعلقات قائم تھے۔ سیّد محمد فیض بلگرامی کے تصنیفی کارناموں میں شمائل ترمذی اور حصن حصین کا فارسی ترجمہ ہے۔ بلگرام کے اس جلیل القدر عالم دین نے

---

[۱۷۱] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۴۱ ۳، ۲ ۴ ۳ بحوالہ حدیقۂ احمدیہ

سنہ ساٹھ سال کی عمر پا کر ۱۱۳۰ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔[۱۱۸]

۴۸- شیخ محمد محسن دہلوی

بارھویں صدی ہجری میں برِصغیر میں محمد محسن نام کے تین بزرگ اپنے فیض و کمال کی وجہ سے بہت مشہور تھے جو منقولات و معقولات میں مہارت اور حدیث و فقہ میں پوری دسترس رکھتے تھے، ان میں سے ایک کا تعلق دہلی سے تھا اور دو کا سرزمین کشمیر سے۔ ذیل میں ان تینوں کا ترجمہ درج ہے۔

شیخ محمد محسن دہلوی کی جائے ولادت و تربیت دہلی ہے۔ ہندوستان کے ممتاز عالم حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ طریقتاً مجددی نقشبندی اور مسلکاً حنفی تھے۔ اپنے دور کے نامور عالم و فقیہ اور جامع معقول و منقول تھے۔ حضرت مجددؒ الف ثانی کے جلیل القدر فرزند شیخ محمد معصوم سرہندی سے اخذِ فیض کیا اور کافی عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔

دہلی کے اس عالم و فقیہ سے خلق کثیر نے استفادہ کیا، جن میں شیخ نور محمد بدایونی (متوفی ۱۱ ذی قعدہ ۱۱۳۵ھ) کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ شیخ محمد محسن دہلوی ۱۱۴۷ھ میں فوت ہوئے۔[۱۱۹]

۴۹- مولانا محمد محسن کشو کشمیری

مولانا محمد محسن کشو کشمیری اپنے عہد اور علاقۂ کشمیر کے شیوخ و فضلا

---

۱۱۸ مآثر الکرام ص ۲۳۵، ۲۳۶ — نزہۃ الخواطر، ج ٦ ص ۲۴۴

۱۱۹ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۶٦ تا ۴٦٦ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۲ — حدائق الحنفیہ ص ۴۴۰ — تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳٦ — نزہۃ الخواطر، ج ٦ ص ۳۴٦

اور کبار علما میں سے تھے۔ معقولات ومنقولات پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ مولانا محمد امین حنفی کشمیری (متوفی ۲۷ رمضان ۱۱۰۹ھ) کے شاگرد تھے۔ بڑے محقق اور دقیق النظر عالم تھے۔ دین داری اور فضل وکمال میں بڑی شہرت پائی۔ بہت سے علما و طلبا نے جو بعد میں خود تدریس کی مسند پر فائز ہوئے، ان سے کسبِ علم کیا۔ تصنیف وتالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ کئی درسی کتابوں پر حواشی وتعلیقات سپردِ قلم کیے، جن میں فقہ کی شہرۂ آفاق کتاب ہدایہ اور معانی وبیان کی مشہور کتاب مطوّل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ نیز شرح عقائد عضدیہ پر حاشیہ لکھا۔ علاوہ ازیں المواہب العلیہ اور نجاۃ المومنین کے نام سے دو کتابیں تصنیف کیں۔

مولانا محمد محسن کشو کشمیری نے ۱۱۱۹ھ میں رحلت فرمائی۔[۱۲۰]

۵۰۔ مولانا محمد محسن کشمیری

بارھویں صدی ہجری کے دیارِ کشمیر میں محمد محسن نام کے دو عالم دین ہو گزرے ہیں۔ ایک وہ جن کا اوپر کی سطور میں ذکر ہوا، اور وہ ہیں مولانا محمد محسن کشو کشمیری (متوفی ۱۱۱۹ھ)۔ دوسرے مولانا محمد محسن کشمیری وہ تھے، جن کا ترجمہ زیرِ نظر سطور میں دیا جا رہا ہے۔ یہ نامور بزرگ اور خطۂ کشمیر کے جید عالم مولانا امان اللہ شہید (شہادت ۱۱۵۱ھ) کے شاگردِ رشید تھے۔ علاقۂ کشمیر کے شیخ وفاضل اور مشہور فقیہ تھے۔ مسلک کے لحاظ سے حنفی اور فقہ واصول کے ماہر تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ تحریر وکتابت میں بہت تیز اور خوشخط تھے۔ انھوں نے صحیح بخاری، تفسیر بیضاوی، مشکوۃ المصابیح، ہدایہ اور بہت سی

۱۲۰ے تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۶ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۲ — حدائق الحنفیہ ص ۴۳۲ — نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۴۷

دیگر کتابوں کی اپنے ہاتھ سے کتابت کی۔ اس زمانے میں طباعت واشاعت کا فن تو معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا، کتاب محفوظ کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا، اور یہ بہت معززانہ کاروبار بھی تھا۔

مولانا محمد محسن کشمیری نے درس و تدریس میں بھی بڑا نام پیدا کیا، اور عمر بھر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان سے علاقۂ کشمیر کے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا، جن میں شیخ رحمت اللہ کشمیری (متوفی ۱۱۶۳ھ) قاضی مراد الدین کشمیری (متوفی ۱۱۶۰ھ) اور ملا عبدالستار کشمیری کے نام خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ مولانا محمد محسن کشمیری نے جمادی الاخریٰ ۱۱۸۱ھ میں رحلت فرمائی۔[۱۲۱]

۵۱- مولانا محمد مراد لاہوری

مولانا محمد مراد لاہوری نواحِ لاہور کے جیّد عالم دین مفتی عبدالسلام لاہوری کے لائق فرزند تھے۔ بارھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی المسلک فاضل اور فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ ولادت و تربیت لاہور میں ہوئی اور اپنے والدِ مکرم مفتی عبدالسلام لاہوری سے کسب علم کیا۔ تصوّف و طریقت کی طرف رجحان ہوا تو بحرِ زخار کی روایت کے مطابق شیخ شاہ محمد بدخشی کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے اخذِ طریقت کیا اور مدت تک ان سے متسلک رہے۔

مولانا محمد مراد کے حالات میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بڑا لڑکا محمد معظم ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) میں شاہ عالم بہادر شاہ (اوّل) کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اس کا

---

[۱۲۱] تاریخِ کشمیر اعظمی ص ۱۷۱ — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۴۷ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹

رجحان شیعیت کی طرف تھا۔ اس نے ملک بھر کی مساجد کے خطیبوں کے نام حکم جاری کیا کہ خطبۂ جمعہ اور عیدین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر میں ان کے نام کے ساتھ "علی ولی اللہ و وصی رسول اللہ" کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔ ملک میں بادشاہ کے اس فرمان کی شدید مخالفت ہوئی، لاہور میں بھی اس کے خلاف سخت ردِّ عمل ہوا، اور علما اور عوام نے بادشاہ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے مولانا محمد مراد لاہوری اور مولانا یار محمد لاہوری کو اس مسئلے پر بحث کے لیے تسبیح خانہ میں طلب کیا۔ ان حضرات نے شریعت کی روشنی میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ بادشاہ نے ان کے دلائل سن کر اور عوام کی برہمی اور علما کی مخالفت سے خوف زدہ ہو کر اپنا حکم واپس لے لیا، لیکن اس کے باوجود احتجاج کے لیے شاہی مسجد میں بہت بڑے ہجوم کی شکل میں لوگ جمع ہو گئے۔ بادشاہ کو اطلاع پہنچی تو اس نے نہایت خفگی کا اظہار کیا، اور لاہور کے تین جلیل القدر علما ــــ مولانا محمد مراد، مولانا یار محمد اور مولانا جان محمد ــــ کو گرفتار کر کے قلعے میں محبوس کر دیا۔ ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انھوں نے حکومت کے خلاف عوام کو فتنہ و فساد کے لیے برانگیختہ کیا ہے ــــ خافی خاں نے منتخب اللباب میں یہ واقعہ ۱۱۲۱ھ کے حوادث و واقعات کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد مراد لاہوری بارھویں صدی ہجری کے جیّد عالم و فقیہ تھے، افسوس ہے ان کی تاریخ ولادت و وفات اور دیگر حالات کا علم نہیں ہو سکا[۱۲۲]۔

۵۲- مولانا محمد مراد کشمیری

مولانا محمد مراد کشمیری مسلکاً شیعہ تھے اور وادیٔ کشمیر کے نامور شیوخ

---

[۱۲۲] منتخب اللباب ج ۲، ص ۶۸۱، ۶۸۲- نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۸، ۳۴۹

اور فضلا میں سے گردانے جاتے تھے۔ مشہور شیعی عالم حر عاملی کے شاگرد تھے شیعی فقہ پر عبور رکھتے تھے۔ معروف محشی اور مصنف تھے۔ انھوں نے شیعہ مذہب کی ایک اہم کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" پر حاشیہ لکھا۔ اپنے استادِ محترم حر عاملی کی تصنیف "بدایۃ الہدایہ" کی مبسوط شرح سپردِ قلم کی۔ یہ شرح حر عاملی کے حکم سے لکھی اور اس کا نام "الدلیل الساطع" رکھا۔ "بدایۃ الہدایہ" کی ایک مختصر شرح بھی لکھی، جس کو "النور الساطع" کے نام سے موسوم کیا۔[۱۲۳]

۵۳۔ مولانا محمد مراد سندھی

مولانا محمد مراد سندھی کبار علمائے حنفیہ میں سے تھے۔ اپنے وقت کے فاضل فقیہ ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے شہر کے منصب قضا پر مامور کر دیا گیا تھا۔ نہایت نیک اور متدین عالم تھے۔ ہمیشہ وعظ و تذکیر اور درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ آخر عمر میں ارضِ حجاز گئے، اور جدّے میں اس زمانے کے ایک وزیر ریحان سے ملاقات ہوئی، وہ ان کے فضل و کمال سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہو گیا۔ ریحان نے ان کے لیے جدّے میں ایک رباط، ایک مسجد اور ایک مکان تعمیر کرایا۔

مولانا محمد مراد سندھی ورع و تقویٰ کے اونچے مقام پر فائز تھے، اور صاحبِ عزیمت بزرگ تھے۔ قرآن، حدیث اور فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کی یہ تصنیف کتاب و سنت اور فقہ کے نقطۂ نظر سے بہت سے مسائل کو محیط ہے۔ انھوں نے جدّے ہی میں وفات پائی۔ ان کے سنِ وفات کا پتا تو

---

۱۲۳ نجوم السما — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۴۹، ۳۵۰

نہیں چل سکا۔ البتہ شیخ رفیع الدین مراد آبادی نے اپنی کتاب "الرحلہ" میں ان کا ذکر کیا ہے۔

شیخ رفیع الدین مراد آبادی ۱۲۰۱ھ میں حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین گئے تھے اور مولانا محمد مراد سندھی ان کے وہاں جانے سے قبل انتقال کر چکے تھے۔[۱۲۴]

۵۴۔ شیخ محمد مراد رفیقی کشمیری

شیخ محمد مراد رفیقی بارھویں صدی ہجری میں وادیِ کشمیر کے جید علما میں سے تھے۔ اپنے علاقے کے فضلائے وقت سے مستفید ہوئے اور علوم ظاہری و باطنی میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ علوم منقولہ بالخصوص حدیث اور فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ کتابوں کے انتہائی شائق تھے اور بہت سی کتابیں ان کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ مطالعۂ کتب اور صحبتِ اہل علم و کمال کے سوا انھیں کسی چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ورع و تقویٰ میں بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ مخلص اور باکباز اہل علم تھے۔ عین جوانی میں وفات پائی اور کم عمر اولاد چھوڑ کر عالمِ آخرت کی راہ لی۔[۱۲۵]

۵۵۔ مولانا محمد معصوم جائسی

مولانا محمد معصوم جائسی کے والد کا اسمِ گرامی نظام الدین تھا۔ بارھویں صدی ہجری کے نامور شیخ، بلند مرتبہ عالم، ممتاز فقیہ اور معروف اصولی تھے، علوم عربیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ فقہی لحاظ سے حنفی المسلک تھے۔ کئی مفید اور

---

۱۲۴ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۵۰

۱۲۵ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۴

عمدہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک تصنیف "الفصول المعصومیہ" ہے جو عربی زبان میں فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے تلمیذِ رشید قاضی نعمت اللہ کے لیے تصنیف کی تھی۔ اس کے شروع میں یہ الفاظ درج ہیں:

لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک۔

الفصول المعصومیہ، ۳۷ مہتم بالشان فصول کو محتوی ہے۔ یہ فصول ابواب القضاء، دعویٰ، شہادت، اختلاف، اقرار، وکالہ، بیوع اقالہ، صلح، ابرا، شفعہ، قسمہ، غصب، رہن، توکیل وغیرہ ابوابِ فقہیہ کو اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ یہ کتاب انھوں نے دیکھی ہے اور بڑی مفید ہے [۱۲۶]

۵۶۔ شیخ محمد معین سندھی

سندھ کی سرزمین علم وفضل کے لحاظ سے ہمیشہ زرخیز رہی ہے اور اس نے مختلف ادوار میں بے شمار اصحابِ فیض وکمال کو جنم دیا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں جن عظیم اور ممتاز شخصیتوں نے اس کی گود میں پرورش پائی ان میں شیخ محمد معین سندھی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی مولانا محمد امین اور دادے کا نامِ نامی شیخ طالب اللہ تھا۔ یہ خاندان اپنی گوناگوں خصوصیات کی بدولت سندھ میں تین پشتوں سے امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔

محمد معین، سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے، جو علم وعلما کا

---

[۱۲۶] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۵۰، ۳۵۱

مرکز اور محدثین وفقہا کا گہوارہ تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں ہوسکا۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو گھر میں اسلامی علوم وفنون کا دریا بہ رہا تھا، اور ان کے والد مولانا محمد امین کا سلسلۂ فیض جاری تھا، ہونہار بیٹے نے ابتدائی تعلیم جلیل القدر باپ سے حاصل کی۔ اس کے بعد اقلیم سندھ کے ایک رفیع المرتبت عالم اور معقولات ومنقولات کے ماہر شیخ عنایت اللہ بن فضل اللہ ٹھٹھوی (متوفی ۱۱۴۲ھ) کے باب عالی پر دستک دی اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ جب اپنے علاقے اور گرد وپیش کے علما سے استفادہ کر چکے تو دہلی کا رُخ کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں علوم قرآن و حدیث کے چشمے ابل رہے تھے اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ رحیمیہ کی مسندِ تدریس پر ان کے لائق فرزند حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متمکن تھے۔ محمد معین نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور علوم معقول ومنقول سے بہرہ مند ہوئے۔

دہلی سے فارغ التحصیل ہونے اور شاہ ولی اللہ سے حصول علم کے بعد واپس اپنے وطن کا عزم کیا اور اس عہد کے عام رواج کے مطابق تصوّف وطریقت کی طرف مائل ہوئے۔ پہلے شیخ ابوالقاسم نقشبندی کی طرف رجوع کیا جو فقہ واصول اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے، ان سے خوب مستفیض ہوئے۔ پھر مشہور صاحبِ فضل وصلاح عالم شیخ عبداللطیف بھٹائی (متوفی ۱۱۶۵ھ) کا درِ تصوّف کھٹکھٹایا اور ان سے مستفیض ہوئے، جس کے نتیجے میں علم ومعرفت کے بلند مرتبے کو پہنچے۔

شیخ محمد معین سندھی اپنے عصر اور علاقے میں قرآن وحدیث کے فہم میں یکتا، فقہ واصول پر عبور میں منفرد، تحقیق وکاوش میں ممتاز، ذکاوت و فطانت میں بے نظیر اور ادب وشعر میں بہترین شہرت کے مالک تھے۔ علومِ مروجہ میں مہارت اور فنونِ متداولہ پر وسعتِ نظر میں ان کا کوئی حریف

نہ تھا۔ انتہائی ذہین اور نکتہ رس عالم تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے سلسلۂ تدریس جاری کیا اور مسندِ درس آراستہ فرمائی، جس سے بے شمار طلبا و علما نے استفادہ کیا اور کثیر التعداد حضرات نے ان کے چشمۂ فیض سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

میر علی شیر قانع سرزمین سندھ کے مشہور مورخ تھے، وہاں کے علما و فضلا، صوفیا و اتقیا اور امرا و حکام کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ شیخ محمد معین کی علمی ہمہ گیری اور اوصافِ بوقلموں کا تذکرہ مقالات الشعرا میں ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

جامع علوم معقول و منقول، حاوی معالم فروع و اصول، کاشف حقائق علمی و عملی، شارح دقائقِ صدری و معنوی، علامۂ عصر، نحریرِ وقت، مظہرِ حقائق ربانی [۱۲۷]

یعنی شیخ محمد معین ٹھٹھوی معقولات و منقولات کے جامع، فروع و اصول کے عالم، علمی و عملی گتھیوں کے سلجھانے والے، ذہنی و فکری الجھنوں کے شارح، علامۂ عصر، اپنے عہد کے نہایت قابل بزرگ اور احکام خداوندی کی وضاحت میں ید طولیٰ رکھنے والے تھے۔

اپنے متنوع اوصاف و کمالات کی بدولت ہر حلقے میں ان کو انتہائی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ میر علی شیر قانع اپنی ایک اور تصنیف تحفۃ الکرام میں ان کے اسلاف کے بارے میں رقم طراز ہیں: [۱۲۸]

شیخ محمد معین کے والد مخدوم محمد امین تعلقہ روہارہ اور میدان باران کے گاؤں "ڈائی" یا (دالی) کے رہنے والے تھے اور "دل لاکھ" قوم کے فرد مخدوم طالب اللہ

---

[۱۲۷] مقالات الشعرا ص ۱۲۱

[۱۲۸] تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۶۹۳، ۶۹۴۔

کے فرزند تھے - اپنے آبائی وطن کی سکونت ترک کر کے ٹھٹھے میں اقامت پذیر ہوئے اور علمی اور عملی فضیلت میں بڑی شہرت پائی - مخدوم طالب اللہ کے حلقۂ ارادت میں ایک شخص فاضل خاں شامل تھا - یہ ایک عالم اور نیک شخص تھا۔ بادشاہِ وقت شاہ جہان کے دربار میں رسائی حاصل کر کے اچھے منصب پر فائز ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کا عقد مخدوم طالب اللہ کے بیٹے مخدوم محمد امین سے کر دیا تھا۔ اس عقد کی وجہ سے مخدوم محمد امین بڑی شان و شوکت کو پہنچے اور عوام و خواص میں بہت عزت و احترام کے مالک ہوئے۔

مخدوم محمد امین کے بیٹے مخدوم محمد معین تھے، اللہ نے ان کی ذاتِ گرامی میں بہت سی صفات جمع کر دی تھیں، وہ اپنے وقت میں جملہ علوم و فنون اور کمالات کے جامع تھے۔ معقولات و منقولات میں اپنے عہد کے علامہ اور اپنے زمانے کی لاجواب شخصیت تھے۔ کمالاتِ علمی کے باوجود راہِ سلوک سے بھی آگاہ تھے، کتنے ہی بزرگانِ دین سے ان کی صحبتیں رہیں۔

مولوی رحمان علی ان کے فضل و کمال کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے اوصافِ علمی کی بنا پر حکامِ وقت بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور انتہائی تعظیم سے پیش آتے تھے:

مخدوم محمد معین سندھی... شاگرد مخدوم عنایت اللہ جامع جمیع فنون، حاوی معقول و منقول، نحریرِ عصر، علامۂ دہر بود، باوجود کمالاتِ علمی آشنا بحرِ معرفت شدہ، بصحبت بسیارے از بزرگانِ دین رسیدہ... حکامِ وقت بدیدنش بکمال تعظیم می رسیدند، وے نیز بالیشاں ملاقات ہا نیکو کردی[۱۲۹]

شیخ محمد معین سندھی... حضرت مخدوم عنایت اللہ سندھی کے شاگرد تھے تمام فنون کے جامع اور معقول و منقول پر دسترس رکھتے تھے، اپنے وقت کے نہایت...

---

[۱۲۹] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۶، ۲۱۷

فاضل اور اپنے عصر کے علامہ تھے۔ کمالاتِ علمی کے باوجود دریائے معرفت کے بھی غواص تھے۔ بہت سے بزرگانِ دین کی صحبت میں رہ چکے تھے ۔۔۔۔ حکام وقت بھی ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتے اور وہ بھی ان سے خلوص و محبّت سے ملتے تھے۔

مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی تکملہ مقالات الشعرا میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

عمدۃ العلماء الربانیین وقدوۃ المفسرین والمحدثین۔ مخدوم محمد معین [۱۳۰]

یعنی مخدوم محمد معین اپنے عہد میں علمائے ربانی میں بلند تر اوصاف کے حامل اور مفسرین و محدثین کے سرخیل تھے۔

نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ مخدوم محمد معین ٹھٹھوی کا ذکر اپنی دو شہرۂ آفاق کتابوں میں کرتے ہیں۔ ایک اتحاف النبلا میں، اور دوسری کتاب دلیل الطالب علی ارجح المطالب میں۔ اول الذکر کتاب میں وہ حضرت مخدوم کی تصنیف "دراسات اللبیب" کے مندرجات کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مصنفِ شہیر کے بارے میں رقم کرتے ہیں:

للشیخ الفاضل المحقق محمد معین بن محمد امین السندی۔ [۱۳۱]

کہ دراسات اللبیب شیخ فاضل محقق محمد معین بن محمد امین سندھی کی تصنیف ہے۔

ثانی الذکر کتاب میں نواب صاحب حضرت مخدوم ممدوح کو "الشیخ العلامۃ الادیب محمد معین [۱۳۲]" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

---

[۱۳۰] تکملہ مقالات الشعرا ص ۱۸۵۔ [۱۳۱] اتحاف النبلا ص ۷۸

[۱۳۲] دلیل الطالب علی ارجح المطالب ص ۱۶۷۔

اسی طرح صاحبِ نزہتہ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی بھی ان کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

مخدوم محمد معین ٹھٹھوی اپنے زمانے میں اقلیمِ سندھ کے شیخ، فاضل اور علامہ تھے۔ حدیث، کلام اور علومِ عربیہ کے جیّد عالم تھے۔ نہایت ذکی، عالی فکر، ماہرِ علم و عرفان، بہترین شاعر، صاحبِ طرز ادیب، معقول و منقول میں یکتا اور تصوّف و طریقت میں ممتاز تھے [۱۳۳]

شیخ محمد معین سندھی، علمِ حدیث میں خاص طور سے درک و مہارت رکھتے تھے اور اس کے مختلف گوشوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جہاں اقوالِ فقہا حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم آہنگ نہ ہوں، وہاں اقوال فقہا کو ترک کر دیا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ کو مدارِ عمل قرار دیا جائے گا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور ہر زمانے کے علما کو جن میں اجتہاد کی شرائط پائی جائیں حقِ اجتہاد حاصل ہے۔ وہ تقلید کے سخت مخالف تھے۔ ان مسائل میں ان کے اور ان کے معاصر مولانا محمد ہاشم سندھی ٹھٹھوی (متوفی ۱۱۷۴ھ) کے درمیان مباحثات و مناظرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولانا محمد ہاشم سندھی بھی اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے اور حنفی المسلک تھے۔ وہ تقلید کے زبردست حامی اور اجتہاد کے مخالف تھے۔ لیکن اس کے برعکس شیخ محمد معین کا نقطۂ فکر دوسرا تھا، وہ حدیث کے مقابلے میں قولِ امام کو ماننے سے صاف لفظوں میں انکار کرتے تھے، اس لیے دونوں کے درمیان خوب بحثیں چلتی تھیں۔

شیخ محمد معین سندھی کو تصنیف و تالیف میں خاص شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں تصنیف کیں اور بڑے بڑے

۱۳۳۔ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۵۱، ۳۵۲

اہم مسائل کو زیر بحث لائے۔ ان کا طرز بیان بڑا زوردار اور مدلّل ہے۔ ان کی عربی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب: یہ کتاب بارہ دراسات کو محیط ہے اور ردِ تقلید میں ہے۔ اس میں اس امر کی تفصیل سے صراحت کی گئی ہے کہ مسائل شرعیہ میں بنیادی حیثیت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور آپ کے ارشاداتِ عالی قدر کو حاصل ہے۔ اگر کہیں حدیثِ پیغمبر اور قولِ امام میں تصادم ہو، تو حدیث کو ترجیح دی جائے گی اور قولِ امام کو ترک کر دیا جائے گا۔ اس باب میں حضرت مصنف نے محکم دلائل سے گفتگو کی ہے اور جن حضرات نے جہاں جہاں حدیث کے مقابلے میں قولِ امام کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کو انتہائی سختی سے ہدفِ تنقید ٹھہرایا ہے۔ یہ کتاب اپنے انداز کی بہترین کتاب ہے۔ شروع سے آخر تک زبان بڑی صاف اور اسلوب بیان محققانہ ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے "اتحاف النبلا" میں اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ فاضل محقق شیخ محمد معین بن محمد امین سندھی کی یہ تالیف عمل بالحدیث اور مخالفِ حدیث مذہب کے ترک کے بارے میں نہایت عمدہ ہے۔ اس کے مشمولات و مندرجات مبنی بر تحقیق ہیں، اس کی زبان و عبارت میں انتہائی متانت پائی جاتی ہے اور جو باتیں اس میں بیان کی گئی ہیں، وہ حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ حضرت مصنف نے اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بدرجۂ غایت دقتِ نظر سے کام لیا ہے [۱۳۲]

دراسات اللبیب سب سے پہلے ۱۲۸۴ھ میں لاہور سے طبع ہوئی تھی، لیکن اب بالکل نایاب تھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں لجنۃ

---

[۱۳۲] اتحاف النبلا ص ۷۸

احیاء الادب السندی (یعنی سندھی ادبی بورڈ کراچی) کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ کتاب اپنے موضوع میں لائق مطالعہ ہے فقہی مسائل میں حضرت مصنف کا زیادہ تر نقطۂ نظر وہی ہے جو اہلِ حدیث حضرات کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض ہم عصر حنفی علماء نے کتاب کے اس قسم کے مضامین کی تردید اور حضرت شیخ محمد معین سندھی کے نقطۂ نظر کی مخالفت میں کتابیں تصنیف کیں، لیکن جو زور اور وزن شیخ محمد معین سندھی کے دلائل اور اسلوب میں پایا جاتا ہے، وہ ان کے مخالفین کی کتابوں میں نہیں ہے۔

۲۔ الحجۃ الجلیلہ فی قضاء الحکم بالافضیلہ۔

۳۔ ایقاظ الوسنان۔

۴۔ رسالۃ فی اثبات اسلام ابی طالب۔

۵۔ انوار الوجد من منح المجد۔

۶۔ غایت الایضاح فی المحاکمۃ بین الودرو ابن الصلاح۔

۷۔ رسالہ فی بحث حدیث المصراۃ۔

۸۔ رسالہ فی تحقیق معنی الحدیث لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔

۹۔ مواھب سید البشر فی حدیث الائمۃ الاثنی عشر۔

۱۰۔ غایۃ الفسخ لمسئلۃ النسخ۔

۱۱۔ قرۃ العین فی ابکاء علی الامام الحسین۔

۱۲۔ اثبات رفع الیدین فی الصلوٰۃ۔

۱۳۔ ابرار الضمیر المنصف الخبیر۔

۱۴۔ رسالہ فی انتقاد المومنین من فتح القدیر۔

۱۵۔ رسالہ فی بحث تناسخ۔

۱۶۔ رسالہ بالاجوبۃ الفاضلہ الامثلۃ العشرۃ الکاملہ۔

۱۷۔ رسالہ فی تحقیق اھل البیت۔

یہ سترہ کتب و رسائل عربی زبان میں ہیں۔ فارسی میں بھی انھوں نے کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ اثبات رفع الیدین فی الصلوٰۃ۔

۲۔ شرح رموز عقائد صوفیہ۔

۳۔ رسالہ اویسیہ۔

۴۔ طریقۃ العون فی حقیقۃ الکون۔

شیخ محمد معین سندھی نماز میں رفع یدین کے قائل تھے۔ اس کے اثبات میں انھوں نے دو رسالے تصنیف کیے۔ ایک عربی میں اور ایک فارسی میں۔ ان دونوں رسالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کرام کے اقوال و عمل کی روشنی میں رفع یدین کا ثبوت دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ان کی تصنیفات کے ناموں سے ظاہر ہے، وہ بعض مسائل میں ایسے افکار و رجحانات کے حامل ہیں، جن کا عام اہل سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً

وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اصحاب ثلاثہ ـــ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم ـــ پر فضیلت دیتے تھے۔

عمل اہلِ بیت کو عمل اہلِ مدینہ پر ترجیح دیتے تھے۔

حضرت حسین کی شہادت کے دن افسوس کے طور پر رونے کے قائل تھے۔

ابو طالب کے ایمان کے قائل تھے۔

وجد و سماع کو صحیح قرار دیتے تھے۔

شیخ محمد معین سندھی جہاں تصنیف و تالیف میں یکتا، تحقیق و تدقیق میں بے مثال اور بحث و مناظرہ میں عدیم النظیر تھے، وہاں بہت بڑے مدرّس

اور معلّم بھی تھے۔ ان کا سلسلۂ تدریس بڑا وسیع تھا، بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور پھر ان میں سے ہر ایک نے آگے چل کر عظیم الشان علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔

شیخ محمد معین فارسی اور اردو کے ممتاز شاعر بھی تھے۔ فارسی میں تسلیم اور اردو میں بیراگی تخلص کرتے تھے۔ ان کا فارسی کلام موجود ہے اور میر علی شیر قانع نے اپنی تصنیف مقالات الشعرا میں ان کے اشعار نقل کیے ہیں، لیکن اردو کلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گم ہو گیا ہے۔

شیخ ممدوح نے حالتِ وجد و سماع میں ۱۱۶۱ھ کو ٹھٹھے میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

۵۷۔ سیّد محمد ممتاز نصیر آبادی

سیّد محمد ممتاز حسنی نصیر آبادی، شاہ علم اللہ بریلوی کے پرپوتے، شاہ ابو حنیفہ کے پوتے اور شاہ عبدالباقی کے بیٹے تھے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان دیارِ ہند میں علم و عمل کے اعتبار سے ممتاز شہرت کا حامل اور ورع و تقویٰ میں منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ حضرت سیّد احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی خاندان کے لعلِ درخشاں تھے۔ اس خانوادے کو برصغیر میں اپنے فضل و صلاح کی بدولت اب تک خاص عزّ و شرف کا مقام حاصل ہے، اور اس کے بعض اہلِ علم تو اپنی گوناگوں قابلیت و استعداد کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کے اونچے مرتبے پر فائز ہیں۔

سیّد محمد ممتاز حسنی نصیر آبادی جو اس خاندان کے اکابرین سے تھے، معروف اصحابِ فضل و کمال میں گردانے جاتے تھے۔ وہ نصیر آباد (یو۔پی) میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اپنے والدِ گرامی سیّد عبدالباقی نصیر آبادی (متوفی ۱۱۵۷ھ) سے علم فقہ کی تحصیل کی، اخذِ طریقت بھی انہی سے کیا۔ قناعت و

عفت اور توکل و اتقا میں اپنے آباد اجداد کا صحیح نمونہ تھے۔ سب طرف سے منقطع ہو کر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے اور معاملات دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔[۱۳۵]

۵۸- شیخ محمد مومن الجزائری

شیخ محمد مومن الجزائری مسلکاً شیعہ تھے۔ ان کا مولد و منشا ایران کا شہر "شیراز" ہے۔ متعدد بلند مرتبہ اساتذہ سے اخذِ علم کیا اور فنون متداولہ میں ماہر ہوئے۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، صرف و نحو، منطق و فلسفہ، فرائض و ریاضی، طب، جفر و رمل، حکمت و کلام، شعر و ادب، لغت، غرض معقولات و منقولات میں یگانۂ روزگار تھے۔ تحصیل علم کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا اور علاقۂ دکن کی سیر و سیاحت شروع کی۔ پھر اس ہمہ اوصاف موصوف عالم نے (غالباً) دکن کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔

شیخ محمد مومن الجزائری بے شک شیعہ تھے، لیکن وسیع القلب اور کھلے ظرف کے اہل علم تھے۔ علوم و فنون کے تمام گوشوں میں دسترس رکھتے تھے۔ ان کو اللہ نے تصنیف و تالیف کا بھی بہترین ذوق اور سلیقہ عطا کیا تھا، چنانچہ مختلف عنوانات و مسائل سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱- جامع المسائل النحویہ فی شرح الصمدیۃ البہائیہ۔ یہ اپنے موضوع کی ایک مبسوط کتاب ہے۔

۲- بیان الآداب۔

۳- مصباح المبتدین۔

---

۱۳۵ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۵۵

۴ - مشکوٰۃ العقول -

۵ - قرۃ العین -

۶ - سبکۃ اللجین - اس میں قرآن مجید کی آیات مشکلہ، احادیث غریبہ اور بعض اشعار و ابیات کی عقدہ کشائی کی گئی ہے - اس کا سنِ تالیف ۱۱۰۱ھ ہے -

۷ - وسیلۃ الغریب - اس کا انداز وہی ہے جو اُن کی تصنیف قرۃ العین کا ہے -

۸ - تحفۃ الغریب -

۹ - نخبۃ الطبیب - یہ طب کی مشہور کتاب "قانونچہ" کی شرح ہے -

۱۰ - تحفۃ الاطبا - یہ کتاب "کشکول" کے اسلوب کی ہے -

۱۱ - تمیمۃ الفواد من الم البعاد - اس میں بعض نادر اشعار کا لغوی حل پیش کیا گیا ہے - نیز ان کی تشریح کی گئی ہے -

۱۲ - جنات - یہ آٹھ فنون پر مشتمل ہے -

۱۳ - مشارق السعداین -

۱۴ - مجمع البحرین -

۱۵ - ثمرۃ الفواد و سمر البعاد -

۱۶ - محاسن الاخبار و مجالس الاخیار - یہ کتاب سات جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے -

۱۷ - ثمرۃ الحیات و ذخیرۃ الممات -

۱۸ - طیف الخیال فی مناظرۃ العلم والمال -

شیخ محمد مومن میں ایک خوبی یہ تھی کہ بڑے زندہ دل اور خوش مزاج عالم تھے - مزاح اور ظرافت میں مشہور تھے -

۵۹ - شیخ محمد ناصر الہ آبادی

شیخ محمد ناصر عباسی الہ آبادی، خطۂ ہند کے نامور فاضل اور مشہور عالم

تھے۔ شیخ محمد فاخر عباسی الٰہ آبادی کے چھوٹے بھائی اور شیخ محمد یحییٰ الٰہ آبادی، (معروف بہ شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی) کے تین بیٹوں میں سے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۱۲۲ھ کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے، اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر (متوفی ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ) اور ماموں شیخ کمال الدین الٰہ آبادی سے جو علومِ حکمیہ کے ماہر اور فنون مروجہ کے فاضل تھے، علم حاصل کیا، اور دیارِ ہند کے فحول علما میں گردانے گئے۔ مختلف علوم و فنون میں درک و مہارت کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ بہترین شاعر تھے اور ان کا کلام تین ضخیم دواوین کو محیط ہے۔ تصنیف و تالیف میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں:

منتخب الاعمال، الجواہر النفیسہ، الافکار العشرہ، تذکرۃ الخلفاء، تفسیر آیات الاحکام، انوار الحقائق، تنبیہ الاعزۃ بما کان لی عند الشیخ من الحزنۃ۔ ایک رسالہ اثباتِ مذہب حق کے بارے میں ہے۔

شیخ محمد ناصر عباسی الٰہ آبادی نے بدھ کے روز، مغرب کے وقت ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۳ھ کو صرف ۴۱ سال عمر پاکر جنت کی راہ لی، اپنے آبائی شہر الٰہ آباد (یوپی) میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے[۱۳۶]

۶۰۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی

خواجہ محمد ناصر حسینی دہلوی نجیب الطرفین سید تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب دس واسطوں سے حضرت خواجہ بہاء الدین محمد نقشبند بخاری سے

۱۳۶ھ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۱۷، ۲۱۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۷، ۳۵۸

اور چوبیس واسطوں سے حضرت حسن عسکری سے ملتا ہے۔

خواجہ بہاءالدین محمد نقشبند در حقیقت بخارا کے رہنے والے تھے اور یہ وہی بزرگ ہیں جن کو سلسلۂ نقشبندیہ کے بانی اوّل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی وفات سے تقریباً تین سو سال بعد ان کے اخلاف میں سے ایک بزرگ خواجہ محمد طاہر نقشبند پیدا ہوئے، اور اس خاندان کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بخارا کی سکونت ترک کر کے ہندوستان کا عزم کیا۔ یہ بزرگ خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے تخت پر اورنگ زیب عالم گیر متمکن تھا۔ وہ ان سے انتہائی عقیدت سے پیش آیا، اور حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی درخواست کی، مگر انھوں نے شہنشاہِ ہند کی اس درخواست کو شرفِ قبولیت نہیں بخشا اور اپنے تین بیٹوں — خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ فتح اللہ — کو دہلی میں عالم گیر کے دربار میں چھوڑا اور خود حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک روایت کے مطابق واپس بخارا چلے گئے تھے[۱۳۷]۔

خواجہ فتح اللہ کے بیٹے، نواب ظفر اللہ خاں اور نواب ظفر اللہ خاں کے بیٹے ہی خواجہ محمد ناصر ہوئے، جن کا ترجمہ ان سطور میں بیان کرنا مقصود ہے۔

خواجہ محمد ناصر کی ولادت دہلی میں ہوئی، تربیت کی مختلف منزلیں بھی اسی شہر میں طے کیں۔ صغر سنی ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس عہد کے جن مشاہیر اصحابِ فیض و کمال سے مستفید ہونے کا موقع ملا، ان میں شیخ سعد اللہ دہلوی اور شیخ زبیر بن ابو العلا سرہندی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کافی عرصے تک ان سے منسلک رہے یہاں تک کہ اللہ نے ان کے لیے علم و معرفت کے دروازے کھول دیے اور ان کا شمار فقہ و

---

۱۳۷ تفصیل کے لیے دیکھیے فقہائے ہند، ج پنجم حصہ اول، ص ۱۶۸ تا ۱۷۰

اصول اور دیگر علوم متعارفہ کے علمائے راسخین کی بلند مرتبت جماعت میں ہونے لگا۔

خواجہ ممدوح اپنے دور کے جیّد عالم اور ممتاز صاحبِ طریقت تھے اور "محمدی" نسبت رکھتے تھے۔ صوفیا و مشائخ کی متعارف رسوم اور اصطلاحات و اختراعات سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا۔ عملی و علمی کمالات کے ساتھ ساتھ ان میں ایک کمال یہ تھا کہ نامور شاعر بھی تھے اور عندلیبؔ تخلّص کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مصنف بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں:

۱۔ نالۂ عندلیب: یہ کتاب نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے، دو ضخیم جلدوں کو محیط ہے۔ اس میں معرفت و طریقت، فقہ و اصول اور متفرق مسائل سے متعلق بڑی شاندار باتیں معرضِ کتابت میں لائی گئی ہیں۔ مصنف نے یہ کتاب ۱۱۵۳ھ میں مکمل کی تھی۔ برصغیر کے معروف عالم و مصنف نواب سید صدیق حسن خاں کے فرزند رشید نواب نور الحسن خاں مرحوم کی سعیِ جمیلہ سے شائع ہو چکی ہے۔ پوری کتاب اٹھارہ سو صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

۲۔ رسالہ ہوش افزا: یہ بھی نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۳۔ دیوانِ عندلیب: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ "دیوانِ عندلیب" ان کے فارسی کلام کا مختصر مجموعہ ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی نے چھیاسٹھ سال عمر پائی کہ ہفتے کے روز ۲ شعبان ۱۱۷۲ھ کو دہلی میں عالمِ فنا سے عالمِ بقا کو رختِ سفر باندھا۔

۶۱۔ شیخ محمد نصیر شیخ پوری

شیخ محمد نصیر شیخ پوری شیعہ تھے اور شیخ شمس الدین اودھی کی اولاد میں

سے تھے۔ مولد و منشا شیخ پورہ ہے۔ ابتدائے جوانی ہی میں ملا شاہ محمد شیرازی کی خدمت میں گئے اور ان سے کتب درسیہ پڑھیں، مشائخ ایران سے فقہ کی تعلیم پائی، حدیث کی سند بھی انہی سے لی، یہاں تک کہ حدیث، فقہ، ہیئت، ہندسہ اور حساب وغیرہ میں اونچے مرتبے کو پہنچے۔ بعد ازاں واپس ہندوستان آئے اور صوبہ بہار کے مشہور شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے کے مغل بادشاہ نے صوبہ بہار میں ان کو کئی گاؤں بطور جاگیر عطا کر دیے تھے[۱۳۶]۔

۶۲۔ مولانا محمد نعیم جون پوری

شیخ محمد نعیم بن مفتی محمد فائض صدیقی اودھی ثم جون پوری۔ محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر اور شیخ فاضل تھے۔ ان کے جدِ امجد کا نام نامی شیخ پیر محمد تھا جو سید سالار مسعود غازی کے ساتھ واردِ ہند ہوئے اور ہندوؤں سے معرکۂ کارزار گرم کیا۔ بعد ازاں علاقۂ اودھ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ شیخ محمد نعیم کے والد محترم مفتی محمد فائض تھے جو اودھ کے منصبِ افتا سے سرفراز ہوئے اور ایک گاؤں میں ٹھہرے، جس کا نام "بدیع السرا" تھا، لیکن عوامی زبان میں اسے "بدّو سرائے" کہا جاتا ہے۔

مفتی محمد فائض کے بیٹے محمد نعیم نے مصنفِ رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری اور دیگر علمائے عصر سے کسبِ علم کیا۔ اس زمانے کے عام دستور کے مطابق تصوّف و طریقت کا علم بھی حاصل کیا، پھر اللہ نے اس قدر عروج بخشا کہ معقول و منقول میں کامل دسترس حاصل کی اور اپنے وقت اور علاقے

---

[۱۳۶] سیر المتاخرین ج ۲، ص ۶۱۱ — نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۹

کے علامہ قرار پائے۔ ابتدا میں چوں کہ علاقہ اودھ کے رہنے والے تھے اس لیے اودھی کہلائے، اور بعد میں جون پور کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا لہٰذا جون پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ فقہ اور دیگر علوم میں ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا عالم نہ تھا۔ ہدایہ کی بہترین شرح سپردِ قلم کی جو چودہ جلدوں میں ہے۔ حدیث کی درسی کتاب مشکوٰۃ کی شرح بھی لکھی اور کمال یہ ہے کہ یہ شرح ضعف بصارت کے بعد لکھی۔

مولانا محمد نعیم صدیقی جون پوری نہایت بلند ہمت عالم دین تھے۔ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔ سو سال سے زائد عمر کو پہنچ گئے تھے، لیکن نہ تدریس میں کمی پیدا ہوئی اور نہ تصنیف میں کوئی حرج واقع ہوا۔

اس جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فقیہ نے ۱۸ صفر ۱۱۲۰ھ جمعۃ المبارک کی رات کو عالمِ آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ بعض حضرات نے قرآن مجید کے ان الفاظ سے تاریخ وفات نکالی: وعندہ جنات لھم فیھا نعیم مقیم [۱۳۹]

۶۳۔ سیّد محمد نور نصیر آبادی

سیّد محمد نور نصیر آبادی برِصغیر کے عظیم القدر خاندان کے فردِ فرید تھے۔ یعنی رائے بریلی کے شیخ اجل حضرت سیّد علم اللہ حسنی کے پوتے اور حضرت سیّد محمد ہدیٰ کے فرزندِ دلبند تھے۔ اپنے جلیل القدر دادا کے زمانے میں پیدا ہوئے اور انہی کی نگرانی میں کسب علم کیا، فقہ کی تعلیم بھی ان سے پائی اور اخذِ طریقت بھی انہی سے کیا۔ سیّد علم اللہ کو اپنے اس پوتے سے بڑی محبت تھی

---

[۱۳۹] نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۰۔ بحوالہ گنج ارشدی۔

اور سید محمد ہدیٰ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس بچے کی تربیت میری مغفرت کا باعث ہوگی۔

سیّد محمد نور حصول علم سے فارغ ہوئے اور جوانی کو پہنچے تو شاہی ملازمت کے لیے دکن کا ارادہ کیا۔ سیّد علم اللہ کے ارادت مندوں میں سے ایک امیر نے سفارش کر کے شاہ زادہ اعظم جاہ کی سرکار میں ملازمت دلا دی اور بہت بڑا کام یہ کیا کہ خاص ان کے لیے دربار کے عام طریق تسلیم و بندگی کی جگہ صرف سلام مسنون کی اجازت حاصل کی۔ اس طرح چودہ برس ملازمت میں گزر گئے۔ ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک وسیع میدان ہے اور اس میں نہایت خوب صورت مسجد بنی ہوتی ہے۔ اس میں ایک بزرگ بیٹھے ہیں جن کی شکل بڑی نورانی ہے۔ سامنے ایک دستار رکھی ہے۔ بزرگ نے دستار کو ہاتھ میں پکڑا اور پھاڑ دیا۔ سیّد محمد نور نے پوچھا "یہ کیا ہوا؟" بزرگ نے جواب دیا "یہ اعظم جاہ کی سلطنت تھی، جس کی دستار پارہ پارہ کر دی گئی۔"

خواب سے بیدار ہوتے ہی طبیعت ملازمت سے بیزار ہو گئی۔ دو برس کی رخصت لے کر گھر چلے گئے۔ پھر استعفا دے دیا۔

سیّد نور محمد عفت و قناعت، ورع و تقویٰ، جود و سخا اور ہمدردی خلائق میں اپنے واجب الاحترام والد اور لائق تعظیم دادا کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ غیبت اور کذب بیانی سے اس درجے تنفر تھا کہ اسے سن بھی نہیں سکتے تھے۔ نہایت پابندِ سنت تھے۔ اہلِ بدعت کے تحائف و ہدایا ہرگز قبول نہ کرتے۔ اکلِ حلال کا خاص طور پر اہتمام فرماتے۔ عزیزوں، ہمسایوں اور غریبوں کی خدمت کو ذریعۂ سعادت سمجھتے تھے۔ اوقاتِ شب و روز کا بیشتر حصہ انہی کی خدمت میں بسر ہوتا۔

سیّد علم اللہ کے خانوادۂ بلند بخت کے اس نامور عالم و فقیہ نے بدھ کے روز ۶ ربیع الاول ۱۱۴۸ ہجری کو نصیر آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور اپنے نانا سیّد داؤد (برادرِ حقیقی سیّد علم اللہ شاہ) کے قریب

دفن ہوئے[۱۴۰]

۶۴۔ سیّد محمد وارث حسینی بنارسی

سیّد محمد وارث حسینی کا قدیم وطن ایک قریہ "نونہرہ" تھا جو اعمالِ غازی پور میں واقع تھا۔ ان کے والد سید عنایت اللہ حسینی عہدِ عالم گیری میں بنارس کے منصبِ قضا پر مامور تھے، اس لیے بنارس ہی میں سکونت رکھتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۰۸۷ھ میں بنارس میں ہوئی۔ عالمِ طفولیت ہی میں تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ مختلف جید اساتذہ سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا اور فقہ، اصول، کلام اور علومِ عربیہ کے اکابر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔ منطق و حکمت اور دیگر فنون میں بھی بلند مرتبے کو پہنچے۔

سیّد محمد وارث بنارسی نے کئی کتبِ درسیہ پر حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیے۔ علم فقہ کی مشہور کتاب شرح وقایہ پر حاشیہ لکھا، میر زاہد پر بھی حاشیہ تحریر کیا۔ کہتے ہیں، قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی تھی۔

سیّد محمد وارث حسینی بنارسی نے جو اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز فقیہ اور بہت بڑے عالم و مصنف تھے، ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۶ھ کو بنارس میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ لحد ہوئے[۱۴۱]

۶۵۔ مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی

کشورِ سندھ کے مردم آفرین خطے میں جن اصحابِ فضل و فیض اور

---

[۱۴۰] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۱ — سیّد احمد شہید ص ۵۱ — نیز دیکھیے اعلام الہدیٰ۔

[۱۴۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۸، ۲۱۹ — تذکرہ مشائخ بنارس ص ۳۲ تا ۳۹ — برکات الاولیا ص ۱۵۴ — نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۱۔

ارباب علم وکمال نے درس و تدریس کے ہنگامے برپا کیے اور تصنیف و تالیف کے جھنڈے گاڑے، ان میں مولانا محمد ہاشم سندھی کا نام نامی تاریخ برصغیر کے صفحات میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ ان کے والد کا نام عبدالغفور اور جدِّ امجد کا عبدالرحمٰن تھا۔ سندھ کے مرکزِ علم ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے، ہوش سنبھالا تو حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں عالم کبیر مولانا ضیاء الدین ٹھٹھوی سندھی (متوفی ۱۱۷۱ھ) سرگرم درس و افادہ تھے، ان کی خدمت میں حاضری دی اور درسی کتابوں کی تکمیل فرمائی۔ اس کے بعد سفر حجاز پر روانہ ہوئے، اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں اہلِ علم کے کئی حلقے قائم تھے، جن میں ایک حلقہ شیخ عبدالخالق صدیقی مکی کا تھا۔ شیخ ممدوح مکہ مکرمہ میں احناف کی مسندِ افتا پر فائز تھے، مولانا محمد ہاشم اس میں شریک ہو گئے اور شیخ سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھنا شروع کیں، ان علوم میں اس قدر مہارت پیدا کی کہ تمام ساتھیوں سے سبقت لے گئے۔ واپس وطن پہنچے تو ٹھٹھہ میں خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کی تدریس کا غلغلہ بلند کرنے لگے۔ حضرت ممدوح فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے اور اپنے اسلوبِ خاص سے اس کی نشر و اشاعت کو ضروری قرار دیتے تھے۔

اس زمانے میں ٹھٹھہ اصحابِ فضل کا عظیم مرکز تھا، شیخ محمد معین سندھی بھی اسی شہر میں فروکش تھے جو تقلید کے سخت مخالف اور مسائلِ شرعیہ میں مسلکِ اصحاب الحدیث کے مطابق براہِ راست کتاب و سنت سے استدلال کے زبردست حامی تھے۔ ان کی مشہور تصنیف "دراسات اللبیب" کا بیشتر حصہ اسی موضوع پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد ہاشم اور شیخ محمد معین کے درمیان اس سلسلے میں علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تحقیقی انداز میں ایک دوسرے کے درمیان خوب بحثیں چلیں۔

مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی بہت بڑے مصنف بھی تھے۔ متعدد کتابیں

ان کے زورِ قلم کے نتیجے میں معرضِ تصنیف میں آئیں جن میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱- بذل القوۃ فی سنی النبوۃ۔

۲- جنۃ النعیم فی فضائل القرآن الکریم: یہ کتاب انھوں نے ۱۱۳۴ھ میں تصنیف کی۔

۳- فاکھۃ البستان فی تنقیح الحلال والحرام: یہ کتاب ۱۱۳۲ھ میں تالیف فرمائی۔

۴- حیاۃ القلوب فی زیارۃ المحبوب: یہ کتاب ۱۱۳۵ ہجری میں تصنیف کی۔

۵- کشف الرین فی مسئلۃ رفع الیدین: شیخ محمد معین سندھی نے "اثبات رفع الیدین فی الصلوٰۃ" کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں، ایک عربی میں اور ایک فارسی میں، ان کتابوں میں انھوں نے احادیث صحیحہ کی رُو سے نماز میں رفع یدین کرنے کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا محمد ہاشم سندھی نے اس رسالے میں ان کا جواب تحریر فرمایا ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے ۱۱۴۹ھ میں تصنیف فرمایا۔

۶- ایک ضخیم اور بسیط کتاب فرائض الاسلام کے موضوع پر ۱۱۷۱ھ میں تصنیف کی۔ اس کتاب میں فرائض ایمان کی وضاحت کی گئی ہے، اور اس باب میں مسلمان پر جو علمی اور عملی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، ان کی صراحت فرمائی گئی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی اپنے دور کے جلیل القدر عالم دین تھے اور ان کے معلومات و مطالعہ کا دامن بہت وسیع تھا۔ فقہِ حنفی میں انھیں بڑا عبور حاصل تھا۔ ان کی تبلیغی مساعی سے بہت سے غیر مسلم دائرۂ اسلام

میں داخل ہوئے۔ اس فاضل اجل نے ۱۱۴۷ھ میں اس جہانِ فانی سے منہ موڑا اور جنت کی راہ لی۔[۱۴۲]

۶۶۔ سیّد محمد ہُدیٰ نصیر آبادی

سیّد محمد ہُدیٰ حسنی نصیر آبادی حضرت شیخ اجل سیّد علم اللہ حسنی بریلوی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ) کے فرزندِ ارجمند تھے۔ انھوں نے علم و فضل کی فضا میں شعور کی آنکھیں کھولیں۔ ور مشیخت و تقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی سیّد شیخ علم اللہ بریلوی سے فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ بلند مرتبہ اب کی صحبت کیمیا اثر سے نیکی کے ہر گوشے میں اونچے درجے پر رسائی حاصل کی۔ عالی ہمت اور تقویٰ شعار عالم کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ سخاوت و جودت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کا سوال رد نہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایسی حالت میں سائل نے دروازے پر دستک دی، جب کہ کوئی چیز پاس نہ تھی، فوراً بیوی کا زیور اتروا کر اس کے حوالے کر دیا۔

سیّد محمد ہُدیٰ کئی جاگیروں کے مالک تھے، مگر سخاوت کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ صرف نصیر آباد کی جاگیر سے گھر کے مصارف پورے کرتے، باقی تمام تر آمدنی مستحقین کو دے دیتے۔ دو یا تین گاؤں کی آمدنی برادری کے لوگوں کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ ایک روز بارہ ہزار عالم گیری دینار کہیں سے آئے، اس مردِ خدا نے سب کے سب اسی وقت بانٹ دیے، خود فاقے سے رات گزاری۔

سیّد ممدوح بے شک اچھے خاصے امیر اور جاگیر دار تھے، مگر اپنے لیے

---

[۱۴۲] تحفۃ الکرام ص ۶۹۶ (اردو ترجمہ) تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۳، ۲۵۴ — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۶۳۔

کوئی پختہ مکان تعمیر نہ کرایا، اگر اس طرف توجہ دلائی جاتی تو جواب دیتے کہ چند سانس گزارنے کے لیے چھپر اور بلند و بالا عمارت میں کوئی فرق نہیں، سب کی حیثیت یکساں ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ چھپروں میں بھی کبھی اچھی لکڑی استعمال نہ کی۔

ان کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ مغل حکمران شاہ عالم اول سے ملاقات کے لیے نکلے، وہ دکن کی طرف جا رہا تھا، برہان پور پہنچے تو وہاں ۱۹ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ کو وفات پا گئے۔ اقربا نے میت کو بہ طور امانت کے برہان پور کی خانقاہ نقشبندیہ میں دفن کیا۔ ایک برس کے بعد اسے تابوت میں رکھ کر رائے بریلی لائے اور زاویہ سید علم اللہ شاہ میں دفن کیا۔[۱۴۳]

۶۷- شیخ محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی

اقلیم ہند کی جن جلیل القدر شخصیتوں نے آسمانِ علم و شہرت کی آخری بلندیوں تک پرواز کی ان میں شیخ محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ آپ شیخ خوب اللہ الہ آبادی کے لقب سے معروف تھے۔ والد کا اسم گرامی محمد امین تھا۔ چچا اور خسر شیخ محمد افضل عباسی الہ آبادی تھے جو بارھویں صدی ہجری کے عظیم المرتبت ہندی عالم تھے اور جن کی تاریخِ ولادت ۱۰ ربیع الاول ۱۰۳۸ھ اور تاریخ وفات ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ ہے۔

شیخ محمد یحییٰ ۱۷ محرم ۱۰۸۰ھ کو پیدا ہوئے اور علم و فضل کی فضا میں پرورش پائی، ہوش سنبھالا تو گھر میں شیخ محمد افضل عباسی کا سلسلۂ فیض و افادہ

---

[۱۴۳] سید احمد شہید، ص ۵۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۵، ۳۶۶

جاری تھا، ان سے درسی کتابوں کی تکمیل فرمائی اور طویل مدت تک ان کے دامنِ تربیت سے وابستہ رہے۔ اخذِ طریقت بھی انھی سے کیا۔ ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ تیرہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ یہ وہ عمر ہے جب کہ عام طور پر بچے کھیل کود میں مشغول ہوتے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی اس برصغیر کے وہ عالی دماغ شخص تھے کہ جن کا وسعتِ علم، کثرتِ مطالعہ، معرفتِ حدیث اور ادراکِ فقہ میں کوئی مثیل نہ تھا۔ ان کے عصر اور علاقے میں حدتِ ذہانت، معقولات و منقولات میں جامعیت، طریقت و سلوک کی منزلوں سے آگاہی، مسائلِ شرعیہ میں درک و تداول اور فنونِ مروجہ میں گہرائی و گیرائی میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ علوم میں امامت اور فنون میں اجتہاد کے درجے پر فائز تھے، جو علمی و تدریسی خدمات انھوں نے انجام دیں، ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں وہ زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔ درس و تدریس، موعظت و خطابت، تبلیغ و اشاعتِ دین، زہد و اتقا، عبادتِ الٰہی، تصنیف و تالیف غرض ہر میدان میں ان کی تگ و تاز کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور ہر علمی و دینی معاملے میں مخلوقِ خدا نے ان کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کی۔ تمام عمر حق و صداقت کا علم بلند کیے رکھا۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

القول الصحیح فی صلوٰۃ التسبیح، الکلام المفید فیما یتعلق بالشیخ والمرید، الکلمات المؤتلفہ فی المقاصد المختلفہ، البضاعۃ المزجاۃ، ماخذ الاعتقاد فی شان الصحابۃ واھل البیت الامجاد، تزیین الاوراق فی مخزق الطباق، خلاصۃ الاعمال، بسط الکلام فی وفیات الاعلام، توفیر المنفعہ فی باب الجمعہ، المناقب الغوثیہ، الاربعین،

اعلام الھدیٰ، اقامۃ الحجہ فی الجمع بین الظہر والجمعہ، رسالہ فی الاذکار وثمراتہا، شرح رسالہ المکیہ، حاشیہ دستور المبتدی، شرح دعاء الصباح، اغاثۃ القاری فی شرح ثلاثیات البخاری، اخراج الخبایا فی شرح الوصایا، تذکرۃ الاصحاب وغیرہ - عربی اور فارسی کی یہ کتابیں حضرت مصنف کی بے پناہ علمی اور تحقیقی قابلیت پر دلالت کناں ہیں۔

ان کے علاوہ چار ضخیم جلدوں میں ان کے مکاتیب ہیں جو انھوں نے مختلف حضرات کے نام بہت سے اہم علمی اور فقہی مسائل کے بارے میں تحریر فرمائے۔ یہ مکاتیب ان کے علوِ فکر، غزارتِ علم، دقتِ نظر اور ہمہ گیریِ معلومات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ کے تین بیٹے تھے، شیخ محمد فاخر، شیخ محمد ناصر اور شیخ محمد طاہر یہ تینوں فضل وعرفان میں یگانہ اور فیض وکمال میں منفرد تھے۔ ان کے حالات گزشتہ صفحات میں بیان کیے جاچکے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ عباسی الٰہ آبادی نے ۶۴ برس کی عمر میں ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا اور جنت الفردوس کی راہ لی[۱۴۴]۔

۶۸- مولانا محمود نائطی

مولانا شہاب الدین محمود بن ابو المحمود نائطی مدراسی، نواح مدراس کے شیخ، عالم، فقیہ اور صاحب فضل وکمال تھے۔ اُس علاقے کے اربابِ علم اور ثقہ لوگوں نے ان کے کئی قسم کے علمی اوصاف وکمالات بیان کیے ہیں اور

---

[۱۴۴] انوار العارفین ص ۴۶۴، ۴۶۵ — مفتاح التواریخ ص ۳۱۴ — تذکرہ علمائے ہند ص ۵۸، ۵۹ — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۴۲۰، ۴۲۱

انھیں بارھویں صدی ہجری کے ہندی علما میں بڑی اہمیت دی ہے[۱۴۵]

۶۹- سیّد محی الدین حسینی نیوتنی

سیّد محی الدین حسینی نیوتنی، غلام محی الدین کے نام سے معروف تھے۔ اپنے عہد کے فاضل اور شیخ تھے۔ فقہ و اصول، علوم عربیہ اور تصوّف میں یگانہ تھے۔ مولد و منشا "نیوتنی" ہے، جو اس زمانے میں علاقہ اودھ میں ایک بڑا قریہ تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو دل میں حصولِ علم کا شوق کروٹ لینے لگا اور اس عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اپنے عصر کے نامور اساتذہ کی خدمت میں گئے اور استفادہ کیا۔ شیخ لطف اللہ کوروی کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہوئے اور ان سے منسلک رہے۔ شیخ پیر محمد لکھنوی اپنے دور کے علمائے نامدار اور صوفیائے عالی مقام میں سے تھے، ان سے بھی استفاضہ کیا۔ مختلف اصحاب سے کسبِ علم اور اخذِ فیض کے بعد "بانگر" کے علاقے میں گئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ لوگوں سے بالکل الگ ہو کر یادِ الٰہی کو اپنا دن رات کا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ بانگر کے علاقے ہی میں وفات پائی[۱۴۶]

۷۰- شیخ محی الدین الٰہ آبادی

شیخ محی الدین بن قاضی داؤد الٰہ آبادی حنفی المسلک تھے اور بارھویں صدی ہجری کے فضلائے الٰہ آباد اور فقہائے ہند میں بڑی شہرت و ناموری کے حامل تھے۔ ان کے والدِ گرامی قاضی داؤد الٰہ آبادی بھی تقویٰ شعاری اور

---

[۱۴۵] تاریخ النوائط ص ۳۱۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۶

[۱۴۶] تاریخ فرخ آباد — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۷

معرفت و ادراک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ شیخ محی الدین اپنے باپ کے صحیح جانشین ہوئے، علوم و معارف اور درس و افادہ میں وہی راستہ اختیار کیا، جو عمر بھر جلیل القدر باپ نے اختیار کیے رکھا تھا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا اور وہ اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت کا موثر ذریعہ بنے[۱۴۷]

۷۱۔ قاضی مراد الدین کشمیری

قاضی مراد الدین کشمیری فقہی مسلک میں حنفی تھے۔ مولد و منشا کشمیر ہے۔ مولانا عنایت اللہ کشمیری (متوفی رمضان المبارک ۱۱۲۵ھ) اور بعض دیگر فحول علمائے وقت کے شاگرد تھے۔ حصولِ علم کے بعد عازمِ دہلی ہوئے اور مغل حکمران شاہ عالم سے تقرب پیدا کیا۔ بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں منصب قضا سے سرفراز فرمایا۔ خاصا عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں دہلی میں مفتیِ عساکر مقرر ہو گئے۔ پھر ۱۱۵۵ھ میں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان کے قاضی القضاۃ بنا دیے گئے۔ وادیٔ کشمیر کے اس عالم و فقیہ نے بڑی ترقی کی اور اللہ نے ان کے علم و فضل کی بدولت انھیں ملک میں بہت بڑے بڑے اعزازات سے نوازا۔ ۱۱۶۰ھ میں رحلت فرمائی[۱۴۸]

۷۲۔ سیّد مربّی بلگرامی

سیّد مربی بن عبدالنبی بن سیّد طیّب بن عبدالواحد حسینی واسطی

---

[۱۴۷] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۷ بحوالہ بحرِ زخار۔

[۱۴۸] مختصر تاریخ کشمیر (فارسی) ص ۱۳۳۔ از مفتی علاء الدین محمد۔ مطبع رشیدی لاہور، ۱۳۰۱ھ —— نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۶۷۔

بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ گھر میں علم و فیض کی نہر جاری تھی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد سید اسماعیل حسینی بلگرامی سے تحصیل علم کی۔ پھر قنوج گئے اور شیخ یٰسین قنوجی سے اخذِ فیض کیا۔ بعد ازاں موضع "ہرکام" کا عزم کیا، اور کتب درسیہ کی تکمیل نامور عالم شیخ ابو الواعظ ہرکامی سے کی۔ حصولِ علم کے بعد اپنے وطن بلگرام واپس آئے اور درس و افادۂ طلبا میں مشغول ہو گئے۔ وہاں خلقِ کثیر نے اس جیّد عالم و فقیہ سے استفادہ کیا۔

سیّد مربّی کو معرفت و ادراک اور فضل و کمال کے پیکر کی حیثیت حاصل تھی۔ سیّد غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کی ہمہ گیر عزت و تعظیم کے بارے میں مآثر الکرام میں یہ عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ سیّد مربّی ایک مرتبہ کسی تقریب کے سلسلے میں قصبۂ مارہرہ گئے، وہاں سے موضع اترولی تشریف لے گئے۔ شیخ محمد عاقل اترولوی جو تصوف و شریعت میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے، وہیں کے رہنے والے تھے، انھیں معلوم ہوا تو حضرت سیّد ممدوح کے خیر مقدم کے لیے آئے اور شاندار استقبال کیا۔ کمال ادب و نیاز کے ساتھ انھیں اپنے گھر لے گئے اور سر سے دستارِ مبارک اتار کر صحنِ خانہ میں بچھائی، عرض کیا کہ حضرت اپنے قدمِ مبارک اس دستار پر رکھتے ہوئے صحن میں سے گزریں۔ سیّد مربّی اس پر آمادہ نہ ہوئے تو ان کا اصرار بڑھا، بالآخر جب انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو مجبور ہو گئے اور ان کے التماس کے مطابق دستار پر قدم رکھتے ہوئے صحن سے گزرے۔

سیّد مربّی کئی روز شیخ محمد عاقل کے مکان پر اترولی میں مقیم رہے اور اس اثنا میں تصوّف و طریقت کے مختلف مسائل پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جن حضرات نے سیّد مربّی سے اخذِ فیض کیا ان کی طویل فہرست میں سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی اور شیخ محمد عاقل اترولوی کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔

سیّد مربی حسینی بلگرامی دوشنبہ کے دن ۴ شعبان ۱۱۱۷ھ کو اس جہان فانی سے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔[149]

۷۳۔ قاضی مربّی پھانوی

قاضی مربی حسینی ترمذی پھانوی بارھویں صدی ہجری کے مشہور ہندی شیخ اور فقیہ تھے۔ رجال علم وصلاح میں ان کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولد ومنشا "پھانی" ہے جو اس زمانے میں ایک گاؤں تھا۔ مختلف بلاد وقصبات میں جا کر فاضل اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر سیّد قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ) کی خدمت میں آئے اور ان سے مروجہ درسیات کی آخری کتابیں پڑھیں اور فقہ واصول کے اونچے مرتبے پر فائز ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد فرخ آباد کی مسندِ قضا پر متمکن کیے گئے۔

قاضی مربّی کتب درسیہ پر اس درجے عبور رکھتے تھے کہ منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم کی شرح لکھی اور میر زاہد پر حاشیہ تحریر کیا۔[150]

۷۴۔ سیّد مرتضیٰ ملتانی

سیّد مرتضیٰ حسینی ملتانی کا تذکرہ خافی خاں نے منتخب اللباب (جلد دوم) میں اورنگ زیب کے آخری عہد یعنی ۱۱۱۸ھ کے واقعات میں کیا ہے، اور انھیں مرتضیٰ واعظ لکھا ہے۔ یہ دیارِ ہند کے فحول علما اور مشہور مشائخ

---

[149] مآثر الکرام ص ۹۴ تا ۹۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۸ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۶ — تقصار جیود الاحرار، ص ۲۰۹، ۲۱۰

[150] تاریخ فرخ آباد — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۸

میں سے تھے ۔ نہایت صالح اور متدیّن عالم تھے ۔ اصلاً ملتان کے باشندے تھے ۔ عابد و زاہد، تہجد گزار، جرأت مند، کثرت سے روزہ رکھنے والے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں انتہائی تیز، احکام الٰہی کی تبلیغ و اشاعت میں نہ کسی سے ڈرتے اور نہ کسی نوع کا خوف دل میں لاتے، اہلِ بدعت کے خلاف شمشیر برہنہ، نہ خود اہلِ دنیا سے اختلاط و ارتباط رکھتے اور نہ انھیں قریب آنے کا موقع دیتے، نہ کسی سے نذر و نیاز لیتے، اور نہ ایسے جائز ہی سمجھتے ۔ ملوک و سلاطین سے کبھی کوئی چیز قبول نہ کرتے، نہ خراجی زمینوں سے کوئی چیز لیتے اور نہ ماہانہ یا سالانہ نقدی یا جنس کی صورت میں کوئی شے وصول کرتے ۔ عالی ہمّت، خود دار اور دین کے معاملے میں انتہائی غیور ۔ بعض اہلِ علم سماع کو جائز سمجھتے ہیں، لیکن سیّد مرتضیٰ ملتانی اس کے قریب تک نہ جاتے اور قائلینِ سماع سے سختی کا برتاؤ کرتے ۔ شب برات اور عاشورہ کے موقع پر بعض حلقوں میں جو رسوم و رواج پائی جاتی ہیں اس سے شدت کے ساتھ منع فرماتے، عیدین کا چاند دیکھنے کے بعد بھی کچھ لوگوں میں غیر شرعی امور کے ارتکاب کی عادت پڑ گئی ہے، اس سے پوری قوت سے روکتے ۔ میّت کے تیجے، ساتویں، دسویں اور چالیسویں کی شدید مخالفت کرتے اور ختم وغیرہ کے نام پر جو کچھ پکایا اور کھلایا جاتا ہے، اسے قطعی ناجائز ٹھہراتے ۔ فرمایا کرتے کہ کچھ لوگ اللہ کے نام پر کھانا پکاتے ہیں، لیکن غریبوں، مسکینوں اور مستحق لوگوں کو دینے کے بجائے یا تو خود کھا جاتے ہیں یا اپنے اعزہ و اقربا اور امیر طبقے میں تقسیم کر دیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی بری بات ہے ۔

سیّد مرتضیٰ ملتانی بدعات و محدثات کو کسی شکل میں بھی برداشت کرنے کے عادی نہ تھے ۔ پکے ہوئے کھانے یا پھل وغیرہ پر ختم پڑھنے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی جو رسم چل نکلی ہے، اس کی سختی سے تردید کرتے، اسے

خلاف شریعت قرار دیتے اور لوگوں کو اس سے منع فرماتے۔ تمباکو نوشی کو حرام قرار دیتے اور اس میں سختی کرتے۔ علمائے سُو کو سخت الفاظ میں مطعون ٹھہراتے اور امرائے مملکت اور عمالِ حکومت سے ان کی مصاحبت کو ہدفِ تنقید بناتے، جو اصحابِ علم اغنیا سے ربط و تعلق کی بنا پر امورِ شرع میں مداہنت کا ثبوت دیتے اور معاملاتِ دین میں نرمی برتتے ہیں ان کو ہرگز قابلِ معافی نہ سمجھتے۔ ان لوگوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ حصولِ مال کی غرض سے امرا کی مجلسوں میں جاتے اور فسق و فجور کے ارتکاب میں عملاً ان کی حوصلہ افزائی کا باعث بنتے ہیں۔

مشائخ کی قبروں پر عرس منعقد کرنے، وہاں رقص و سرود کی محفلیں جمانے اور سماع و غنا کا اہتمام کرنے پر شدید تنفر کا اظہار فرماتے، اور اس قبیل کے تمام افعال کو مکروہات و منکرات میں گردانتے۔ وہ برسرِ منبر اس کی نکیر کرتے اور اپنے قول و عمل سے جہاں تک ممکن ہوتا اس نوع کی حرکات سے لوگوں کو منع فرماتے۔

سید مرتضی ملتانی کا شمار بارھویں ہجری کے فحول علما، جلیل القدر مشائخ اور زور دار واعظین میں ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ کسی کو اپنے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کی دعوت نہ دیتے۔ اگر کوئی ان سے بیعت ہونا چاہتا تو صاف لفظوں میں فرماتے کہ میں تمھیں برائی سے رکنے اور منکرات سے دامن کشاں رہنے کی تاکید کرتا ہوں اور پوری قوت سے تلقین کرتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے ہر قسم کی برائی کا دروازہ بند کر دینے کے لیے جد و جہد کرو۔ وہ لوگوں سے اس بات کا اقرار لیتے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں، جن برائیوں کا ارتکاب ان سے ہو چکا ہے، اس سے اللہ کے حضور نہایت عجز و انکساری سے عفو و درگزر کی درخواست کرتے ہیں اور اس کے سامنے مغفرت کے لیے اپنا دامن پھیلاتے ہیں۔ ہم اللہ

سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں معصیت سے کنارہ کش رہنے اور خلافِ شرع امور سے بچنے کی توفیق مرحمت فرمائے گا۔

سیّد مرتضیٰ ملتانی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے کے عالم تھے جب آبادیوں کا یہ پھیلاؤ نہ تھا، جو موجودہ دور میں ہمارے سامنے ہے۔ نہ شہروں اور قصبوں میں یہ بھیڑ تھی، جس سے آج کل ہم دوچار ہیں۔ آبادیوں کا سلسلہ بہت محدود تھا، بالخصوص مسلمانوں کی تعداد بڑی کم تھی، لیکن اس کے باوصف ان الفاظ کے ساتھ جو وہ بیعت لیتے تھے، اس سے متاثر ہو کر ملتان اور لاہور وغیرہ کے تین یا چار ہزار افراد ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے تھے اور یہ سلسلہ بلادِ دکن تک وسعت اختیار کر گیا تھا۔

ان کی پاک بازی اور احتیاط کا یہ حال تھا کہ امرائے مملکت کے گھروں سے کھانا نہ کھاتے، اگر روپے وغیرہ کی شکل میں کوئی نذر پیش کرتا تو اس وقت تک قبول نہ فرماتے، جب تک یہ تحقیق نہ کر لیتے کہ اس کے ذرائع آمدنی کیا ہیں، اس کا کاروبار کیا ہے، وہ جو مال لے کر آیا ہے، یا جس سے کھانا کھلانا چاہتا ہے وہ حلال اور طیب ہے، مشکوک تو نہیں یا اس میں حرمت کا کوئی شائبہ تو نہیں پایا جاتا، وہ اپنے اہل وعیال کے حقوق ادا کرتا ہے، اللہ نے اپنے اور اپنے بندوں کے جو فرائض اس پر عائد کیے ہیں انھیں پورا کرتا ہے، اپنے مال سے عشر یا زکوٰۃ وغیرہ دیتا ہے۔ اگر تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ اس کی آمدنی حلال ذرائع کی ہے تو دعوت قبول فرما لیتے، ورنہ بلا جھجک رد کر دیتے۔ اس بات کی قطعاً پروا نہ کرتے کہ لوگوں پر ان کے قول وفعل کا کیا اثر پڑے گا اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ نہ یہ دیکھتے کہ دعوت کرنے والا کتنا بڑا آدمی ہے۔

امورِ شرع کی اس زبردست حمایت اور بدعات ومنکرات کی سخت مخالفت کی پاداش میں انھیں مخالفین کی طرف سے مبتلائے اذیت کیا گیا

اور کئی قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں مگر اس مردِ باہمت نے کوئی پروا نہیں کی۔ ایک مرتبہ وہ دکن کے مشہور شہر اورنگ آباد پہنچے اور معمول کے مطابق وعظ کہا جس میں اہلِ بدعت پر شدید نکیر کی اور علما و مشائخ کو اللہ کے دین میں ان کی مداہنت کی وجہ سے مطعون ٹھہرایا۔ بات حکومت کے ایوانوں تک پہنچی تو اورنگ آباد کے قاضی نے جس کا نام محمد اکرم تھا، سیّد مرتضیٰ کو اپنی عدالت میں طلب کیا۔ وہ قاضی کی عدالت میں گئے تو وہاں کے لوگ بھی ایک ہجوم کی شکل میں قاضی کے پاس پہنچ گئے، یہ لوگ اس طریقے سے قاضی کی مخالفت اور سیّد مرتضیٰ کی حمایت کر رہے تھے کہ سیّد مرتضیٰ کو خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں قاضی کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ وہ خود ہجوم میں آئے اور لوگوں کو آگے بڑھنے اور قاضی کی مخالفت کرنے سے روکا۔ اس کے بعد وہ قاضی کے سامنے بیٹھے ہوئے تو قاضی نے ان سے تمباکو کی حرمت اور حلت کے مسئلے پر بحث شروع کر دی۔ بالآخر قاضی نے ان سے کہا کہ جس مسجد میں وہ وعظ کہہ رہے ہیں، وہ اتنی تنگ ہے کہ لوگ اس میں سما نہیں سکتے۔ قاضی کی گفتگو کے سیاق و سباق سے پتا چلتا ہے کہ اس کا اصل مقصد ان کے وعظ و تبلیغ میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر تھا اور وہ بعض قلعوں کی تسخیر کے سلسلے میں پونے میں مقیم تھا۔ سیّد مرتضیٰ ملتانی بادشاہ کے پاس پہنچے اور اس کو اپنا تصنیف کردہ ایک رسالہ پیش کیا جس کا نام "حق گو" تھا۔ اورنگ زیب نے ابھی اس کے تین ہی صفحے پڑھے تھے کہ فرطِ ادب و تاثر سے رسالہ زانو پر رکھ لیا اور کہا الحمد للہ ثم الحمد للہ! میری مملکت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بلا کسی خوف و خطر کے مسائلِ شریعتِ مطہرہ کی وضاحت اور کلمۂ حق کی تبلیغ میں ہر آن کوشاں رہتے ہیں۔

اورنگ زیب جو خود بھی شریعت کا عالم اور نیک بادشاہ تھا، سیّد

مرتضیٰ کے علم و اخلاص سے نہایت متاثر ہوا اور اپنے بیٹے کام بخش کو حکم دیا کہ انھیں شاہی محل میں لے جائے اور جو یہ ارشاد فرمائیں اس پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے سید مرتضیٰ سے تحائفِ بادشاہی قبول فرمانے کی درخواست کی۔ لیکن سید صاحب نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ بادشاہوں اور حکمرانوں سے تحائف و ہدایا قبول کرنا ان کے معمول کے خلاف ہے۔ بادشاہ پر ان کے انکار کا بہت ہی خوش گوار اثر پڑا۔

کچھ عرصے بعد اورنگ زیب بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ سید مرتضیٰ بہت دیانت دار عالمِ دین ہیں تو ان سے عہدۂ احتساب پر متعین ہونے کی درخواست کی اور کہا کہ جس شہر کی آب و ہوا ان کی طبیعت کے موافق ہو، اس میں سکونت اختیار کر لیں، وہ فرمائیں کہ کس شہر کی فضا ان کے قیام کے لیے مناسب رہے گی، میں اس کے لیے تحریری حکم جاری کر دیتا ہوں۔ سید مرتضیٰ نے جواب دیا کہ میں خواص کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں، عوام تو پہلے ہی سے میری بات مانتے ہیں، اگر اس کے لیے حکم جاری کیا جائے تو حاضر ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ "خواص" سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں یہ بات سمجھ نہیں سکا۔

اورنگ آباد کا قاضی محمد اکرم بھی اس وقت موجود تھا، وہ سید مرتضیٰ کا مخالف تھا۔ ان کے افکار و تصورات سے شدید اختلاف کرتا اور ان کی ذات سے عناد رکھتا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر بادشاہ کو جواب دیا کہ "خواص" سے سید کی مراد اولیائے کرام کی قبریں ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں اولیا کی قبروں پر مامور کر دیا جائے اور یہ برسرِ منبر کہا کرتے ہیں کہ جن قبروں پر غنا کی محفلیں اور سماع کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں، ان میں سے بزرگوں کی ہڈیوں کو نکال کر جلا دیا جائے۔

اورنگ زیب نے کہا، میرے خیال میں سید مرتضیٰ کا یہ مطلب نہیں ہے، وہ صرف ان بدعات کے مخالف ہیں جن کا قبروں پر ارتکاب کیا جاتا ہے۔

سید مرتضیٰ نے اپنے متعلق قاضی محمد اکرم کی اس توجیہ کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ یہ مجھ پر افترا باندھ رہے ہیں۔ میں اولیائے کرام کا پورا احترام کرتا ہوں اور ان کی تعظیم کو ضروری قرار دیتا ہوں۔ لیکن ان کے نام پر جو بدعات و محدثات کا سلسلہ جاری ہے، اس کی کسی صورت میں تائید نہیں کر سکتا۔ اصل دین وہی ہے جو اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا، وہ ہر قسم کے شرک سے بالکل پاک ہے۔ میں اسی دین کا حامی اور مبلغ ہوں، جس کی ترویج و اشاعت آنحضرت نے فرمائی۔ باقی سب غلط ہے۔ قاضی محمد اکرم میرے بارے میں سراسر افترا اور کذب بیانی سے کام لے رہے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور برہان پور کو روانہ ہو گئے۔ اس زمانے کے بعض مشائخ و علما نے ان کو سخت پریشانی میں مبتلا کیا اور ان کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ وہ وعظ و تبلیغ کے لیے مسجد میں منبر پر کھڑے ہوتے تو ان کی اہانت کی، جس کی بنا پر وہ لوگوں سے علیحدہ ہو گئے اور بالکل گوشہ گیر ہو کر گھر میں بیٹھ گئے، اور اسی حالت میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر کے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انھیں زہر دے کر قتل کر دیا گیا تھا۔[1]

۷۵۔ شیخ مرتضیٰ عباسی چریاکوٹی

شیخ مرتضیٰ عباسی چریاکوٹی ۱۰۴۹ھ میں چریاکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ یحییٰ اور جدِ امجد کا اسمِ گرامی شیخ عبدالحق تھا۔ آباو اجداد

---

[1] منتخب اللباب ج ۲، ص ۵۶۱ تا ۵۶۵۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر،

اصحابِ علم و فضل تھے۔ ان کے نانا شیخ عبدالفتاح بن مبارک عباسی چریاکوٹی بھی ذی علم بزرگ تھے۔ بہت سی درسی کتابوں کی تکمیل نانا ہی سے کی پھر والدِ محترم شیخ یحییٰ سے اخذِ علم کیا اور طویل عرصے تک ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اکابر فقہائے حنفیہ میں شمار کیے گئے۔ اپنے گرامی قدر نانا شیخ عبدالفتاح کی تصنیف "میراث نامہ" کی شرح سپردِ قلم کی۔ خود اپنی ایک تصنیف "کتاب الرضوانی" اپنی یادگار چھوڑی۔

شیخ مرتضیٰ عباسی نے ۱۱۰۹ھ کو چریاکوٹ میں انتقال کیا۔[۱۵۲]

۷۶۔ مرزا خان جالندھری

مرزا خان کا لقب اوحدالدین تھا۔ مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے مشہور عالم و صوفی بہلول برکی کے والد تھے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ انھوں نے "نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سید الانس والجان" کے نام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاتِ مبارکہ میں ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں موجود ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ سید علیم اللہ حسینی جالندھری نے جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے، اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور اس ترجمے کو انھوں نے " نثر الجواھر فی تلخیص سیر ا لج الطیب والطاھر" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ فارسی ترجمہ ۱۹۰۲ء میں "پیسہ اخبار" (لاہور) سے شائع ہوا۔ فاضل مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے:

"میں نے محسوس کیا کہ اوحدالدین مرزا خان برکی جالندھری کی عربی کتاب "نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سید الانس والجان" اگرچہ

۱۵۲۔ نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷۱ بحوالہ تاریخ مکرم

مبسوط و مفصل نہیں، تاہم نادر معلومات کو محیط ہے اور ہر چند کہ خواص ہی اس سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور عوام اس کے اشارات و مندرجات سے محروم رہتے ہیں، اس لیے میں نے خیال کیا کہ عوام کو سمجھانے کے لیے اختصار کو بہ صورت تفصیل پیش کر کے اس کا ترجمہ "نثر الجواہر فی تلخیص سیر ابی الطیب والطاہر" کے نام سے فارسی میں کر دوں۔ چنانچہ میں نے کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا۔[۱۵۳]

سٹوری نے "نظم الدرر" اور "نثر الجواہر" دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے، لیکن تفصیل بتاتے ہوئے اس سے سہو ہو گیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ کتاب نظم الدرر سید علیم اللہ حسینی کی تصنیف ہے اور مرزا خاں نے "نثر الجواہر" کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔[۱۵۴] لیکن جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، حقیقت اس کے برعکس ہے۔

مرزا خان نے نظم الدرر کے علاوہ مندرجہ ذیل رسائل بھی تصنیف کیے، جن کے خطی نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطاتِ شیرانی میں موجود ہیں۔

۱۔ کتمان الاسرار: نمبر ۲۱۵۸ اوراق ۵۶، ورق ۱ تا ۱۶ موجود نہیں۔ یعنی کتاب ناقص ہے۔

۲۔ تنبیہ الاغبیا: نمبر ۲۱۵۸۔

۳۔ شرح اقوال جنید بغدادی: نمبر ۲۱۵۸۔

سماع کے بارے میں بھی انھوں نے ایک رسالہ تصنیف کیا، جس کا حوالہ ان کے فرزند بہلول برکی (نے جو اپنا نام بہلول گول برکی بتاتے ہیں)

۱۵۳؎ نثر الجواہر فی تلخیص سیر ابی الطیب والطاہر، ص ۲

۱۵۴؎ پرشین لٹریچر، ص ۲۰۶

اپنے ایک رسالے سیف المسلول کے دیباچے میں دیا ہے[۵۵]

۷۷۔ سید معظم شاہ سورتی

سید معظم شاہ حسینی سورتی ہندوستان کے مشہور شہر "سورت" میں پیدا ہوئے، نشو و نما بھی وہیں ہوئی اور اساتذۂ عصر سے تعلیم پائی، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں گردانے گئے۔ ان کے والد سید شاہ بھی اپنے دور کے نامور عالم تھے اور سورت کی مسند مشیخت پر فائز تھے۔ لائق بیٹے نے باپ کی وفات کے بعد ۱۱۳۵ھ میں ان کی جگہ سنبھالی[۵۶]

۷۸۔ مولانا معین الدین عثمانی منیری

مولانا معین الدین عثمانی منیری، شیخ، متقی، عالم اور بہت بڑے صوفی فقیہ تھے۔ اصلاً اعمال بہار کے ایک گاؤں "مدھور" کے باشندے تھے۔ وہاں سے موضع "منیر" میں منتقل ہو گئے تھے، جو ان کے ننھیال کا مسکن تھا۔ بڑے ہوتے تو حصول علم کے لیے جون پور چلے گئے جو اس زمانے میں علم و فضل کا مرکز تھا۔ وہاں کے علما و اساتذہ سے درسی کتابیں پڑھیں اور صاحب رشید یہ شیخ محمد رشید جون پوری اور ان کے لائق فرزند شیخ محمد ارشد جون پوری سے اخذ طریقت کیا۔ کافی عرصے تک ان دونوں سے مستفیض ہوتے رہے۔ بعد ازاں منیر واپس آ گئے اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے۔ بہت سے علما و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ معین الدین عثمانی منیری نے ۵ شعبان ۱۱۳۱ھ کو منیر میں

---

[۵۵] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۴ ذیل لفظ "برکی"

[۵۶] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۷۴، بحوالہ حقیقۃ السورۃ

وفات پائی اور شیخ یحییٰ منیری کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔[۱۵۷]

۷۹۔ شیخ موسیٰ امیٹھوی

شیخ موسیٰ بن عبدالرقیب بن جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی شیخ صالح تھے اور فضل و صلاح میں ممتاز۔ ۱۰۳۳ھ کو موضع امیٹھی میں پیدا ہوئے اور اپنے والدِ گرامی شیخ عبدالرقیب سے جو علم و عمل میں بڑی شہرت رکھتے تھے، علمِ فقہ کی تعلیم پائی، طریقت و سلوک کی منزلیں بھی انہی کی نگرانی میں طے کیں اور والد کی وفات کے بعد دعوت و ارشاد میں کمر بستہ ہو گئے۔

شیخ موسیٰ نے ۸۷ برس کی عمر پاکر ۱۱۲۰ھ کو امیٹھی میں انتقال کیا۔[۱۵۸]

۸۰۔ مفتی میراں بیجاپوری

شیخ میراں بیجاپوری کا مولد و منشا بیجاپور ہے۔ شیخ محمد بن عبدالرحمٰن بیجاپوری اور دیگر علمائے کرام سے علم حاصل کیا، اور فقہ و اصول اور دیگر علوم میں ممتاز قرار پائے۔ اپنے علم و فضل کی بدولت عہدِ عالم گیری میں حیدرآباد کے منصب افتا پر مامور ہوئے اور درس و تدریس کی مسند کو زینت بخشی۔ کبر سنی کو پہنچے تو حیدرآباد کے محکمہ افتا سے الگ ہو کر بیجاپور تشریف لے گئے اور وہاں اقامت اختیار کر لی۔ لیکن کچھ عرصے بعد پھر حیدرآباد چلے گئے تھے۔ ۱۱۲۵ھ میں وہیں وفات پائی۔[۱۵۹]

۱۵۷ھ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷۴، بحوالہ گنج ارشدی

۱۵۸ھ ایضاً، ص ۳۷۷

۱۵۹ھ محبوب ذی المنن ج ۲، ص ۷۹۸، ۷۹۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷۹

ن

۸۱- قاضی نجم الدین برہان پوری

قاضی نجم الدین برہان پوری کے والد کا نام حبیب احمد تھا۔ مسلکاً حنفی تھے۔ شیخ اور فاضل شخص تھے۔ فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ عہدِ عالم گیری میں عادل آباد کے منصبِ قضا پر متعین ہوئے اور اس کی موت کے بعد عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ مشہور عالم مولانا عباس برہان پوری کے داماد تھے[1]

۸۲- مولانا نجم الدین برہان پوری

اسی نام کے برہان پور میں ایک اور عالم دین مولانا نجم الدین عباس تھے، یہ بھی حنفی المسلک تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے مشاہیر علما و فقہا اور اکابر اصحابِ تصوّف میں ہوتا تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں زیادہ مشہور کتابیں یہ ہیں:

نجم العلم۔ یہ عین العلم کی شرح ہے اور عربی زبان میں ہے۔
الصحف المطہرہ۔ علم الیقین ترجمہ الحقائد السنیہ۔ بزبانِ فارسی[2]

۸۳- سید نصیر الدین ہروی برُہان پوری

سید نصیر الدین ہروی برہان پوری، برہان پور کے نامور عالم، ممتاز شیخ اور مشہور فقیہ تھے۔ بہت ہی پرہیز گار اور متقی تھے۔ اکل و شرب

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۰ بحوالہ تاریخ برہان پور

[2] ایضاً۔

اور لباس وغیرہ کے معاملے میں انتہائی محتاط تھے۔ ہمیشہ ذکرِ الٰہی، نیکی، تقویٰ اور عبادت میں مشغول رہتے، کثرت سے روزے رکھتے اور شب کو قیام کرتے، ہر کام میں اللہ پر توکل رکھتے، ان کا معمول تھا کہ عشا کے بعد دو گھڑی آرام فرماتے اور پھر اُٹھ کھڑے ہوتے، تہجد کی نماز پڑھتے اور تلاوتِ قرآن کرتے۔ قرآن مجید کی تلاوت میں اس درجے رقت طاری ہو جاتی کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور قمیص بھیگ جاتی۔

سید نصیر الدین ابتدائے جوانی ہی میں دونوں پاؤں اور بائیں ہاتھ سے معذور ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود کسی کے محتاج نہ تھے۔ قرآن مجید، کتب تفسیر اور تصوّف و سلوک کی مختلف کتابوں کی کتابت کرتے تھے اور اس سے جو آمدنی ہوتی تھی اس سے گزر اوقات کرتے تھے۔

اہلِ دنیا اور اربابِ حکومت سے نہ خود کوئی اختلاط رکھتے اور نہ انھیں موقع دیتے کہ وہ ان سے ارتباط رکھ سکیں۔ نہ کسی سے کوئی نذر قبول کرتے اور نہ کسی بہانے کوئی چیز لیتے۔ اگر کسی طرف سے کوئی ہدیہ قبول فرمانے پر مجبور بھی ہو جاتے تو اس سے بہتر صورت میں اس کا بدلہ دیتے۔

امرائے سلطنت اور والیانِ ملک سے نہ صرف ربط و تعلق سے گریز فرماتے بلکہ ان سے سخت نفرت کرتے اور نہایت تلخ کلامی سے پیش آتے، کوئی ان میں سے ملاقات کو حاضر ہوتا تو چہرے پر کبیدگی و خفگی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ وہ لوگ نذر و نیاز کی شکل میں کوئی چیز پیش کرتے تو صاف لفظوں میں لینے سے انکار کر دیتے۔ ان کو نصیحت بھی کرتے تو تلخ کلامی سے کرتے تاکہ وہ ان سے نفرت کرنے لگیں اور آنا جانا بند کر دیں۔

خافی خاں نے سید نصیر الدین کا تذکرہ ۱۱۱۸ھ کے واقعات و حوادث کے ضمن میں کیا ہے، اس کے نقل کردہ مندرجہ ذیل دو واقعے قابلِ مطالعہ ہیں:

۱- ایک مرتبہ علاقۂ برہان پور کا والی منور خاں سیّد نصیر الدین کی خدمت میں حاضر ہوا، اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق خاصا لاؤ لشکر اس کے ہم عنان تھا اور یہ لوگ ہاتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ سید نصیر الدین نے اس علاقے کے والی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تمھارے ہاتھیوں اور لشکریوں کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں اور لوگوں کی آمد و رفت میں سخت دقت پیش آتی ہے۔ تمھارا یہاں آنا رعایا کے لیے تکلیف اور زحمت کا باعث بنتا ہے، اس میں عوام کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے، وہ ان پر تمھارا بہت بڑا ظلم ہے۔ چوں کہ تم میرے پاس آتے ہو، اس لیے اس ظلم میں خود یہ فقیر بھی شریک ہوتا ہے۔

منور خاں نے جواب میں عرض کیا: "ہم محض اس لیے حاضر ہوتے ہیں کہ آپ اپنی باطنی توجہ ہم پر مبذول فرمائیں اور ہمیں اپنی طرف کھینچیں"۔

فرمایا! بارگاہِ الٰہی میں میرے جیسا گناہ گار کون ہوگا کہ مجھے اس نے دونوں پاؤں اور ایک ہاتھ سے محروم کر دیا ہے۔ یہ میری معصیت کا نتیجہ ہے۔ تم اپنی رعایا کو پریشانی میں نہ ڈالو، اور معاملاتِ حکومت میں اللہ کی مخلوق پر رحم کرو، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی کوئی عذاب نازل ہو جائے۔

۲- سیّد نصیر الدین کے استغنا اور اللہ پر توکل کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ عنایت اللہ خاں نے جو سید نصیر الدین کے عقیدت مندوں میں سے تھا، بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بیت المال سے سید ممدوح کے لیے کچھ رقم عطا کر دے۔

عنایت اللہ خاں نے مندرجہ ذیل چار اوصاف کی وجہ سے ان کو قابلِ امداد قرار دیا:

۱- سید نصیر الدین سادات سے تعلق رکھتے ہیں:

۲- صاحبِ علم و فضل ہیں۔

۳۔ صاحب صلاح و تقویٰ ہیں۔

۴۔ معذور ہونے کی وجہ سے مستحقِ امداد ہیں۔

اس زمانے میں برہان پور کا صدر خواجہ ادہم تھا۔ بادشاہ نے اس کو خط لکھا کہ وہ اس کو سید موصوف کی مالی حیثیت کے بارے میں تمام حالات سے آگاہ کرے تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ ان کی کس طریقے سے مالی مدد کی جائے، ماہانہ یا سالانہ!

چنانچہ خواجہ ادہم خود سید موصوف کے پاس گیا اور بادشاہ کا خط پڑھ کر سنایا۔ سید نصیر الدین نے ان کو جواب دیا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بادشاہ نے کسی اور نصیر الدین کی امداد کے بارے میں لکھا ہوگا۔ بے شک میرا نام نصیر الدین ہے لیکن میں مستحقِ اعانت یا قابلِ امداد نہیں ہوں۔ خواجہ ادہم کو انھوں نے جن الفاظ میں جواب دیا وہ یہ ہیں:

بایں غلطی و گمان ہم اسمی دیگرے شاید نزدِ من آوردید۔ امّا دریں حکم چہار صفت نوشتہ اند، ازاں جملہ سیادت را انکار نمی تواں نمود و دعویٰ ہم ندارم اما از صلاح و استحقاق و فضیلت کہ نوشتہ اند، تحقیق من است کہ ہیچ کدام در من نیست[۵۳]

یعنی شاید آپ اس غلط فہمی کی بنا پر میرے پاس تشریف لائے ہیں کہ اتفاق سے میرے نام کے ساتھ اس شخص کا نام ملتا ہے اور ہم دونوں ہم نام ہیں۔ بادشاہ کے اس خط میں اس شخص کی امداد کے لیے حکم جاری کیا گیا ہے جو چار صفات کا حامل ہے، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ سید ہے۔ سید ہونے سے نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ اس کا دعوے دار ہوں۔ دوسری صفت صلاح و تقویٰ ہے۔

---

[۵۳] منتخب اللباب ج ۲، ص ۵۵۸ —— نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۱، ۳۸۲۔

تیسری استحقاق، اور چوتھی فضیلتِ علمی ہے۔ مَیں اپنے طور پر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان صفات میں سے کوئی صفت بھی مجھ میں نہیں پائی جاتی۔

خواجہ ادہم جو علاقہ برہان پور کا صدر تھا، سید نصیر الدین کے اس جواب سے نہایت متعجب اور حیران ہوا، اس نے کہا کہ "شاید آپ کے پاس اللہ پر توکّل کا سرمایہ موجود ہے"۔ فرمایا۔ "کیوں نہیں، یقیناً میرے رزق کی کنجی اس ذاتِ بلند و بالا کے ہاتھ میں ہے جس کے تیرے آقا و بادشاہ جیسے لاکھوں کروڑوں لوگ محتاج ہیں"۔

سید نصیر الدین برہان پوری نے اس سال وفات پائی جس سال کہ شاہ عالم نے اپنے بھائی کام بخش کو قتل کیا تھا۔ ان کی وفات ان دونوں بھائیوں کی لڑائی کے چھ مہینے بعد ہوئی، اور یہ حادثہ ۱۱۱۹ھ کو پیش آیا تھا۔

۸۴۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کا شمار برصغیر کے علمائے اجلّا اور اعاظمِ رجال میں ہوتا ہے۔ وہ اقلیم ہند کے علامۂ شہیر اور صاحب علوم و فنون تھے۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی شیخ قطب الدین سہالوی تھا، جو لکھنؤ سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ایک مقام "سہالی" کے رہنے والے تھے۔

بنیادی طور پر یہ خاندان خالص عرب تھا اور اس کا نسبی تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے تھا۔ جب اسلام کی نشر و اشاعت کے دائروں نے وسعت اختیار کی، اور اس کی پاکیزہ قدریں حدودِ عرب سے نکل کر دیگر ممالک کو متاثر و منور کرنے لگیں تو اس دودمان عالی شان کے ایک صوفی منش بزرگ خواجہ ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری نے

ہرات کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور وہیں ۴۸۱ھ میں وفات پائی۔ خواجہ ممدوح کی اولاد میں سے ایک ذی علم شخص جو جلال الدین انصاری کے نام سے موسوم تھے ہرات سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ دہلی میں انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں تدریس کے ہنگامے بپا کیے۔ بعد میں ان کے اخلاف نے دہلی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کے قریب موضع "سہالی" میں اقامت اختیار کر لی اور درس و تدریس کے سلسلوں میں مشغول ہو گئے۔ قیام سہالی کی وجہ سے یہاں کے علما نے سہالوی کی نسبت سے شہرت پائی۔

شیخ نظام الدین کے والد گرامی شیخ قطب الدین تھے، جو برصغیر کے علما میں ممتاز مرتبے کے حامل تھے۔ وہ تقریباً ۱۰۴۰ھ کو سہالی میں پیدا ہوئے اور ہندوستان کے جلیل القدر علما سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا شغل اختیار فرمایا، اور پوری زندگی اس مقصدِ عظیم کے لیے وقف کر دی۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول منطق و فلسفہ، معانی و بیان، صرف و نحو، ادب و کلام وغیرہ تمام علوم مروجہ کی بھرپور اشاعت کی اور ملک کے بہت سے علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔ شیخ قطب الدین نے ہر طرف سے منقطع ہو کر افادۂ طلبا کو مرکزِ توجہ ٹھہرا لیا تھا، اور امرا و وزرا کی مجالس سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں ان کا شہرۂ علم و فضل دور دور تک پھیل گیا تھا اور خود بادشاہ ان کی کاوش و تحقیق کی ہمہ گیری سے متاثر تھا۔ اس نے کئی دفعہ ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور دربار میں آنے کے لیے کہا، مگر انھوں نے بادشاہ کے دربار سے دور رہنے کو ترجیح دی اور درس و افادہ کو ہر چیز سے مقدم گردانا۔

تین سو سال پیشتر کے حالات کے مطابق سہالی میں شیخ قطب الدین کا بہت بڑا مدرسہ تھا، مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کثیر تعداد میں ان سے استفادہ کرتے تھے۔ تدریس میں ان کو بڑی شہرت حاصل تھی علاوہ

ازیں تصنیف و تالیف، اور زہد و تقویٰ میں بھی ان کو اللہ تعالیٰ نے بلند درجہ عطا فرمایا تھا۔

انصاری اور عثمانی خاندانوں کی کشمکش

سہالی میں اس زمانے میں دو مشہور خاندان آباد تھے۔ ایک عثمانی خاندان اور دوسرا انصاری خاندان، مولانا قطب الدین کا تعلق انصاری خاندان سے تھا۔ سہالی کے گرد و نواح میں خان زادے مقیم تھے، ان کا سہالی کے ایک شخص چودھری محمد آصف سے جو انصاری خاندان سے تھا، زمین کی سرحدوں کے سلسلے میں ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔

محمد آصف سہالی کا بڑا زمیندار اور مولانا قطب الدین کا سسر تھا۔ اس تعلق کی بنا پر خان زادوں کو مولانا ممدوح سے بھی عداوت ہو گئی تھی، لیکن مولانا کو چوں کہ بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں بہت عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لہٰذا یہ لوگ انھیں کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ سوئے اتفاق سے سہالی میں عثمانی خاندان کے جو لوگ آباد تھے، ان کے اور محمد آصف انصاری کے درمیان آب پاشی کے بارے میں نزاع پیدا ہو گیا۔ بات آگے بڑھی اور فریقین مقابلے پر اتر آئے تو مولانا قطب الدین بیچ میں پڑے اور دونوں طرف کے لوگ جو لڑائی کے لیے مسلح ہو کر آئے تھے واپس چلے گئے۔

مولانا قطب الدین کی شہادت

لیکن بعد میں حالات نے ایسا خطرناک رخ اختیار کیا کہ سہالی کے نواح میں رہنے والے ان خان زادوں نے سہالی پر حملہ کر دیا اور کئی سو آدمی گاؤں کے اندر گھس آئے۔ انھوں نے عثمانی خاندان کے لوگوں کو انصاری خاندان کے خلاف خوب بھڑکایا اور انھیں اپنی امداد کا یقین دلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے مل کر محمد آصف کے مکان پر ہلّہ بول دیا۔ سنگ دل حملہ آوروں نے مولانا قطب الدین کے مکان کا بھی محاصرہ کر لیا اور اچانک اندر گھس کر

تیروں، بندوقوں اور تلواروں سے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا۔ مولانا موصوف بھی جامِ شہادت نوش کر گئے۔

یہ حادثہ ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ (۲۷ مارچ ۱۶۹۲ء) کو پیش آیا۔ مولانا کی موت چونکہ مظلومانہ موت تھی، لہٰذا موت کے بعد "شہید" کا لفظ مولانا قطب الدین کے نام کا جز ہو گیا اور وہ مولانا قطب الدین شہید کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی شہادت پر کسی نے ایک مصرعہ کہا تھا، آزاد بلگرامی نے پہلے تین مصرعے لگا کر رباعی بنا دی:

علامہ بحرِ زاخرِ فضل و ہنر ۔۔۔ در دامنِ اربابِ طلب ریخت گہر

دل خون شد و تاریخ وفاتش فرمود ۔۔۔ قطبِ عالم شدہ شہیدِ اکبر ۱۱۰۳

فرنگی محل لکھنؤ میں سکونت

مولانا قطب الدین انصاری سہالوی کی شہادت کے وقت ان کے چار بیٹے تھے۔ محمد اسعد، محمد سعید، نظام الدین اور محمد رضا۔ ان سب حضرات کا شمار اپنے زمانے کے شیوخ اور جید علما میں ہوتا تھا۔ والدِ گرامی کی شہادت کے بعد یہ حضرات سہالی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو رہائش کے لیے "فرنگی محل" کی عمارت عطا کر دی تھی، اسی لیے بعد میں "فرنگی محلی" کی نسبت ان کے نام کا ضروری حصہ بن گئی۔ مولانا قطب الدین اور ان کی شہادت کا مفصل ذکر "فقہائے ہند" کی جلد پنجم کے حصہ اوّل میں آچکا ہے[1]۔ ان کے بیٹوں میں سے شیخ محمد اسعد شیخ محمد رضا اور شیخ محمد سعید کا ترجمہ اس کتاب کی گزشتہ سطور میں بسلسلہ ردیف م تحریر ہوا ہے۔ اب ذیل میں شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کے حالات بیان کیے جا رہے ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے فقہائے ہند۔ ج ۵، ص ۳۲۲ تا ۳۳۵

شیخ نظام الدین کی تحصیل علم

شیخ نظام الدین، شیخ قطب الدین سہالوی کے تیسرے فرزند تھے۔ والد کی شہادت کے وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی اور طالب علمی کا زمانہ تھا۔ شیخ قطب الدین نے ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ (مطابق ۲۷ مارچ ۱۶۹۲ء) کو جام شہادت نوش کیا۔ اس حساب سے ان کا سن ولادت تقریباً (۱۰۸۸ھ-۱۶۷۷ء) بنتا ہے۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور مسند درس پر خود ان کے والد گرامی قدر شیخ قطب الدین متمکن تھے۔ ابتدائی درسی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ والد کی شہادت کے بعد پورا خاندان لکھنؤ کے علاقہ فرنگی محل میں اقامت گزین ہو گیا تو تکمیل علم کے لیے کوشاں ہوئے چنانچہ اس سلسلے میں مختلف بلاد و قصبات میں گئے، اور جلیل القدر علما سے استفادہ کیا، جن میں شیخ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ) شیخ غلام نقشبند لکھنوی (متوفی رجب ۱۱۲۶ھ) اور بعض دیگر فحول علمائے عصر شامل ہیں۔

مسند تدریس

تحصیل علم سے فارغ ہوتے ہی شیخ نظام الدین اپنے والد بزرگ وار کی مسند درس پر فائز ہوئے اور چند ہی دنوں میں ان کا آستانۂ علم معمورۂ ہند کے بہت سے علاقوں کے علما و طلبا کا مرجع بن گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علوم ظاہری کی تکمیل سے فراغ کے کئی سال بعد شیخ نظام الدین نے علوم باطنی کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس کی تھی اور اس نواح کے نامور بزرگ شاہ عبدالرزاق بانسوی کے تصوف و طریقت کا نام ہندوستان میں شہرہ تھا۔ شیخ نظام الدین ان کی خدمت میں گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ عبدالرزاق علوم درسیہ سے بہرہ مند نہ تھے، لہٰذا سب لوگوں کو اس بیعت سے تعجب ہوا۔ علمائے فرنگی محل نے

تو بر ملا شیخ کے اس اقدام کی مخالفت کی۔ شیخ کے تلامذہ میں سے ایک صاحب مولانا کمال الدین تھے جو علوم عقلیہ میں بالخصوص دست گاہ رکھتے تھے اور نہایت ذہین اور طباع تھے، اپنے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھوں نے شیخ کی بیعت پر بڑی خفگی کا اظہار کیا اور صاف لفظوں میں شیخ سے کہا کہ آپ نے ایک جاہل کے ہاتھ پر کیوں بیعت کی اور اپنے فضل و کمال کو ایک ناآشنائے علم صوفی کے سامنے کیوں جھکایا؟ انھوں نے اسی پر بس نہیں کی، وہ شاہ عبدالرزاق کی خانقاہ میں پہنچے اور ذہن میں فلسفے کے چند مسائل سوچے کہ شاہ صاحب سے ان کے بارے میں دریافت کریں گے۔ روایت مشہور ہے کہ وہ شاہ عبدالرزاق کے پاس گئے تو شاہ صاحب نے خود ان مسائل کا ذکر چھیڑا، اور اس انداز سے ان پر اظہار خیال فرمایا کہ مولانا کمال الدین بالکل خاموش ہو گئے اور اسی وقت خود مولانا کمال الدین اور ان کے ساتھیوں نے شاہ صاحب کی بیعت کر لی۔

شاہ عبدالرزاق بانسوی نے ۱۱۳۶ھ میں رحلت فرمائی۔ ان کی وفات کے بعد شیخ نظام الدین سہالوی نے ان کے خلیفہ سید اسماعیل بلگرامی۔ (متوفی ۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ) سے فیوض باطنی حاصل کیے۔

اخلاق و عادات

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی ابتدا ہی سے نہایت عمدہ اخلاق و اطوار کے حامل متوکل علی اللہ اور مستغنی المزاج تھے۔ ان کا وہی طریق عمل تھا جو سلف صالحین کا تھا، بے حد نیک اور پرہیز گار تھے، سید غلام علی آزاد بلگرامی "مآثر الکرام" میں ان سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فقیر بہ تاریخ نوزدہم ذی الحجہ سنہ ثمان و اربعین و مائۃ والف در بلدۂ لکھنؤ یک صحبت مولوی را دیدم، طریقۂ سلف صالحین داشت و شعشۂ تقدس از ناصیۂ ہمایوں می تافت[۵۵]

---

۵۵ مآثر الکرام ص ۲۱۲

میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ کو لکھنؤ گیا تو شیخ نظام الدین سے ملا، میں نے دیکھا کہ وہ سلف صالحین کے طریقے پر گامزن ہیں، اور ان کی پیشانی پر تقدس کی شعاعیں چمک رہی ہیں۔

یہی بات آزاد بلگرامی نے اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں بھی لکھی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

انا دخلت لکھنؤ فی التاسع عشر من ذی الحجۃ الحرام سنۃ ثمان واربعین ومائۃ والف واجتمعت بالملا نظام الدین فوجدتہ علی طریقۃ السلف الصالحین وکان یلمع علی جبینہ نور التقدیس[۹۶]۔

یعنی میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ کو لکھنؤ گیا تو ملا نظام الدین سے شرف نیاز حاصل ہوا، میں نے ان کو سلف صالحین کے نقشِ قدم پر پایا۔ ان کی پیشانی پر تقدیس کا نور چمک رہا تھا۔

شیخ نظام الدین کی علمی شہرت چھوٹی عمر ہی میں علما و طلبا کے حلقوں میں پھیل گئی اور امرا و حکام کے درباروں میں پہنچ گئی تھی۔ اگر وہ چاہتے تو ہر قسم کا جاہ و منصب آسانی سے حاصل کر سکتے تھے، لیکن اس طرف کبھی توجہ نہ کی اور دامنِ نفس کو دنیوی آلائشوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ متواتر دو دو تین تین دن کے فاقے ہوتے تھے، اور وہ عالی مرتبت عالم، انتہائی مستقل مزاجی سے برداشت کرتے تھے۔ امرائے مملکت اور اربابِ دولت سے قطعاً میل جول نہ رکھتے تھے۔ ذہنی لحاظ سے اس قدر اونچے مرتبے کے حامل تھے کہ اغنیا و امرا میں سے کوئی حاضر خدمت ہوتا تو بے اعتنائی سے پیش آتے۔ اس کا اندازہ شیخ غلام مخدوم کے اس بیان سے ہو سکتا ہے، جس میں وہ کہتے

---

۹۶ دیکھیے سبحۃ المرجان ۹۵

ہیں کہ:

ایک دن میں شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر تھا اور بیماری کی وجہ سے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، اس اثنا میں امرائے مملکت میں سے ایک صاحب ملاقات کے لیے آئے، ان کے پاسِ ادب سے میں نے چارپائی پر سے اترنا چاہا تو شیخ نے فرمایا، "اصحابِ دولت کو دیکھ کر بدحواس کیوں ہوتے ہو، آرام سے لیٹے رہو۔"

اربابِ حکومت سے بے التفاتی کے بارے میں ان کا ایک اور واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ امرائے شاہی میں سے ایک امیر ہفت ہزاری کا منصب رکھتا اور شیخ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا، اس نے ایک مرتبہ جمعے کے دن عین نماز کے وقت کہلا بھیجا کہ اگر آپ تھوڑی دیر انتظار فرمائیں تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل کر سکوں۔ شیخ نے ذرا انتظار کیا، پھر یہ کہہ کر کہ "نماز اللہ کی رضا کے لیے ہے، اہلِ دنیا کے لیے نہیں ہے"۔ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔

انکسار و تواضع

بلاشبہ شیخ بے نیاز طبیعت کے مالک تھے، لیکن یہ بے نیازی ہر ایک کے لیے نہ تھی، صرف جاہ پسند اربابِ دولت اور امرائے مملکت کے لیے تھی، ورنہ مزاج میں انکسار، تواضع اور مسکینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس سلسلے کے چند واقعات لائقِ مطالعہ ہیں:

ایک مرتبہ ایک ایرانی جس کا نام ابوالمعالی تھا، شیخ کا شہرۂ علمی سن کر ملاقات کے لیے آیا۔ شیخ اپنے معمول کے مطابق نہایت سادگی سے درس گاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے تھے۔ نووارد مہمان کی نظروں کے سامنے ایرانی علما کا جاہ و جلال گھوم رہا تھا، اس کی نگاہِ التفات شیخ کی طرف نہ جا سکی۔ پوچھا مولانا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں؟ فرمایا مولانا کے بارے میں تو میں نہیں جانتا، البتہ

نظام الدین میرا ہی نام ہے۔ ایرانی وہیں بیٹھ گیا اور چند فقہی مسائل ان کے سامنے پیش کیے اور کہا کہ اہلِ حق (یعنی شیعہ مذہب کے ماننے والوں) کے نزدیک اس کا کیا جواب ہے؟ شیخ نے اس کا نقطۂ نگاہ سمجھ کر شیعہ حضرات کی فقہی روایت کے مطابق جواب دیا، وہ نہایت خوش ہوا۔ پھر کہا کہ انہی مسائل کی اہلِ ضلالت (یعنی اہلِ سنت) کے مذہب کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔ شیخ نے اس کے سوال کے جواب میں مسائل متعلقہ کے بارے میں اہلِ سنت کی روایات بیان کیں۔ وہ شیخ کے اسلوبِ کلام اور وسعتِ علم سے نہایت متاثر ہوا، اور کہا کہ ان کے متعلق جو سنا تھا، اس سے کہیں زیادہ پایا۔

علما کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ علمی مباحث کے میدان میں اترتے ہیں تو اس سے اپنے علم کا اظہار اور دوسروں سے امتیازی درجہ حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے وہ حریف کے مقابلے میں عام طور پر خاموشی اختیار نہیں کرتے، بلکہ بہ دستور بحث و مجادلے میں مصروف رہتے ہیں، لیکن شیخ نظام الدین اس نقص سے بالکل مبرہ تھے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب ان سے کسی مسئلے میں بحث کرنے کے لیے تشریف لائے اور آتے ہی مسئلہ دریافت کیا۔ شیخ نے اپنی تحقیق کے مطابق جواب دیا۔ معترض نے اعتراض کیا، اور بربنائے بحث شیخ کی تغلیط کی۔ شیخ چپ ہو گئے۔ انھوں نے مشہور کر دیا کہ میں نے نظام الدین سے علمی مباحث میں گفتگو کی، وہ میرے مقابلے میں چل نہیں سکے اور میں نے ان کو خاموش کرا دیا ہے۔ شیخ کے تلامذہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور اسے اپنے استاذ کی توہین قرار دیا۔ چنانچہ ایک شاگرد ان صاحب کے پاس گئے اور اپنے زورِ بیان اور اسلوب استدلال سے ان کو بالکل ساکت کر دیا۔ یہ واقعہ شیخ کے علم میں آیا تو اس درجے برہم ہوئے کہ اس شاگرد کو حلقۂ درس سے نکال دیا اور فرمایا کہ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت میں فرق آئے۔

شیخ نظام الدین طبعی طور پر نرم مزاج تھے کسی کو پریشان کرنا اور اس سے بدلہ لینا ان کی فطرت میں داخل نہ تھا۔ ہر معاملے میں عفو و درگزر سے کام لینے کے عادی تھے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے مل سکتا ہے کہ ان کے والد شیخ قطب الدین کی مظلومانہ شہادت کے واقعات بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے علم میں لائے گئے تو اس نے عمّالِ حکومت کے نام فرمان بھیجا کہ شیخ قطب الدین کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا گھر بار برباد کردیا جائے۔ چنانچہ لکھنؤ کے صوبے دار نے سرکاری سپاہ بھیج کر ان کا گھر غارت کردیا، مخالفین وطن چھوڑ کر بھاگ گئے اور کچھ عرصے بعد قاتلوں کے اہل خاندان نے جعلی وفات نامہ لکھ کر عالم گیر کے دربار میں پیش کیا کہ قاتل مرگئے ہیں۔ شیخ کے اصل قاتل کا نام اسداللہ تھا، جو سہالی کے نواح میں موضع پینتی پور کا رہنے والا تھا، وہ روپوش ہوگیا اور مدت تک زندہ رہا۔ شیخ نظام الدین جب سہالی کی سکونت ترک کرکے لکھنؤ منتقل ہوگئے اور فرنگی محل میں درس کا سلسلہ شروع کیا تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اس نے شیخ سے خون بہا پیش کرنے کی بھی درخواست کی، لیکن انھوں نے قبول نہیں فرمایا، بلکہ اپنا حصہ معاف کردیا، تاہم ان پر عظیم باپ کی شہادت کا یہ اثر تھا کہ جب قاتل اسداللہ ان کے سامنے آتا تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔ شیخ نظام الدین کی متحمل مزاجی اور بردباری ملاحظہ ہو کہ باپ کے قاتل کو دیکھتے، اور پہچانتے ہیں، وہ ان کے پاس آتا بھی ہے لیکن نہ اس سے قصاص لیتے ہیں (بلکہ اپنا حصہ معاف کردیتے ہیں) اور نہ سرکار میں شکایت کرکے اسے گرفتار کراتے ہیں ــــ اس سے بڑھ کر علوِّ اخلاق کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

تصانیف

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی بہت سی درسی کتابوں کے مصنف، محشی اور شارح تھے۔

مولانا فضل امام خیر آبادی لکھتے ہیں:

تصانیف بسیار در علومِ حکمیہ واصول دارد۔[۵۷]

یعنی اس عالم اجل نے علوم حکمیہ اور اصول میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ شیخ کی تصانیف کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے مسائلِ حدیث، فقہ اصول فقہ، علمِ کلام منطق و فلسفہ اور تذکرۂ رجال، ہر موضوع پر کتابیں تصنیف کیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ رسالہ فی وضوء الرسول: اس میں وضو کے بارے میں حدیث کی روشنی میں مسائل بیان کیے ہیں۔

۲۔ شرح التحریر فی اصول الدین: یہ کتاب اصولِ فقہ کے بارے میں ہے۔ اس شرح کو وہ مکمل نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لائق بیٹے مولانا عبد العلی فرنگی محلی نے جو اپنے علم وفضل کی فراوانی کی وجہ سے "بحر العلوم" کے لقب سے معروف تھے، اس شرح کی تکمیل فرمائی۔

۳۔ شرح مسلّم الثبوت: یہ بھی اصول فقہ کے موضوع پر ہے اور شاندار شرح ہے۔

۴۔ الصبح الصادق شرح منار الانوار: اس کا تعلق بھی اصولِ فقہ سے ہے۔

۵۔ حاشیہ شرح عقائد دوّانی: یہ علمِ کلام سے متعلق ہے۔

۶۔ شرح رسائل مبارزیہ: یہ بھی علمِ کلام سے متعلق ہے۔

۷۔ حاشیہ علی حاشیہ قدیمہ علی شرح تجرید دوانی: اس کا تعلق بھی علم کلام سے ہے۔

۸۔ حاشیہ شمس البازغہ: علم فلسفہ سے متعلق ہے۔

۹۔ حاشیہ شرح ہدایت الحکمت: اس کا موضوع بھی فلسفہ ہے۔

---

۵۷ تراجم الفضلاء، ص ۴

۱۰ - مناقب رزاقیہ : یعنی ملفوظاتِ شاہ عبدالرزاق بانسوی۔
شیخ نظام الدین سہالوی کی یہ تصانیف، حواشی اور شروح عالمانہ اور محققانہ ہیں۔

درسِ نظامیہ کی ترتیب

شیخ نظام الدین کا سب سے بڑا کارنامہ درس نظامیہ کی ترتیب اور معمورۂ ہند کے مدارس عربیہ میں ایک خاص طریقِ تعلیم کا تعین ہے۔ ان سے پہلے بھی کئی سو سال سے مدارسِ ہند میں تعلیم کا سلسلہ جاری تھا اور ملک کے ہر حصے میں علمائے کرام پوری مستعدی سے یہ بنیادی خدمت انجام دے رہے تھے۔ پنجاب میں عرصۂ دراز سے لاہور کو مرکزِ علم کی حیثیت حاصل تھی اور قابل ترین اصحابِ کمال درس و افادہ میں مصروف تھے۔ علاوہ ازیں سیالکوٹ اور سرہند وغیرہ علاقوں میں بھی درس کے حلقے قائم تھے۔ ارضِ کشمیر میں بھی بے شمار اصحابِ فضل کی مسانید تدریس آراستہ تھیں۔

لیکن اس باب میں صوبۂ یو پی کے بلاد و قصبات مثلاً لکھنؤ، سہالی، بلگرام دیوہ، بنارس، گوپامئو، الٰہ آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقے بالخصوص ممتاز اور ہندوستان کے تمام صوبوں میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ صوبہ یو پی میں دس دس پانچ پانچ میل کے فاصلے پر شریف خاندانوں اور عمدہ اوصاف سے متصف لوگوں کے دیہات آباد تھے، جن میں مدارسِ دینیہ کے سلسلے جاری تھے اور نامور فضلا ان میں باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ان مدارس کو سلاطین و امرا کی سرپرستی حاصل تھی اور وسیع تعداد میں طلبا ان میں حصول علم کے لیے آتے تھے۔ علم و فضل کی فراوانی کی بنا پر شاہ جہان بادشاہ پورب کے اس علاقے کو اپنی مملکت کا شیراز قرار دیتا تھا۔ سید غلام علی بلگرامی اُس دَور کے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اگرچہ جمیع صوبہ جاتِ ہند بوجود حاملانِ علوم تفاخر دارند... امّا صوبہ

اودھ والہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں یافت، چہ در تمام صوبۂ اودھ واکثر صوبہ الہ آباد بفاصلہ پنج کروہ نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادی شرفا ونجبا است کہ از سلاطین وحکام، وظائف وزمین و مدد معاش داشتہ اند ومساجد و مدارس وخانقاہات بنا نہادہ، و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بر روئے دانش پژوہان کشادہ وصلائے اطلبوا العلم در دادہ، وطلبۂ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند، و ہر جا موافقت دست بہم داد، بہ تحصیل مشغول می شوند و صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ می دارند، و خدمت ایں جماعہ را سعادت عظمیٰ می دانند۔ صاحب قران ثانی شاہ جہان انار اللہ برہانہ، می گفت۔ "پورب شیراز مملکت ما است"[۵۸]

یعنی اگرچہ ہندوستان کے تمام صوبوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان میں اہلِ علم اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن صوبۂ اودھ اور الہ آباد کا اس خصوصیت میں کوئی دوسرا صوبہ مقابلہ نہیں کر سکتا ـــ صوبۂ اودھ اور الہ آباد میں پانچ پانچ دس دس کوس کے فاصلے پر شرفا اور نجبا کے دیہات آباد ہیں، جن میں نامور فضلا کے سلسلہ ہائے درس جاری ہیں۔ سلاطین و حکام انھیں باقاعدہ وظائف عطا کرتے اور مددِ معاش کے لیے زمینیں دیتے ہیں ۔ انھوں نے مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں اور ان میں جو مدرسین درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان کی مالی امداد کی جاتی ہے ۔ ہر گاؤں میں علما و فقہا نے علم کے دروازے وا کر رکھے ہیں، جن میں دُور و نزدیک سے کثیر تعداد میں طلبا آ کر تعلیم حاصل کرتے اور اپنی استعداد کے مطابق مستفید ہوتے ہیں ۔ ہر علاقے کے طلبا کی اربابِ دولت پوری دیکھ بھال اور ان کے مصارف کی کفالت کرتے ہیں ۔ وہ لوگ علما و طلبا کی خدمت کو اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ اسی

---

۵۸ مآثر الکرام ص ۲۱۳، ۲۱۴

بنا پر صاحب قرانِ ثانی شاہ جہان بادشاہ مرحوم کہا کرتا تھا کہ پورب کا علاقہ ہماری مملکت کا شیراز ہے۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ قیام مدارس اور خدمتِ علماء طلبا کا یہ نظام ۱۱۳۰ھ تک قائم رہا۔ جب برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری صوبہ اودھ کا صوبے دار مقرر ہوا تو اس نے تمام معافیاں ضبط کرلیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء و فضلا کی اولاد نے کسبِ معاش سے مجبور ہو کر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ترک کر کے سپاہ گری کو اپنا پیشہ بنالیا، مدرسے ویران ہو گئے، علمی صحبتیں درہم برہم اور تحقیقی محفلیں ختم ہوگئیں۔ ۱۱۵۹ھ میں الٰہ آباد کا صوبے دار صفدر جنگ مقرر ہوا تو اس نے رہی سہی معافیاں بھی ضبط کرلیں۔ احمد شاہ کے زمانے میں صفدر جنگ کو وزارتِ اعلیٰ کا منصب ملا تو اس کے نائب نے وظیفہ داروں کو مزید تنگ کرنا شروع کیا، اور اس طرح علم کی پُربہار بستیوں پر خزاں چھا گئی اور مدرسے اُجڑ گئے[۹]

غرض ارضِ ہند کے ان عظیم و مشہور مدارس میں سے ایک مدرسہ سہالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھی تھا جو عرصہ دراز سے جاری تھا اور جس سے بے شمار طلبا نے دستارِ فضیلت حاصل کی۔ یہی وہ مدرسہ ہے جو آگے چل کر لکھنؤ کے فرنگی محل کے قالب میں ڈھلا اور درسِ نظامیہ کے سنگ بنیاد کا باعث بنا۔ "درسِ نظامیہ" جو ہمارے برصغیر کی علمی تاریخ اور تدریسی زبان کا سب سے نمایاں لفظ ہے، اس کے بانیٔ اوّل یہی شیخ نظام الدین سہالوی تھے، جن کا اسمِ گرامی ہماری ان گزارشات کا سرعنوان ہے۔ اس کی ترتیب کا اولیں مقام لکھنؤ کے فرنگی محل کی چار دیواری ہے۔ اسے ایک بلند بخت عالمِ دین نے ایسی ساعتِ سعید میں مرتب فرمایا کہ پشاور کے آخری سرے کے پہاڑوں

---

۹ مآثر الکرام ص ۲۱۴

سے لے کر کلکتے کے ساحل تک پورے معمورۂ ہند کے مدارسِ دینیہ میں تیزی کے ساتھ پھیل گیا۔ علما نے خندہ پیشانی سے اس کو قبولیت کا شرف بخشا اور طلبا نے اس کے تمام پہلوؤں کا کامل توجہ سے تتبع کیا۔ اس کی مقبولیت یہاں تک پہنچی کہ اب تک یہ حال ہے کہ کسی کو عالم نہیں تسلیم کیا جاتا جب تک ثابت نہ ہو جائے کہ اس نے اسی طریقۂ درس کے مطابق تعلیم حاصل کی ہے۔

لیکن سخت حیرت انگیز تعجب کی بات ہے کہ اکثر مدارسِ دینیہ کے اربابِ اہتمام اور مدرسین تک کو معلوم نہیں کہ درسِ نظامیہ کب بنا؟ اس کا بانی کون تھا اور وہ کس علاقے اور ملک کا رہنے والا تھا؟ بعض مدارس کے عہدے دار اور ناظم بھی اس سلسلے میں کوئی علم نہیں رکھتے۔ ان سے یہ کہتے ہوئے سُنا گیا ہے کہ اس کا بانی دولتِ سلجوقیہ کا وزیر نظام الملک تھا، جس نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا تھا۔ انھیں بالکل معلوم نہیں کہ اپنے مدارس میں جس درس نظامیہ کے مطابق وہ تین سو سال سے تعلیم دے رہے ہیں، وہ خود انھی کے ملک برصغیر کے ایک عالمِ دین شیخ نظام الدین انصاری سہالوی فرنگی محلی کے ذہن رسا کا کارنامۂ فخر ہے جو اپنے بانی کے نام کی مناسبت سے درسِ نظامیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

مدرسۂ نظامیہ اور درس نظامیہ

موقع کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ نظامیہ اور درسِ نظامیہ میں جو فرق ہے، یہاں اس کی وضاحت کر دی جائے۔

مدرسۂ نظامیہ خواجہ نظام الملک نے قائم کیا تھا جو دو سلجوقی حکمرانوں — الپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ کا — وزیر رہ چکا تھا۔ یہ ایک عظیم الشان درس گاہ تھی جو نظام الملک نے بغداد کے مشرقی حصے میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک وسیع و عریض قطعۂ زمین میں قائم کی تھی۔ اس کی تعمیر کا

آغاز سہ شنبہ کے روز یکم ذی قعدہ ۴۵۷ھ (۱۴ اکتوبر ۱۰۶۵ء) کو ہوا۔ تعمیر کے نگران شیخ الشیوخ ابو سعد صوفی نیشاپوری تھے۔ پورے دو سال تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا اور یکم ذی قعدہ ۴۵۹ھ (۱۳ ستمبر ۱۰۶۷ء) کو عمارت مکمل ہوئی۔ اس کے صدر دروازے پر نظام الملک کا نام کندہ کیا گیا اور چاروں طرف بازار اور حمام بنوائے گئے۔ عمارت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں کئی لاکھ آدمی سما سکتے تھے۔

منقول ہے کہ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر کے دوران میں ایک دفعہ خواجہ نظام الملک کو یہ اطلاع پہنچی کہ اس کے ایک کارندے نے بہت سی رقم خورد برد کر لی ہے۔ جب اس کارندے کو پتا چلا کہ خواجہ نظام الملک کو اس کی خیانت کا علم ہو گیا ہے تو وہ باز پرس سے بچنے کے لیے بصرے بھاگ گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ضمیر نے ملامت کی تو مجبور ہو کر نظام الملک کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان الفاظ کے ساتھ عفوِ تقصیر کی التجا کی۔

"اے خواجہ! آپ نے یہ مدرسہ اللہ کی رضا کے لیے تعمیر کرایا ہے۔ پس خیانت کرنے والے کا معاملہ بھی اللہ کے سپرد کر دیجیے۔ آپ کو ثواب ملے گا اور خائن اپنے کیے کی سزا پائے گا۔"

نظام الملک نے جواب میں کہا۔ مجھے اس مال کا غم نہیں جو تم نے یا کسی اور نے اس مدرسے کی تعمیر میں کھایا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس مدرسے کی عمارت اتنی مضبوط ہوتی جتنی مسجد منصوری اور شفاخانۂ عضدی کی ہے۔ مجھے تو یہ غم ہے کہ تم لوگوں نے مسالے میں خیانت کی ہے جس کی وجہ سے عمارت مستحکم نہیں ہوگی اور جلد خراب ہو جائے گی۔

اکثر مورخین کا بیان ہے کہ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر پر ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ یہ رقم آج کل کے کم و بیش چالیس لاکھ روپے کے لگ بھگ ہوگی۔ پھر جس زمانے میں یہ مدرسہ تیار ہوا، اس وقت تعمیر کے سامان کی قیمت اور مزدوروں

اور معماروں کی اُجرت موجودہ زمانے کی نسبت بہت ہی کم تھی۔ اس سے اس مدرسے کی عظمت اور شان و شکوہ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

شنبہ کے روز ۱۰ ذی قعدہ ۴۵۹ھ (۲۳ ستمبر ۱۰۶۷ء) کو مدرسہ نظامیہ کی رسمِ افتتاح ہوئی۔ اس موقع پر بغداد کی تقریباً تمام آبادی نئی عمارت میں امنڈ آئی تھی۔ یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ خواجہ نظام الملک نے علامہ شیخ ابو اسحاق شیرازی کو مدرسے کا مدرسِ اعلیٰ نامزد کیا تھا اور افتتاح بھی انہی کو کرنا تھا۔ لیکن جب وہ اس مقصد کے لیے مدرسے کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں ایک کم سن لڑکے نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

یا شیخ کیف تدرس فی مکان مغصوب۔

یعنی اے شیخ! آپ اس جگہ کیسے درس دیں گے جو زبردستی حاصل کی گئی ہے۔

شیخ ابو اسحاق لڑکے کی زبان سے یہ بات سنتے ہی شہر سے باہر نکل گئے اور ایک غار میں جا کر بیٹھ گئے۔ ادھر جب حاضرین انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئے تو بغداد کے ایک با اثر رئیس شیخ عبدالملک ابو المنصور کے ایما پر امام ابو نصر بن صباغ (مصنفِ "الشامل والکامل") سے درخواست کی گئی کہ وہ رسمِ افتتاح ادا فرمائیں۔ امام موصوف نے لوگوں کے اصرار پر مسندِ درس کو رونق بخشی اور اس طرح بغداد کے "مدرسہ نظامیہ" میں تدریس کا آغاز ہوا۔

امام ابو نصرؒ بیس دن تک مدرسہ نظامیہ میں درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں خواجہ نظام الملک کی خواہش کے مطابق شیخ ابو اسحاق شیرازی سے رابطہ قائم کر کے ان کا شک رفع کیا گیا اور شدید اصرار سے ان کو مدرسے میں درس دینے پر رضامند کیا گیا۔ چنانچہ مدرسے کے افتتاح کے بیس۲ دن بعد الخصوص نے امام ابو نصر کی جگہ شیخ الجامعہ کے فرائض سنبھالے۔

غرض مدرسہ نظامیہ کے بانی اور مؤسس نظام الملک مملکت سلجوقیہ کے وزیر اور دنیوی لحاظ سے اپنے وقت کی بہت بڑی شخصیت تھے علمی

اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بلند تھا۔

اس کے برعکس درسِ نظامیہ کے بانی شیخ نظام الدین انصاری سہالوی تھے، جن کو حکومت کے ایوانوں اور سرکاری درباروں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایک درویش منش اور فقیر طبع عالم تھے۔ مالی لحاظ سے غربت کا شکار تھے۔ ان کے آبا و اجداد کا سلسلۂ درس مدتِ مدید سے جاری تھا۔ انھوں نے کوئی نیا مدرسہ جاری نہیں کیا بلکہ نصابِ درس میں نئی اصلاحات نافذ فرمائیں اور ان کا مرتب کردہ نصاب ان کے نام کی مناسبت سے "درسِ نظامیہ" کہلایا۔ مدرسہ نظامیہ کے مؤسس اور درسِ نظامیہ کے بانی کے درمیان کم و بیش سات سو سال کا طویل عرصہ حائل ہے۔

شیخ نظام الدین کا نصابِ تعلیم اور اس کی خصوصیات

شیخ نظام الدین کا مرتب کردہ نصابِ تعلیم جو درسِ نظامیہ کہلاتا ہے مختلف گیارہ علوم و فنون پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تفسیر :۔ جلالین، بیضاوی

۲۔ حدیث :۔ مشکوٰۃ المصابیح

۳۔ فقہ :۔ شرح وقایہ، ہدایہ اوّلین، ہدایہ آخرین

۴۔ اصولِ فقہ :۔ نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت۔

۵۔ کلام : شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف۔

۶۔ بلاغت :۔ مختصر معانی، مطوّل تا بحث ما انا قلت

۷۔ فلسفہ :۔ میبذی، صدرا، شمس البازغہ۔

۸۔ منطق :۔ صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، مع میر قطبی، مسلم الثبوت۔

۹۔ صرف :۔ میزان الصرف، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ

۱۰۔ نحو: ۔ نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی۔
۱۱۔ ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالۂ اوّل تشریح الافلاک۔
رسالہ قوشجیہ، شرح چغمینی باب اوّل۔

شیخ نظام الدین کا مرتبہ نصابِ تعلیم (یعنی درسِ نظامیہ) بہت سی خصوصیات کا حامل ہے، جو مختصر طور پر درج ذیل ہیں:

۱۔ اس میں ارضِ ہند کے متعدد علما کی کتابیں شامل ہیں جن میں بعض وہ حضرات ہیں جو شیخ کے ہم عصر ہیں، مثلاً ملا جیون (متوفی ۹ ذی قعدہ ۱۱۳۰ھ) کی نور الانوار، شیخ محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ) کی مسلّم الثبوت اور سلم العلوم وغیرہ، ان کے زمانے سے قبل کے ہندی علما کی کتابیں بھی داخل نصاب ہیں۔ مثلاً سید علی اکبر الہ آبادی (متوفی ۱۰۹۰ھ) کی فصول اکبری، ملا محمود جون پوری (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ) کی شمس البازغہ وغیرہ۔

یہ وہ حضرات علما ہیں جن کی کتابوں نے درسِ نظامیہ کے بہت سے حصے پر تسلّط جما لیا ہے۔ شیخ نظام الدین نے اس نصاب کے ذریعے پوری علمی دنیا سے ان کو متعارف کرادیا ہے۔ یہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے ہندی فضلا کی تصنیفات کو یہ اعزاز بخشا اور یہ داخلِ نصاب کیا، ورنہ ان سے قبل کسی ہندی عالم کی کوئی کتاب مروجہ نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کی گئی تھی اس سے واضح ہوا کہ شیخ نظام الدین صحیح معنوں میں علما کے قدر دان تھے، وہ نہایت صاف دل عالم تھے اور ان کا ذہن معاصرانہ کشاکش سے پاک تھا۔

۲۔ انھوں نے ہر فن کی مشکل کتابیں نصاب میں داخل کیں تاکہ طلبا کی ذہنی اور فکری کاوشوں میں تیزی آئے اور ان کے غور و خوض کے پیمانوں میں وسعت پیدا ہو۔

۳۔ دیگر علوم کی نسبت منطق اور فلسفے کی کتابیں زیادہ رکھیں، کیوں کہ ان کے دور کی علمی فضا کا تقاضا یہی تھا۔ اس زمانے کا عام رجحان یہ تھا کہ

طلبا فنون میں خام نہ رہیں، ان کی فنی قوت میں اضافہ ہو۔

۴۔ علم حدیث کی صرف ایک کتاب رکھی، یعنی مشکوٰۃ، اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مشکوٰۃ کو اچھے طریقے سے پڑھ لیا جائے تو باقی کتب احادیث کو مطالعہ کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال قرینِ صحت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ احادیث کی امہات الکتب کو استاد سے باقاعدہ پڑھنے کے علاوہ سمجھنا ممکن نہیں۔ ہمارے خیال میں صرف مشکوٰۃ کو داخل نصاب کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے ہندوستان میں کتب احادیث کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ صرف وہی حضرات ان سے متعارف تھے جو حصولِ علم کے لیے حجاز کا سفر اختیار کرتے تھے۔

۵۔ اس نصاب میں ادب کا حصہ ناپید ہے، جو اس کا ایک کمزور پہلو ہے۔

۶۔ اس نصابِ تعلیم میں شیخ نظام الدین انصاری نے جس چیز کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھا وہ یہ تھی کہ طالب علم کی استعداد مطالعہ اس قدر مضبوط ہو جائے کہ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد وہ ہر مروّجہ فن کی کتابوں کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس نصاب کی تمام کتابوں کو پورے غور کے ساتھ پڑھ لیا جائے تو علومِ عربیہ کو فہم کی گرفت میں لانے میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی۔

۷۔ علاوہ ازیں یہ نصاب اس قدر مختصر ہے کہ طالب علم کو اس پر سالہا سال صرف کرنا نہیں پڑتے، بلکہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ درسی کتابوں سے فارغ ہو جاتا ہے، چنانچہ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ کتنے ہی طلبا کم سنی ہی میں فارغ التحصیل ہو کر تدریس کی مسندوں پر فائز ہو گئے۔

۸۔ اس نصاب کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہی تعصّب قطعاً نہیں ہے، اس لیے کہ تعصّب دراصل کتبِ فقہیہ کی بھرمار سے

پیدا ہوتا ہے، اور یہ نصاب اس سے مبرا ہے۔

۹۔ پھر اس کی ترتیب میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ معاصر علما کی تصنیفات کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے، تاکہ معاصرت کا مرض ختم ہونے میں مدد مل سکے

۱۰۔ اس ضمن میں شیخ نظام الدین کی کسر نفسی اور تواضع ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اس میں اپنی کوئی تصنیف نہیں رکھی، حالاں کہ وہ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فاضل تھے۔

شیخ کی وفات کے بعد حالات کے مطابق درسِ نظامیہ میں تبدیلی اور اضافے کا عمل جاری رہا لیکن بنیادی طور پر اس میں روح وہی کارفرما رہی اور وہ کتابیں بھی اس میں داخل رہیں جو شیخ نظام الدین نے تجویز کی تھیں۔

تلامذہ

شیخ نظام الدین سہالوی کا سلسلۂ درس نہایت وسیع تھا، ان سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا اور پھر آگے چل کر ان میں سے ہر شخص فضل و کمال میں ممتاز مرتبے پر فائز ہوا۔ ان کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں چند نامور اور فحول علما کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ سید کمال الدین حسینی عظیم آبادی: علوم حکمیہ میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ عرصے تک فتح پور کی مسندِ تدریس پر متمکن رہے۔ اس کے بعد نواب سیف خاں نے عظیم آباد (پٹنہ) میں ایک مدرسے کی تاسیس کی تو اس کی درخواست پر وہاں تشریف لے گئے۔ خلقِ کثیر نے ان سے اخذِ علم کیا۔ ان کی موت کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ اپنے استاذ شیخ نظام الدین سے ان کو انتہائی عقیدت اور محبت تھی، اطلاع پہنچی کہ شیخ وفات پا گئے ہیں، اسی صدمے

میں انتقال کر گئے، حالاں کہ شیخ زندہ تھے اور ان کی وفات کی خبر غلط تھی۔

۲۔ سید ظریف حسینی عظیم آبادی: فقہ و اصول اور علم کلام میں عبور رکھتے تھے۔ نواب سیف خان کے مدرسے میں جو عظیم آباد (پٹنہ) میں قائم کیا گیا تھا، خدمتِ درس انجام دیتے تھے۔ استاذ گرامی شیخ نظام الدین سے بدرجہ غایت مودت رکھتے تھے، ان کی وفات کی غلط خبر مشہور ہوئی تو فرطِ غم سے نڈھال ہو گئے اور اس قدر روئے کہ آنکھوں کی بصارت ضائع ہو گئی۔ کئی کتابوں کے مصنف اور بے شمار علما کے استاذ تھے۔

۳۔ شیخ کمال الدین انصاری سہالوی: اپنے وقت کے عالم کبیر اور علامۂ عصر تھے، علوم پر مجتہدانہ نظر رکھتے اور ہر فن میں امامت کے مرتبے پر فائز تھے۔ شیخ نظام الدین کے قریبی رشتے دار اور لائق شاگرد تھے۔ متعدد کتابوں کے محشی اور مصنف تھے۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ۴ المحرم ۱۱۷۵ھ کو فوت ہوئے۔

۴۔ شیخ غلام محمد گجراتی برہان پوری: عالم اجل اور نامور استاد تھے۔ عمر بھر علوم کی نشر و فروغ میں مصروف رہے۔ بوہرہ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۷۹ھ میں برہان پور میں انتقال کیا۔

۵۔ مولانا حقانی امیٹھوی ٹانڈوی: کبار علما میں سے تھے۔ علوم و فنون میں پوری دسترس رکھتے تھے۔ بہت سے علما نے ان سے کسب علم کیا۔ ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۹۰ھ کو ٹانڈہ شہر میں فوت ہوئے۔

۶۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی: فقہ، اصول اور علم کلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ درس و افادہ میں اپنی مثال آپ تھے۔

۷۔ شیخ احمد بن غلام نقشبند لکھنوی: شیخ و فاضل اور علوم عربیہ میں یگانہ تھے۔ فقہ، اصول اور دیگر فنون میں ممتاز تھے۔ تدریس کا فریضہ

انجام دیتے تھے۔ بے شمار حضرات نے ان سے اکتساب علم کیا۔

۸۔ شیخ حمد اللہ صدیقی سندیلوی: مذہبًا شیعہ تھے۔ علومِ حکمیہ میں مرتبۂ امامت پر فائز تھے۔ بہت بڑے مدرس اور مصنف تھے۔ ارضِ ہند کے مشاہیر اساتذۂ فن میں شمار کیے جاتے تھے۔ منطق و فلسفہ کی متعدد انتہائی کتابوں کے حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیے۔ حلقۂ علما میں ان کی کتابیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے استاذ شیخ نظام الدین کی وفات کے بعد ان میں سے بعض درسِ نظامیہ میں داخل کی گئیں۔ ۱۱۶۰ھ کو دہلی میں انتقال کیا۔

۹۔ مولانا عبدالرشید جون پوری: منطق و فلسفہ اور اصول کے جید عالم تھے۔ ذہانت و فطانت میں منفرد اور زہد و عبادت میں ممتاز تھے۔ متوکل علی اللہ، متورع اور کثیر الدرس و افادہ تھے۔ علما کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔

۱۰۔ سید غلام محمد عمر حسینی شمس آبادی: علم و معرفت میں یگانۂ روزگار تھے۔ بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔

۱۱۔ مولانا غلام فرید محمد آبادی: اپنے عہد اور علاقے کے فحول علما اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اعمالِ اعظم گڑھ کے ایک مقام "محمد آباد" میں پیدا ہوئے۔ قناعت اور توکل کی زندگی بسر کرتے تھے۔ صالح، متقی اور پرہیزگار عالمِ دین ہے۔

۱۲۔ مولانا محمد حسن لکھنوی: عالم اجل اور شیخ کامل تھے۔ ذکاوت و ذہانت میں ممتاز درجے کے مالک تھے۔ مختلف علوم و فنون کی اہم کتابوں کے شروح و حواشی سپردِ قلم کیے۔ ۲۰ صفر ۱۱ھ کو رحلت فرمائی۔

غرض شیخ نظام الدین سہالوی کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے اور آج برصغیر میں مدارسِ دینیہ کی جو رونق دکھائی دیتی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح انہی

کے پرتوِ فیض کا نتیجہ ہے۔ ان کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ برِ صغیر (جس میں موجودہ نقشے کے مطابق پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش تین ملک شامل ہیں) کا تمام تر سلسلۂ درس انہی کے نامِ نامی سے منسوب ہے۔ ان کے زمانے میں خطۂ ہند کے بیشتر علما کی نسبتِ تلمذ انہی کی طرف جاتی تھی۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

امروز علمائے اکثر قطرِ ہندوستان نسبتِ تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند و کسے کہ سلسلۂ تلمذ بہ او می رساند بین الفضلائے علم امتیاز می افرازد۔[۱]

یعنی اس دور کی سرزمین ہند کے زیادہ تر علما اپنی نسبتِ شاگردی مولانا نظام الدین سہالوی سے رکھتے ہیں اور انہی کے کلاہِ فخر سے وابستہ ہیں۔ حالت یہ ہے کہ جو شخص ان کے دامنِ شاگردی سے منسلک ہو جاتا ہے، وہ اہلِ علم اور اربابِ فضل میں ممتاز مقام حاصل کر لیتا ہے۔

آج مدارسِ دینیہ کے حلقوں میں جس طرح شیخ نظام الدین کا نام روشن ہے، اسی طرح ان کے تلامذہ کا ذکر بھی پوری آب و تاب کا حامل ہے اور اپنی تدریسی و تصنیفی خدمات کی بنا پر نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اولاد

شیخ نظام الدین کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، لوگ دوسری شادی پر مجبور کرتے تھے، لیکن وہ اس پر رضامند نہ تھے، جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو فرمایا: میں اس مخمصے میں پڑنا نہیں چاہتا۔

---

[۱] مآثر الکرام ص ۲۱۲

البتہ کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑے گا۔ آپ نے شیخ اسماعیل بلگرامی (متوفی ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ) سے فیضِ باطنی حاصل کیا تھا۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھے القا کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے آپ کی اولاد ہوگی۔ چنانچہ خاصی عمر ہو چکی تھی کہ قصبہ ستر کھ میں دوسری شادی کی، جس سے وہ گوہر شاہوار بیٹا ہوا، جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں، اور بے پناہ علمی فضیلت کی بنا پر اہلِ علم کے حلقوں میں "بحر العلوم" کے پرشکوہ لقب سے شہرت پائی۔

بحر العلوم کا اصل نام عبد العلی ہے، علم و فضل میں ان کو جو عظیم الشان مرتبہ حاصل تھا، وہ کسی اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ بحر العلوم اپنی رفعتِ علمی کی بنا پر انتہائی شہرت کے حامل ہیں۔ اس عدیم النظیر اور فقید المثال عالم نے ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ کو مدراس میں وفات پائی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی اور توفیق عطا فرمائی تو ان کا تذکرہ تیرھویں صدی ہجری کے فضلائے کرام کے ضمن میں "فقہائے ہند" کی چھٹی جلد میں کیا جائے گا، ان شاء اللہ العزیز۔

مرض اور وفات

شیخ نظام الدین کو کئی سال سے مثانے کی پتھری کا مرض لاحق تھا، لیکن ہمیشہ تدریس و تصنیف میں مصروف رہے، کبھی علاج کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جب عمر کا آخری دور آیا اور ستر برس سے آگے نکل گئے تو کمزوری اور ضعف نے ایسا گھیر ڈالا کہ چارپائی پر لیٹ گئے اور زنان خانے میں رہنے لگے۔ لیکن بیمار پرسی کو لوگ کثرت سے آتے تھے اور بار بار پردہ کرانے میں اہلِ خانہ کو تکلیف ہوتی تھی، لہٰذا شیخ عبد الحق نے عرض کیا کہ اگر آپ دیوان خانے میں تشریف فرما رہیں تو زیادہ اچھا ہے۔ شیخ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن ایک بزرگ شاہ عبد الغنی عیادت کو آئے تو شیخ نے یہ مصرعہ پڑھا:

ہر روز بینم تنگ تر سوراخ ایں غربال ہا

اور پھر فرمایا کہ میاں عبدالحق ہی کی مرضی پر عمل کرد، چنانچہ زنان خانے سے اُٹھے اور دیوان خانے میں تشریف لے آئے اور وہیں وفات پائی۔

شیخ نظام الدین کی دو بیویاں تھیں۔ منقول ہے کہ دوسری شادی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ مرض میں جب شدت آئی تو پہلی بیوی حاضر خدمت ہوئیں اور کہا کہ مجھ سے جو قصور ہوا معاف فرما دیجیے۔ فرمایا تم نے کوئی قصور نہیں کیا۔ البتہ مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ تمھاری موجودگی میں دوسری شادی کی۔ میری خطا معاف کردو۔ تھوڑی دیر بعد دوسری بیوی آئیں اور کہا، آپ تو تشریف لے جارہے ہیں، اولاد کو کس کے سپرد کیا ہے۔ شیخ کو اس سے سخت ذہنی کوفت ہوئی۔ حاضرین سے کہا کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ پھر فرمایا "نظام الدین تو جارہا ہے لیکن خدا ہمیشہ رہے گا"۔ آپ نے پچھتر سال عمر پا کر، چہار شنبہ کے روز ۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ کو دوپہر کے وقت داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[111]

۸۵۔ قاضی نظام الدین احمد آبادی

قاضی نظام الدین بن شیخ نور الدین بن محمد صالح احمد آبادی گجراتی بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر شیخ، عالم و فقیہ، متقی اور عبادت گزار بزرگ تھے۔

---

[111] شیخ نظام الدین کے حالات کے لیے یہ کتابیں دیکھیے: سبحۃ المرجان ص ۹۴، ۹۹ ابجد العلوم ص ۹۱۱ — مآثر الکرام ص ۲۱۲ تا ۲۱۶ — تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۸۱ — احوال علمائے فرنگی محلی ص ۹، ۱۰، ۷۷ — تراجم الفضلا — مقالات شبلی ج ۳ ص ۹۱ تا ۱۰۱ — حدائق الحنفیہ ص ۴۴۵ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۱ — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۱، ۳۸۲ — قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۱۰ — الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۶، ۱۷۔

علم وفضل کی فضا میں پیدا ہوئے اور تقویٰ وصالحیت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اس درجے مرتبۂ کمال کو پہنچے کہ عمقِ نظر اور فنون گوناگون میں وسعتِ فکر میں اپنے تمام اقران ومعاصرین سے بازی لے گئے۔ فقہ، ریاضی اور شعروانشا میں ماہر کامل تھے۔ سلاطین وامرائے مملکت سے گہرا ربط وتعلق رکھتے تھے اور وہ انھیں انعام واکرام اور خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کرتے تھے، یہاں تک کہ احمد شاہ نے ہاتھی بھی عطا کیا۔ مغل حکمران احمد شاہ نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہو کر انھیں احمد آباد کے منصبِ قضا پر مامور کیا اور عمر بھر اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ بے حد عزیمت واستقامت کے مالک تھے۔ اسلام کے بارے ان کے جذبات نہایت نازک تھے اور اس ضمن میں بدرجۂ غایت سخت اور متصلب تھے۔ اعلائے کلمۃ اللہ میں انتہائی جد وجہد سے کام لیتے۔ دینی معاملات میں کسی قسم کی مداہنت اور نرمی کے قائل نہ تھے۔ اگر کوئی دین سے متعلق معاملہ پیش آجاتا تو کسی کی پروا نہ کرتے اور مصلحتِ دنیوی سے بالا ہو کر وہی قدم اٹھاتے جو ان کے نزدیک موافقِ شریعت ہوتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۶۳ھ کو شاہ پور میں ہندوؤں نے مسجد کے قریب مندر تعمیر کیا اور نماز کے اوقات میں سنکھ بجانے لگے۔ ظاہر ہے اس سے نماز میں خلل پیدا ہوتا تھا اور مسلمان اس صورتِ حال سے بڑے پریشان تھے۔ قاضی نظام الدین کو اطلاع پہنچی تو انھوں نے بادشاہ کو بتلائے بغیر ہی مندر منہدم کرا دیا۔ بادشاہِ دہلی احمد شاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے قاضی موصوف کی غیرتِ دینی اور پُرجوش جذبۂ اسلامی پر مسرّت کا اظہار کیا اور انھیں خلعتِ فاخرہ اور ہاتھی عطا فرمایا۔

قاضی نظام الدین احمد آبادی گجراتی، کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں میزان الساعۃ، تفصیل الفصول، قہوہ کے متعلق ایک رسالہ، فضائلِ علما کے بارے میں ایک رسالہ اور دیگر رسائل شامل ہیں۔ اس عالم وفقیہ

نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ کو احمد آباد میں وفات پائی اور اپنے والدِ گرامی شیخ
نور الدین کی قبر کے قریب مدفون ہوئے [۱۲]

۸۶۔ شیخ نعمت اللہ سندھی

شیخ نعمت اللہ بن عبد الجمیل بن رحمت اللہ ٹھٹھوی سندھی کا شمار
علاقہ سندھ کے معروف اربابِ فضل و صلاح میں ہوتا تھا۔ علوم عربیہ، نحو و فقہ
اور اصول وغیرہ کی تعلیم اپنے نانا شیخ ضیاء الدین ٹھٹھوی سے حاصل کی
اور علومِ حکمیہ شیخ محمد صادق ٹھٹھوی سے پڑھے۔ عالمِ شباب ہی میں یعنی
بیس سال کی عمر میں بہت سے فضائل علمی سے متصف ہو گئے تھے اور درس
و افادہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ تقویٰ، صلاحیتِ حکمی اور جامعیت
علمی میں بہت سے معاصرین سے فوقیت لے گئے تھے۔ حج و زیارت کے
حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوئے اور بندر "کلفہ" میں وفات پائی۔
واقعہ ۸ ذی قعدہ ۱۱۷۹ھ کو پیش آیا۔ تحفۃ الکرام کے مصنفِ شہیر شیر
قانع کے استاد تھے [۱۳]

۸۷۔ حاجی نعمت اللہ نوشہروی

حاجی نعمت اللہ نوشہروی، پنجاب کے موضع نوشہرہ کے رہنے والے
مسلکاً حنفی تھے۔ اپنے علاقے اور عصر کے فاضل آدمی تھے۔ مولد و منشا
ہے۔ شیخ امان اللہ شہید کشمیری (شہادت ۱۱۵۱ھ) کے شاگرد تھے۔
فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ حدیث و قرآت وغیرہ کی سند بھی

---

[۱۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۵، ۳۸۶
[۱۳] تحفۃ الکرام ص ۶۸۳، ۶۸۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۷

سے حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد نہایت توکل و عفت اور قناعت کے ساتھ درس و افادہ میں مصروف رہے۔ زہد و عبادت میں یگانہ تھے۔ ۱۱۸۴ھ میں رحلت فرمائی۔[۱۴]

۸۸- قاضی نورالحق گجراتی

قاضی نورالحق بن قاضی عبدالوہاب حنفی گجراتی اپنے دور کے مشاہیر فقہائے حنفیہ اور نامور علما میں سے تھے۔ بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۰۹۰ھ میں ان کو منصبِ قضا پر مامور کیا تھا۔ ۱۱۰۸ھ میں ان کو اعمالِ گجرات کے شہر مانڈو کے عہدۂ احتساب پر متعین کیا گیا تھا۔[۱۵]

۸۹- مفتی نورالحق دہلوی

مفتی نورالحق بن محب اللہ بن مفتی نوراللہ بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، دیارِ ہند کے مشہور فقیہ اور ممتاز عالم تھے۔ خاندانی اعتبار سے اونچے مرتبے کے حامل تھے، ذاتی طور پر بھی اپنے وقت کی اہم شخصیت تھے۔ ان کے والد گرامی شیخ محب اللہ دہلوی اپنے آبا و اجداد کی طرح نامور عالم تھے، لائق بیٹے نے انہی سے حصولِ علم کیا۔ اپنے جدِ امجد شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی تصنیف "ما ثبت بالسنۃ" کی شرح لکھی۔[۱۶]

---

[۱۴] حدائق الحنفیہ ص ۴۴۹، ۵۰ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۸

[۱۵] مآثر عالم گیری ص

[۱۶] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۹

۹۰- قاضی نور الحق انصاری کرانوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ایک جگہ "کرانہ" ہے، جس میں مختلف اوقات میں متعدد علمائے کرام پیدا ہوئے۔ قاضی نور الحق انصاری بھی اسی کرانہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام قاضی محمد عاشق انصاری تھا۔ قاضی نور الحق انصاری جلیل القدر شیخ اور عالم تھے۔ فقہائے حنفیہ میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی۔ شیخ کمال الدین فتح پوری جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، کے والد قاضی محمد عاشق انصاری کے چچازاد بھائی تھے۔ قاضی نور الحق نے انھی سے علم حاصل کیا اور نامور علما میں گردانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بریلی میں نواب سعد اللہ خاں کے مدرسے میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس زمانے میں نواب سعد اللہ خاں انھیں دو سو روپے ماہانہ دیتا تھا۔ پھر جب ان کے والد قاضی محمد عاشق وفات پا گئے تو واپس "کرانہ" تشریف لے گئے اور وہاں کے عہدۂ قضا پر مامور کیے گئے۔ طویل عرصے تک اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں انھیں موضع دیوبند کا قاضی مقرر کیا گیا، دیوبند میں انھوں نے اپنا مکان تعمیر کیا۔ اس کے بعد اپنے آبائی قصبے کرانہ میں بھی مکان بنایا اور لوگوں سے منقطع ہو کر گوشہ گیری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ نہایت پابندِ شرع اور عبادت گزار تھے۔ کئی درسی کتابوں پر تعلیقات لکھیں اور وراثت کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا۔ ستر سال سے زائد عمر پا کر ۱۱۸۰ھ میں فوت ہوئے[۱]۔

۹۱- شیخ نور الدین گجراتی

ارضِ ہند کے مشاہیر اساتذہ اور فحول علما میں شیخ نور الدین بن شیخ

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۹، ۳۹۰ بحوالہ اغصان الانساب

محمد صالح احمد آبادی گجراتی کا اسم گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہے، وہ علم و فضل میں امامت کے درجے پر فائز تھے اور تمام فنونِ متداولہ میں عمیق نظر رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ کے زبردست عالم تھے۔ جامع معقول و منقول اور حاوی فروع و اصول تھے۔ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۳ھ کو احمد آباد میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ ان کی والدہ ماجدہ بھی عالمہ و فاضلہ تھیں، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ لائق بیٹے نے شیخ سعدی کی مشہور فارسی کتاب "گلستان" انہی سے پڑھی اور ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ سات دن میں پوری کتاب مکمل کر لی۔ اس کے بعد کتب درسیہ کی تحصیل کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کتابیں مولانا احمد بن سلیمان گجراتی اور مولانا فریدالدین احمد آبادی کے حلقۂ درس میں پڑھیں۔ حدیث کی تکمیل شیخ محمد بن جعفر حسینی بخاری سے کی، اخذِ طریقت بھی انہی سے کیا، فضائلِ علمیہ میں اس مرتبۂ کمال کو پہنچے کہ کثرتِ درس و افادہ میں ان کے عہد اور شہر میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ ان کی بے پناہ قابلیت سے متاثر ہو کر گجرات کے صدر محمد اکرم الدین نے جنھیں شیخ الاسلام خاں کا خطاب ملا تھا، اور جو شیخ ممدوح کے شاگرد اور مرید تھے، احمد آباد میں مدرسہ ہدایت بخش کے نام سے ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا۔ اس مدرسے پر ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر ۱۱۰۹ھ میں شروع ہوئی اور ۱۱۱۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ طلبا کے مصارف کے لیے خراجی زمین کے کئی دیہات وقف تھے۔

شیخ نورالدین احمد آبادی نہایت نیک اور عبادت گزار تھے۔ تہجد کے سخت پابند تھے۔ ملوک و سلاطین کی مجلسوں میں بالکل نہیں جاتے تھے اور نہ ان کے تحفے اور ہدیے قبول کرتے تھے۔ ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کا قصد فرمایا اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ مراجعتِ ہند کے بعد پھر خدمتِ علم میں مصروف ہو گئے۔ باوجودیکہ بڑھاپا چھا گیا تھا اور ضعف و

کمزوری نے قبضہ جما لیا تھا، بہ دستور درس و افادہ اور تصنیف و تالیف کا عظیم کام کرتے رہے۔ بہت سی رفیع المرتبت علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف اور شارح تھے، جو ان کی غزارتِ علم اور وسعتِ نظر پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

تفسیر مختصر علی القرآن المجید۔ التفسیر النورانی للسبع المثانی، التفسیر الربانی: یہ سورۂ بقرہ کی تفسیر ہے۔ حاشیہ علی اوائل تفسیر بیضاوی، نور القاری شرح صحیح البخاری، الحاشیۃ القویمہ علی الحاشیۃ القدیمہ، حاشیۃ علی شرح المواقف، حل المعاقد لحاشیۃ شرح المقاصد، حاشیۃ علی شرح المطالع حاشیۃ تلویح، حاشیہ عضدی، المعول حاشیہ علی المطول حاشیہ شرح وقایہ، حاشیہ شرح جامی، حاشیہ المنہل حاشیہ شمسیہ، حاشیہ تہذیب المنطق۔

اس کے علاوہ الطریق الامم کے نام سے ابن عربی کی فصوص الحکم کی شرح لکھی۔ انھوں نے چھوٹی بڑی ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں ان کی یہ تصانیف بڑے دقیق اور اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔

شیخ نور الدین احمد آبادی نے منگل کے روز ۹ شعبان ۱۱۵۵ھ کو احمد آباد میں وفات پائی۔[۱۸]

---

[۱۸] سبحۃ المرجان ص ۹۴ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۷، ۲۴۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۰، ۳۹۱ — قفناء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۰۹، ۲۱۰ — حدائق الحنفیہ ص ۴۴۴ — اتحاف النبلاء، ص ۲۲۷، ۲۲۸ — مآثر الکرام ص ۲۱۰ تا ۲۱۲ — ابجد العلوم ص ۹۱۱۔

۹۲- مولانا نور الدین گنت پوری

مولانا نور الدین جعفر گنت پوری ضلع غازی پور کے ایک مقام گنت پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی، لہٰذا گنت پوری کہلائے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو جون پور چلے گئے، جس کو اس زمانے میں علما و فضلا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اس لیے ان کے نام کے ساتھ جون پوری کی نسبت وابستہ ہو گئی۔

وہاں شیخ محمد جمیل جون پوری (متوفی ۶ رجب ۱۱۲۳ھ) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اکثر کتب درسیہ انھی سے پڑھیں، بعض کتابوں کی تکمیل شیخ محمد افضل عباسی الٰہ آبادی (متوفی ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ) سے کی، یہاں تک کہ بحث و اشتغال میں درجۂ کمال کو پہنچے اور علم و فضل میں خوب ناموری حاصل کی، افتا و تدریس میں ماہر ہوئے اور فروع و اصول میں ممتاز علما میں شمار کیے گئے۔

مولانا نور الدین گنت پوری جون پوری ایک صالح عالم دین، عابد و زاہد اور کثرت سے تلاوتِ قرآن کرنے والے اور نوافل کا اہتمام کرنے والے تھے۔ ۱۱۲۰ھ کو جون پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔[۱۹]

۹۳- شیخ نور اللہ بنارسی

شیخ نور اللہ بن حسین مفتی محمد آبادی بنارسی کا شمار نامور فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ وہ بہترین عالم، صوفی مزاج فقیہ اور عمدہ اوصاف کے حامل تھے۔ ان کے فرزند شیخ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ) بہت بڑے عالم، جلیل القدر فقیہ اور ممتاز فاضل تھے۔

---

[۱۹] تجلی نور ج ۲ ص ۸۹، ۹۰ — تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۴۴۷ — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹۳ بحوالہ گنج ارشدی

شیخ نور اللہ نے بنارس میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۲۰]

۹۴ - سیّد نور اللہ بلگرامی

سیّد نور اللہ بن کرم اللہ حسینی واسطی بلگرامی کا مولد و منشا بلگرام ہے، ہوش سنبھالا تو حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ بعض درسی کتابیں اپنے شہر (جون پور) کے اساتذہ سے پڑھیں، بعد میں دیگر شہروں کا عزم فرمایا، حتیٰ کہ اپنے دور کے شیخ، فقیہ اور عالم گردانے گئے۔ بہت نیک، اور پرہیزگار عالم دین تھے۔ بڑی عمر کو پہنچ کر قرآن مجید حفظ کیا ہمیشہ درس و افادہ میں مصروف رہے۔ ۲۳ شعبان ۱۱۱۳ھ کو انتقال کیا۔[۲۱]

۹۵ - مولانا نور اللہ کشمیری

مولانا نور اللہ کشمیری، نور بابا پتلو کے عُرف سے معروف تھے۔ وادیِ کشمیر کے ممتاز فاضل اور شیخ تھے۔ فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے۔ بعض درسی کتابیں مشہور کشمیری عالم شیخ عبدالستار سے پڑھیں۔ پھر عازمِ دہلی ہوئے وہاں شیخ حسام الدین محمد، قاضی مستعد خاں اور قاضی مبارک کے حلقہ ہائے درس جاری تھے، ان میں داخل ہوئے اور مدت تک ان سے کسبِ علم میں مشغول رہے، یہاں تک علوم میں خوب بہرہ مند ہوئے اور فتویٰ و تدریس کی کامل صلاحیت پیدا ہو گئی۔ مرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ ان سے طریقہ نقشبندیہ کے مطابق اخذِ طریقت کیا بعد ازاں

---

[۲۰] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹۳ بحوالہ گنج ارشدی

[۲۱] ماثر الکرام ص ۱۰۸ تا ۱۱۰ — تقصار جیود الاحرار ص ۲۱۵، ۲۱۶ — نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹۳

کشمیر کو مراجعت فرمائی اور درس و تدریس کی مسند آراستہ کی۔ فنونِ متداولہ پر اس قدر عمیق نظر رکھتے تھے کہ خیالی اور مطوّل پر حواشی تحریر کیے۔ یہ دونوں کتابیں درس میں شامل ہیں اور دقیق مسائل کو محیط ہیں۔ مولانا نور اللہ کشمیری نے ۴ ربیع الاول ۱۱۹۵ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا اور کشمیر میں دفن کیے گئے[۲۲]۔

مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں ان کا نام "نور محمد" لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ صحیح نام "نور اللہ" ہے۔

۹۶۔ شیخ نور اللہ بڑھانوی

شیخ نور اللہ صدیقی بڑھانوی کا مولد و منشا بڑھانہ ہے جو اس زمانے میں ایک قریہ تھا۔ چھوٹی عمر ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ پھر دہلی کا رخ کیا، وہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور عرصۂ دراز تک ان سے منسلک و ملازم رہے، یہاں تک کہ اپنے استاذ گرامی کی زندگی ہی میں کبارِ علمائے ہند میں شمار ہونے لگے اور حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں ماہر تسلیم کیے گئے۔ سلسلۂ درس بھی جاری فرمایا جس سے متعدد نامور ہندی علما نے استفادہ کیا، ان علما میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزندِ گرامی قدر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے ان سے کتبِ فقہ کی تکمیل کی۔ شیخ نور اللہ بڑھانوی نے اپنی ایک بیٹی بھی شاہ عبدالعزیز کے عقد میں دے دی،

---

[۲۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۸ — حدائق الحنفیہ ص ۴۵۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹۳، ۳۹۴

تھی۔ شیخ نور اللہ نے ۱۱۴۷ھ کے لگ بھگ رحلت فرمائی[۲۳]۔

۹۷۔ شیخ نور محمد بدایونی

شیخ نور محمد حسینی بدایونی دیارِ ہند کے علمائے ربانی میں سے تھے۔ جلیل القدر فقیہ اور رفیع المرتبت عالم تھے۔ طریقۃً نقشبندی تھے۔ شیخ محمد محسن دہلوی (متوفی ۱۱۴۷ھ) اور شیخ سیف الدین سرہندی (متوفی ۱۰۹۸ھ) کی خدمت میں گئے اور ان سے حصول علم کیا۔ طویل عرصے تک ان دونوں علما سے انسلاک اختیار کیے رکھا، اس کے بعد ان پر جذب و استغراق کا غلبہ ہو گیا۔ یہ صورت حال پندرہ سال رہی۔ زہد و ورع میں سب سے آگے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے کسی کے محتاج نہ تھے۔ ان کی عادت تھی کہ کئی دنوں کا کھانا اکٹھا پکا لیتے، پھر جب بھوک بہت غالب آتی تو اس میں سے کھا لیتے۔ اغنیا اور امرا کی دعوت قبول نہ کرتے، نہ ان کے ہاں جاتے۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ دستر خوان پر کبھی دو کھانے جمع نہ کرتے۔ ایک پر اکتفا کرتے، بہت کم اور سادہ کھاتے۔

شیخ نور محمد بدایونی سے مرزا مظہر جان جاناں نے کسب فیض کیا تھا۔ مرزا موصوف فرماتے ہیں کہ ان کے کشوف بالکل صحیح اور مطابق واقعہ ہوتے تھے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ شیخ نور محمد قدسی صفات عالم تھے، لوگوں کی مدح اور ذم سے ان کا دل بالکل خالی تھا، وہ اللہ کی رضا پر راضی رہتے اور اسی کے فیصلے کو آخری اور صحیح فیصلہ قرار دیتے۔

شیخ نور محمد حسینی بدایونی نے ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ کو دہلی میں وفات پائی[۲۴]۔

---

[۲۳] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۴

[۲۴] معمولات مظہریہ ص ۱۸ و ۱۴۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۵۔

۹

۹۸۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

برِصغیر کی سرزمین فضل و کمال کے لحاظ سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے۔ اس کی خاک سے بے شمار علماء و فضلا پیدا ہوئے، جنھوں نے ہر حال اور ہر دور میں علم کی شمع روشن رکھی اور درس و تدریس میں زندگی بسر کی۔ ان میں متعدد حضرات وہ ہیں جو انفرادی حیثیت سے میدانِ عمل میں اترے اور لاتعداد لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ان کی علمی سرگرمیوں اور روحانی فیض رسانیوں کی تفصیلات تذکرہ و رجال کی کتابوں اور بزرگانِ دین کے ملفوظات میں موجود ہیں۔

برِصغیر کے چند مشہور علمی خاندان

پھر ایسے کئی خاندان ارضِ ہند میں نمودار ہوئے جن کے اسلاف و اخلاف کی بھرپور کوششوں سے نہ صرف باشندگانِ برِصغیر نے استفادہ کیا بلکہ پوری علمی دنیا میں ان کی شہرت پھیلی اور تمام عالمِ اسلام ان سے فیض یاب ہوا۔ ان خاندانوں میں صدیوں تک علم کے چشمے اُبلتے رہے اور ہر دور میں وسیع پیمانے پر تشنگانِ علوم ان کے دروازوں پر حاضری دیتے اور اپنی صلاحیتوں اور فکری استعداد کے مطابق ان سے استفادہ کرتے رہے۔ ان خاندانوں میں برِصغیر کے جو خاندان اپنے اوصافِ بوقلموں کی بنا پر سب سے نمایاں ہو کر اُبھرے، ان میں مندرجہ ذیل چند خاندان بالخصوص قابلِ ذکر ہیں اور بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر تمام برِصغیر کے اہلِ علم انہی کے حلقۂ تلمذ اور دائرۂ فیض میں شامل ہیں۔

۱۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۴ شوال ۹۷۱ھ — وفات ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ) کا خاندان، جن کا سلسلۂ فیض صدیوں تک جاری رہا اور اس دودمانِ عالی مقام کے ہر فرد نے خدمتِ دین میں پشت ہا پشت تک ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس خاندان نے مشرقی پنجاب

کے ایک قصبے سرہند میں جنم لیا اور پھر بہت جلد پورے ہندوستان کے فیض یافتگان کے قبلہ گاہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ چار سو سال سے مختلف صورتوں میں ان کا سلسلۂ رشد وہدایت جاری ہے[1]

۲۔ رائے بریلی کے حضرت سید علم اللہ کا خاندان، جس کے ہر فرد نے فضل وکمال کے تمام گوشوں میں ناموری حاصل کی۔ اس کے فیض کی وسعتوں نے پورے برصغیر کو گھیر لیا ہے ۔۔۔ تین سو سال سے زائد مدت گزری کہ اس خاندان کے مردِ جلیل سید علم اللہ شاہ[2] (ولادت ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ — وفات ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ) نے تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کا علم ایسی ساعتِ سعید میں اٹھایا اور رائے بریلی سے اپنی پاکیزہ مساعی کا آغاز کیا کہ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے اور حضرت سید ممدوح کے اخلاف نے پوری آب وتاب کے ساتھ اس بنیادی اور اہم کام کو جاری رکھا ہے ان سے برصغیر سے باہر کے اہلِ علم بھی برابر مستفیض ہو رہے ہیں۔

۳۔ سہالی کے مولانا قطب الدین انصاری سہالوی شہید (ولادت تخمیناً ۱۰۴۰ھ — شہادت ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ)[3] کا خاندان، جس نے بعد میں فرنگی محل کا قالب اختیار کیا اور پورے برصغیر کو فیض یاب فرمایا۔ اس خاندان کے علمائے مشاہیر اور فقہائے نامدار نے علم وعمل کے میدان میں جو شاندار خدمات انجام دیں، خطۂ ہند کے اصحابِ علم اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اسی

---

[1] مجدد الف ثانی کے حالات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد چہارم حصہ اول ص ۴۲ تا

[2] سید علم اللہ شاہ بریلوی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد چہارم حصہ دوم صفحہ ۲۵۵ تا ۲۷۶

[3] مولانا قطب الدین انصاری سہالوی کے حالات وسوانح کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم حصہ اوّل صفحہ ۳۲۳ تا ۳۳۵

خاندان کے بلند مرتبت عالم مولانا نظام الدین انصاری سہالوی (فرنگی محلی) نے درسِ نظامیہ کے نام سے ایک نصابِ تعلیم مرتب کیا، جو تین سو سال سے پشاور سے لے کر کلکتے تک تمام مدارسِ عربیہ میں مروج ہے۔ اس خاندان کے علمائے کرام نے خطۂ ہند کے اہلِ علم پر جو احسانِ عظیم کیا ہے، اسے علمی تاریخ کے زریں باب کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا نظام الدین انصاری سہالوی کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔

۴۔ مولانا محمد یحییٰ عباسی الٰہ آبادی کا خاندان بھی خدمتِ علم میں بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس خاندان کے بلند پایہ علما میں سے مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی اور ان کے لائقِ احترام بھائیوں کے اسمائے گرامی بالخصوص لائقِ تذکرہ ہیں۔ ان کے حالات و سوانح صفحاتِ سابقہ میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

۵۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا خاندان۔ شیخ ممدوح محرم ۹۵۸ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور چورانوے سال عمر پا کر ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو دہلی ہی میں وفات پائی۔

انھوں نے اور ان کے اخلاف نے علمِ حدیث اور دیگر علوم کی انتہائی خدمت کی اور بے شمار لوگوں کو مستفیض فرمایا۔[۲۵]

۶۔ چھٹا خاندان حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اس خاندان کے معزز ارکان نے بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں جو علمی اور عملی کارنامے انجام دیے، اس میں کوئی ان سے ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے والدِ گرامی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے حالات کے ضمن

---

[۲۵] شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے اسلاف کے حالات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد چہارم حصہ اول صفحہ ۲۰۶ تا ۲۷۶۔

فقہائے ہند کی جلد پنجم کے حصۂ اوّل میں ان کے خاندان کے اسلاف کے کوائف ضروری تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں[۵]۔ لیکن آیندہ سطور میں چوں کہ اس خاندان ذی مرتبت کے رکنِ اعظم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ مقصود ہے اس لیے موضوع میں ربط قائم رکھنے کے لیے یہاں بھی اختصار کے ساتھ ان کے اسلاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے اسلاف

اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو وارد ہند ہوئے، شیخ شمس الدین مفتی تھے۔ اغلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے دورِ آغاز ہی میں وہ یہاں آ گئے تھے۔ انھوں نے رہتک کو اپنا مسکن ٹھہرایا جو آزادی سے قبل پنجاب میں واقع تھا اور اب ہریانہ میں ہے۔ اس زمانے میں بھی یہ ایک بارونق شہر تھا۔ شیخ ممدوح علوم ظاہری و باطنی کے حامل اور صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ شاہ ولی اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

وایں بزرگ مردے عالم وعابد بودہ است، واوّل کسے کہ از نژادِ قریش دراں بلدہ درآمد وبسبب وے شعائرِ اسلام ظہور نمود وطغیانِ کفر منطفی شد[۶]۔

یعنی شیخ شمس الدین ایک عالم وعابد بزرگ تھے، اور یہ خاندانِ قریش کے پہلے شخص ہیں جو اس شہر میں آئے اور جن کی وجہ سے اس نواح میں شعائرِ اسلام کی ترویج ہوئی اور کفر کی طغیانیوں کا سلسلہ بند ہوا۔

شیخ شمس الدین نے رہتک میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنے علم وفضل اور علوِ مرتبت کی بنا پر اس شہر کے دستور کے مطابق شہر کے مفتی مقرر ہوئے۔ پھر افتا کا یہ سلسلہ ان کے خاندان میں باقاعدہ جاری ہو گیا۔

---

[۵] ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد پنجم حصہ اوّل صفحہ ۲۰۸ تا ۲۳۰

[۶] امداد فی مآثر الاجداد، ص ۲

چنانچہ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے شیخ کمال الدین کو مفتی مقرر کیا گیا، ان کے بعد شیخ عبدالملک، پھر قاضی کبیرالدین، پھر قاضی قاسم اور سب سے آخر میں قاضی قوام الدین عرف قاضی قادن اس عہدۂ بلند پہ فائز ہوتے۔ لیکن جب قاضی قادن کے بیٹے محمود کی باری آئی تو انھوں نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے کہ انھوں نے سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی تھی، مگر اس کے باوجود اس خاندان کے شرف و مجد میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

شیخ محمود کی شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی تھی جس سے ان کے بیٹے احمد پیدا ہوتے۔ احمد کو شیخ عبدالغنی بن عبدالحکیم سونی پتی نے اپنی تربیت میں لے لیا تھا، انھوں نے بہترین طریقے سے ان کی تربیت کی۔ بڑے ہو کر شیخ احمد نے رہتک میں قلعے کے باہر ایک وسیع اور شاندار عمارت تعمیر کرائی جس میں اپنے خاندان کے تمام لوگوں کو سکونت کے لیے الگ الگ مکان عطا کیے۔

شیخ احمد کے بیٹے منصور اور پوتے محمد معظم تھے، یہ بھی علم و فضل میں عالی مرتبہ رکھتے تھے، لیکن طرزِ حیات سپاہیانہ تھا، اس لیے عمر بھر جنگ و جدل میں مصروف رہے۔ ان دونوں کی شجاعت و مردانگی کے واقعات شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب "امداد فی مآثر الاجداد" میں بیان کیے ہیں۔

شیخ محمد معظم کے فرزندِ رشید شیخ وجیہ الدین تھے، جو شاہ ولی اللہ کے جدِ امجد تھے۔ یہ عالم دین اور صاحب حال بزرگ تھے، اس کے ساتھ ہی ایک بہادر سپاہی بھی تھے۔ ان کی بہادری کے متعدد اہم واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جب کھجوہ کے مقام پہ اورنگ زیب عالم گیر اور شجاع کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہوا تو شیخ وجیہ الدین اس زمانے میں اورنگ زیب عالم گیر کی کمان میں شجاع کی فوجوں سے برسرِ پیکار تھے۔ شجاع کی فوج میں کئی مست ہاتھی تھے، جن کے مسلسل اور تیز حملوں سے عالم گیری فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور نہایت پریشانی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس وقت شیخ وجیہ الدین نے بے حد جرأت کا ثبوت دیا۔ وہ بے دھڑک ہو کر سب سے زیادہ شریر اور مست

ہاتھی پر ٹوٹ پڑے، ہاتھی ان کی طرف تیزی سے لپکا اور ان کو گھوڑے سمیت سونڈ میں لپیٹنا چاہا، لیکن شیخ نے آگے بڑھ کر اتنا زوردار حملہ کیا کہ تلوار سے ہاتھی کی سونڈ کے دو ٹکڑے کر دیے۔ زخمی ہاتھی شدتِ کرب سے اس قدر بدحواس ہوا کہ بلبلاتا ہوا اپنی ہی فوج پر پلٹ پڑا اور شجاع کی فوج میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ابتری پھیل گئی۔ عالمگیر یہ تماشا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ شیخ کی اس بے انتہا بہادری پر نہایت خوش ہوا۔ ان کی کمر میں اپنے ہاتھ سے تلوار باندھی جو ان کی شجاعت کا بہت بڑا اعتراف تھا۔ اس کے ساتھ ہی منصب میں اضافہ کرنا چاہا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور اپنے اسی اعزاز و منصب کو کافی سمجھا جو پہلے سے حاصل تھا۔

پھر جب دکن میں سیوا جی مرہٹے کی چیرہ دستیاں حد سے متجاوز ہونے لگیں تو شہنشاہ اورنگ زیب نے شیخ وجیہ الدین ہی کو ایک فوج دے کر اس مہم پر روانہ کیا۔ لیکن برہان پور کے قریب پہنچے تو انھیں بہت سے ڈاکوؤں نے آگھیرا، ان سے اتنا شدید تصادم ہوا کہ جامِ شہادت نوش فرما کر ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

شیخ وجیہ الدین کے بیٹے شاہ عبدالرحیم تھے، جو ۱۰۵۴ھ میں پیدا اور ستتر برس کی عمر پا کر ۱۱۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم اپنے عہد میں دیارِ ہند کے بہت بڑے عالم، مفسّر، محدث اور فقیہ تھے۔

شاہ ولی اللہ کی ولادت

شاہ عبدالرحیم کے فرزندِ رشید حضرت شاہ ولی اللہ تھے۔ شاہ عبدالرحیم عمر کی ساٹھ منزلیں طے کر چکے تھے کہ دوسری شادی کی۔ شاہ ولی اللہ کے سوانح نگاروں اور خود شاہ صاحب نے بھی انفاس العارفین میں لکھا ہے کہ شاہ عبدالرحیم نے دوسری شادی کسی غیبی اشارے کی وجہ سے کی تھی۔ بعض لوگوں

نے اس پر اعتراض بھی کیا اور کہا :

درین عمر کد خدائی مناسب نہ بود [۵۷]

اس عمر میں شادی مناسب نہ تھی۔

لیکن شاہ عبدالرحیم نے لوگوں کی یہ باتیں سنیں تو فرمایا :

مدتے دراز از عمر من باقیست و فرزندان بوجود خواہند آمد [۵۸]

میری عمر کا طویل حصہ ابھی باقی ہے اور چند لڑکے ابھی اور پیدا ہوں گے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ اس شادی کے بعد میرے والد شاہ عبدالرحیم سترہ سال زندہ رہے اور ان کے دو لڑکے تولد ہوئے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی بروز چہار شنبہ، بوقت طلوع شمس، ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۳ء) کو بہ عہد اورنگ زیب عالم گیر پیدا ہوئے۔ شاہ صاحب کی پیدائش سے چار سال بعد عالم گیر نے وفات پائی اور اس کے ساتھ ہی مغل حکومت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ کا مولد موضع پھلت ہے، جو ضلع مظفر نگر (بہار) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ علمی اعتبار سے اس گاؤں کو بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہے۔

شاہ ولی اللہ نے جس زمانے میں شعور کی آنکھیں کھولیں، اس زمانے کو سیاسی لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں اسلام کے عہدِ زوال سے تعبیر کرنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہبی اور علمی اعتبار سے مسلمانوں نے اس عہد میں بے حد ترقی کی منزلیں طے کیں، اور اصلاح و تجدید کے رفیع الشان کارنامے انجام دیے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہندوستان میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے، اسی زمانے میں (۱۱۱۵ھ - ۱۷۰۳ء) میں اسلام کے دورِ جدید کا دوسرا عظیم مصلح اور مجددِ ملت شیخ محمد بن عبدالوہاب

---

[۵۷] انفاس العارفین ص ۶۳ [۵۸] ایضاً ص ۶۴

سر زمینِ نجد میں ظہور پذیر ہوا۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔

تعلیم و تربیت

شاہ صاحب نے علم و فضل کی گود اور تقویٰ و تصوّف کی فضا میں پرورش پائی۔ پانچ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ساتویں سال میں قرآن پاک ختم کیا۔ اسی سال میں نماز اور روزے کی پابندی شروع کر دی۔ اسی سال میں فارسی کی کتابیں پڑھنے لگے۔ سال بھر میں یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا۔ اس کے بعد صرف و نحو کی کتابوں کا آغاز کیا۔ دس برس کی عمر میں شرح جامی پڑھ ڈالی اور پھر معقولات میں جا پہنچے۔ بعد ازاں اپنے والد بزرگ وار — حضرت شاہ عبد الرحیم — سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

علم حدیث میں مشکوٰۃ پڑھی، لیکن کتاب البیوع سے کتاب الادب تک کا حصہ چھوڑ دیا۔ اجازہ پوری کتاب کا حاصل ہو گیا۔ صحیح بخاری کتاب الطہارت تک شمائل النبی پوری کا سماع کیا، قرأت بعض ساتھیوں نے کی۔ علم تفسیر میں کچھ حصہ بیضاوی کا اور کچھ حصہ تفسیر مدارک کا پڑھا۔ قرآن مجید اس کے معانی اور شانِ نزول کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھا، اس اثنا میں کتبِ تفسیر کی طرف بھی رجوع کیا، جس سے بہت سے تفسیری فوائد حاصل ہوئے۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (تھوڑے سے حصّے کے سوا) دونوں کتابیں پڑھیں۔ اصولِ فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کچھ حصہ پڑھا۔ منطق میں شرح شمسیہ مکمل کی اور شرح مطالع کا کچھ حصہ پڑھا۔ کلام میں شرح عقائد، خیالی کا کچھ حصہ اور شرح مواقف کا کچھ حصہ۔ سلوک میں عوارف کا کچھ حصہ اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ۔ حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح، مقدمہ شرح لمعات — مقدمہ نقد النصوص — خواص اسماء و آیات میں اپنے والدِ گرامی

شاہ عبدالرحیم کا خاص مجموعہ، جس کی انھوں نے چند مرتبہ اجازت دی۔ طب میں موجز القانون۔ حکمت میں شرح ہدایۃ الحکمت وغیرہ۔ نحو میں کافیہ و شرح جامی۔ معانی میں مطوّل اور مختصر معانی پڑھی۔ ہندسہ و حساب میں بعض مختصر رسالے پڑھے۔

حصولِ علم کی اس مدت میں ہر فن کے بارے میں بہت سی اونچی باتیں شاہ ولی اللہ کے ذہن میں گردش کرتی تھیں جنھیں وہ "سخنانِ بلند" سے تعبیر کرتے ہیں، اور جتنی کوشش کرتے تھے، اس سے زیادہ مقصد حاصل ہوتا تھا۔

شادی

شاہ صاحب چودھویں سال کی عمر کو پہنچے تو شادی ہوگئی، شادی کے لیے شاہ عبدالرحیم بہت عجلت فرما رہے تھے۔ سسرال والوں نے شادی کے ضروری اسباب مہیا ہونے کا عذر کیا تو شاہ عبدالرحیم نے ان کو لکھا کہ اس کی پروا نہیں شادی جلد ہونی چاہیے اور اس "جلدی" میں ایک راز پنہاں ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ "یہ راز شادی کے بہت جلد بعد ظاہر ہوگیا۔ شادی پر ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میری بیوی کی والدہ وفات پاگئیں، اس کے جلد ہی بعد میری بیوی کے نانا اور اس کے چند ہی دن بعد شیخ فخر العالم، فقیر کے عمّ محترم شیخ ابوالرضا کے بیٹے فوت ہوگئے۔ بعد ازاں اس فقیر کے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔"

شاہ ولی اللہ اس سے آگے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

"اس کے فوراً بعد میرے والد بزرگوار پر بہت ہی ضعف اور نقاہت کا غلبہ ہوگیا اور مختلف عوارض نے ان کو آگھیرا۔ اس کے بعد ان کی وفات کا حادثہ پیش آگیا۔ غرض بزرگوں کی یہ جماعت منتشر ہوگئی اور سب کو معلوم ہو گیا کہ اگر اس زمانے میں شادی نہ ہوتی تو پھر کئی سال تک اس کا امکان نہ تھا۔"

بیعت و خلافت

شاہ ولی اللہ پندرہ سال کے ہوئے تو والدِ بزرگوار نے ان کی تربیتِ روحانی کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ سترہ سال کے ہوئے تو اپنا خلیفہ مقرر فرمالیا اور بیعت و ارشاد کی اجازت مرحمت کی۔ بیعت و ارشاد کی اجازت دیتے ہوئے انھوں نے "ید ہٗ کید ی" کہا، یعنی ولی اللہ کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے۔ اسی سال انھوں نے انتقال کیا۔ والد کی رحلت کے بعد شاہ صاحب نے مسندِ علم و ارشاد کو زینت بخشی اور ان کی جگہ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ کم و بیش بارہ برس کتب دینیہ و عقلیہ کا درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں شاہ صاحب نے ہر علم میں مہارت حاصل کی اور ہر فن میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ ان پر توحیدِ الٰہی کے راز کھلے، جذب کی راہیں کشادہ ہوئیں، معرفت و سلوک کی بہت بڑی دولت میسر آئی اور علوم وجدانیہ کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔

فرماتے ہیں، مَیں نے مذاہبِ اربعہ کی کتابیں پڑھیں، ان کے اصولِ فقہ کو مرکزِ التفات ٹھہرایا اور جن احادیث سے وہ تمسک کرتے ہیں ان پر غور کیا۔ ان کے گہرے مطالعہ و ملاحظہ کے بعد، وہی اسلوب و انداز میرے لیے قابلِ عمل اور لائقِ پذیرائی قرار پایا جو فقہائے محدثین کا تھا۔

قصدِ حجاز

شاہ ولی اللہ صاحب بارہ سال اپنے والدِ محترم شاہ عبدالرحیم کی مسندِ دعوت و ارشاد پر فائز رہے، اس کے بعد دل میں سفرِ حجاز کا داعیہ موجزن ہوا، اور ۱۱۴۳ھ کے آخر میں حجِ بیت اللہ کی نعمت سے مشرف ہوئے۔ ۱۱۴۴ھ میں مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ اس کے بعد مدینہ منورہ گئے اور شیخ ابوطاہر اور مشائخ حرمین سے روایتِ حدیث کی سعادت حاصل کی۔ شیخ ابوطاہر سے علم حدیث کی سند حاصل کی، اس سے قبل ہندوستان میں علمِ حدیث کی تعلیم مولانا محمد افضل

سیالکوٹی سے حاصل کی تھی۔ مشائخِ حرمین سے دلچسپ صحبتیں رہیں اور خوب استفادہ کیا۔ ۱۱۴۴ھ میں بھی شرفِ حج سے مشرف ہوئے۔ یعنی دو حج کیے۔

شاہ صاحب کے قلبِ صافی میں علمِ حدیث سے جو زیادہ رغبت پیدا ہوئی، اس کی بنیادی وجہ علمائے حجاز سے شرفِ تلمذ ہے۔ ان کی صحبت و تلمذ سے ذہن کی تمام صلاحیتیں اُجاگر ہوگئیں اور فکر و عمل کی دنیا بالکل بدل گئی۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خاندان ولی اللہی کے اکابر کے ذہن پر وحدت الوجود کا تصوّر نمایاں تھا۔ خود شاہ صاحب پر بھی اس کا اثر تھا، لیکن مشائخ حجاز کی صحبت و رفاقت سے اس کے اثرات زائل ہو گئے۔ بالخصوص شیخ ابو طاہر سے جو مسلکاً شافعی تھے، شاہ صاحب بہت متاثر ہوئے۔

جس زمانے میں ارضِ ہند کے شاہ ولی اللہ مدینہ منورہ میں طلبِ علم میں مشغول تھے، اسی زمانے میں سرزمین نجد کے شیخ محمد بن عبدالوہاب مدینہ طیبہ کے مختلف جیّد اساتذہ سے تحصیلِ علم میں مصروف تھے یعنی مستقبل کے یہ دونوں مجدّد اور عظیم مصلح ایک ہی عہد میں دیارِ حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) میں علمی اور روحانی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان دونوں مجددینِ ملّت کو ایک ہی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ نجد اور ہندوستان کی علمی، عملی، دینی اور سیاسی فضا بالکل ایک سی تھی۔ اس لیے دونوں نے اپنے اپنے حالات کے مطابق ایک ہی انداز سے اپنی تجدیدی مساعی کا آغاز کیا اور ایک ہی اسلوب سے اپنے کام کی رفتار کو آگے بڑھایا۔ پھر دونوں کو اپنی تبلیغی تگ و تاز کے سلسلے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی ایک ہی قسم کی تھیں۔

مراجعتِ وطن

جس زمانے میں شاہ صاحب حجازِ مقدس کو روانہ ہوئے تھے، اس زمانے میں ہندوستان کی سیاسی حالت نہایت ابتر تھی اور مرہٹوں کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اسی وجہ سے ہندوستان کے بعض حضرات نے شاہ صاحب کو

یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ عرب ہی میں اقامت گزین ہو جائیں۔ لیکن آپ نے مشائخ حجاز سے مستفید ہونے کے بعد واپس ہندوستان آنے کو ترجیح دی اور تبلیغ و اشاعتِ دین کے لیے اپنے آبائی وطن ہی کو منتخب کیا۔

شاہ صاحب نے جب مراجعتِ وطن کی تیاری فرمائی تو اپنے ایک نامور استاد شیخ ابوطاہر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور الوداعی سلام عرض کیا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں اس وقت کو کبھی نہیں بھول سکتا، جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور جدائی کی گھڑی سر پہ آ کھڑی ہوتی اور میں نے الوداعی ملاقات اور رخصتی سلام کے دوران یہ شعر پڑھا تو عجیب سماں پیدا ہو گیا:

نسیت کل طریق کنت اعرفہ

الا طریقا یؤدینی الی ربعکم

یعنی میں سوائے اس راستے کے جو مجھے تیرے گھر تک پہنچا دے، ان تمام راستوں کو بھول گیا ہوں، جن سے میں اس سے پہلے آشنا تھا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں، یہ شعر سنتے ہی شیخ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور شدتِ تاثر سے دونوں رخسار سرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وفورِ گریہ سے ان کا گلا رندھ گیا۔ اس کے بعد انھوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ اس عاجز کے لیے دعائے خیر کی۔

شیخ ابوطاہر اپنے تلمیذ رشید شاہ ولی اللہ کے فہم و ادراک کے انتہائی مداح تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے معانی کی سند لیتا ہوں۔

شاہ صاحب بروز جمعہ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ (۹ جولائی ۱۷۳۲ء) کو اپنے وطن دہلی واپس پہنچے۔

شاہ صاحب کا زمانہ

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شاہ ولی اللہ کی ولادت ایسے وقت میں

ہوئی، جب سلطنتِ مغلیہ اپنے عروج کی آخری منزل میں پہنچ گئی تھی اور صرف چار سال بعد یعنی اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے ساتھ ہی اس کا آفتابِ اقبال زوال پذیر ہونے لگا تھا۔

شاہ ولی اللہ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۳ء) کو پیدا ہوئے اور عالم گیر نے ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو وفات پائی۔ اس حساب سے شاہ صاحب کی ولادت عہدِ عالم گیری کے آخری زمانے میں ہوئی یعنی اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے چار سال پہلے شاہ صاحب نے اس عالمِ ناسوت میں قدم رکھا اور ان کا کاروانِ حیات دس بادشاہوں کے عہد سے گزرا۔ وہ بادشاہ بہ ترتیبِ حکمرانی حسب ذیل ہیں:

(۱) اورنگ زیب عالم گیر۔ (۲) محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اوّل۔ (۳) معز الدین جہاں دار شاہ۔ (۴) فرخ سیر۔ (۵) رفیع الدرجات۔ (۶) رفیع الدولہ (۷) محمد شاہ المعروف رنگیلا۔ (۸) ابو النصر احمد شاہ۔ (۹) عالم گیر ثانی۔ اور (۱۰) شاہ عالم بادشاہ۔

اس طویل عہد میں ہندوستان میں جو ہیبت ناک واقعات اور خون ریز حوادث رونما ہوئے، وہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انتہائی ذہنی اذیت اور قلبی کوفت کا باعث ہیں۔ اس مدت میں پورا ملک مختلف فتنوں اور مسلسل صدموں کی خوف ناک لہروں کی زد میں رہا۔ مرہٹوں کی بے پناہ سرکشی، سکھوں کے خون ریز مظالم، نادر شاہ کے قتل عام، ساداتِ بارہ کے تسلط، ان کے ہاتھوں فرخ سیر کی گرفتاری اور پھر انتہائی بے کسی کی موت، ہندوستان کی سیاست میں روہیلوں کی شرکت، دربارِ شاہی کے ایرانی اور تورانی امرا کی باہمی کشمکش، ارضِ ہند پر احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملے، مغربی طاقتوں کی بتدریج ملکی سیاسیات میں مداخلت، بنگال میں انگریزوں کا اقتدار اور مدراس کے بعض علاقوں پر اس کی حکومت کا قیام۔ یہ ایسے واقعات تھے جو تقریباً سب کے

سب شاہ ولی اللہ کی نظروں کے سامنے ظہور میں آئے۔ شاہ صاحب ان سے بدرجۂ غایت متاثر اور بے حد مغموم ہوئے۔ اس تاثر اور غم واندوہ کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ ابتدا ہی سے انتہائی حساس تھا اور اس کے تمام افراد مسلمانوں کی مشکلات سے بے حد اذیت محسوس کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے والدِ گرامی شاہ عبدالرحیم بھی ان حوادث سے سخت ملول تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ مُلک کو مختلف مصائب کے ہجوم نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے تو سلطنتِ آصفیہ کے بانی نظام الملک آصف جاہ کو ایک دردناک خط لکھا اور حکومتِ اسلامی کے تحفظ کے لیے میدانِ جہاد میں اترنے کی تلقین فرمائی تلقینِ جہاد کے سلسلے میں تاریخی نوعیت کا یہ خط شاہ عبدالرحیم نے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے دس بارہ سال بعد تحریر کیا تھا۔ غالباً وہ محمد شاہ کا ابتدائی عہدِ حکومت تھا۔ اصل خط فارسی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

بہ جانبِ وزیر الممالک آصف جاہ در تحریضِ جہاد تحریر یافت:

یعنی وزیر الممالک آصف جاہ کی طرف جہاد کا شوق دلانے کے لیے تحریر کیا گیا۔

اس فقیر کے دل پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ عالم ملکوت میں اس امر کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ کفار ذلّت وخواری سے دوچار ہوں اور اس سے کچھ عرصہ بعد باغیوں کا گروہ رسوائی اور خرابی میں مبتلا ہو۔ اگر شوکت مآب اور صاحبِ شہامت (آصف جاہ) ان گمراہ لوگوں کی مخالفت میں کمرِ ہمت باندھ لیں تو یہ تمام کارنامے آپ کی طرف منسوب ہوں گے، تمام عالم آپ کا مطیع ہوگا اور یہ کوشش اللہ کے دین کی ترویج اور آپ کی حکومت کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

اس سلسلے میں تھوڑی سی جدوجہد بھی بہت بڑے فائدے کا باعث ہوگی۔ یاد رہے، اگر آپ (کفار کو زیر کرنے کے لیے) کوشاں نہ ہوں گے، تب بھی وہ حوادثِ سماوی سے ہلاک اور کم زور ہو جائیں گے، لیکن اس صورت میں اسے آپ کے کارنامے میں

شمار نہ کیا جائے گا:

کارِ زلفِ تست مشک افشانی و اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

چوں کہ یہ بات یقینی طور پر معلوم تھی، اس لیے بے اختیار آں عزیز کو خط لکھا گیا۔ وقت کو غنیمت جانیں اور جہاد کے معاملے میں ہرگز سستی یا دیر نہ کریں عنقریب سب چیزیں واضح ہو جائیں گی۔ چوں کہ مجھے ایک ضروری چیز کا اظہار مقصود تھا اور دوستی اور خیر خواہی کا جذبہ دامن گیر ہو کر اس کے لیے مجبور کرتا تھا لہٰذا مبالغے سے احتراز کیا گیا ہے، اس سے زیادہ وضاحت سے لکھنا ممکن نہ تھا۔

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمے آید سواراں را چہ شد

اس کے بعد یعنی خط کے بالکل آخر میں شاہ عبدالرحیم تحریر فرماتے ہیں:

سخنے کہ با محرمانِ خود در پردہ ادا می کردیم ایں جا بے پردہ نوشتہ شد تا عذر نماند۔ والسلام والاکرام۔

یعنی وہ باتیں جو محرموں سے بھی راز میں کہی جاتی ہیں، یہاں بے حجاب نوکِ قلم پر آگئی ہیں، تاکہ کوئی عذر باقی نہ رہے۔

شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے والدِ گرامی کے اس نہجِ تبلیغ کو جاری رکھا، جن امرا و حکام نے تنفیذِ اسلام کے لیے کوششیں کیں، ان کی حوصلہ افزائی کی اور جو لوگ اسلامی حکومت کو مستحکم بنانے کے لیے میدانِ عمل میں نمودار ہوئے، ان کی پوری مدد کی —— ان میں ایک پائندہ خاں روہیلہ ہے، جو مشرقی ہند کے پہاڑی علاقے میں کفار سے برسرِ پیکار اور نصرتِ اسلام کے لیے مصروفِ تگ و تاز تھا۔ شاہ صاحب اس کو "عزیز القدر، رفعت مآب، المجاہد فی سبیل اللہ، الرافع لکلمۃ اللہ پائندہ خاں سلمہ اللہ تعالیٰ" کے پُر وقار

الفاظ سے خطاب کرتے ہیں۔ خود اپنا اسمِ گرامی انکسار کے ساتھ ”از فقیر ولی اللہ عفی عنہ“ تحریر کرتے ہیں۔ ان کے لیے پائندہ خاں روہیلہ کا ”جہاد کوہستان موجبِ فرح وخوشی وسبب دعا بہ ظہر الغیب“ ہوا۔ اس کی اس ”سعی“ سے نہایت خوش ہیں اور ان الفاظ کے ساتھ دعا کرتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

دوسرا خط شاہ صاحب کی طرف سے (از فقیر ولی اللہ عفی عنہ) سہارن پور کے فوجدار خان زمان خاں کے نام رقم فرمایا گیا۔ یہ امیر بھی کفار سے برسرِ پیکار ہے اور حمایتِ اسلام کے لیے میدانِ جنگ میں نکلا ہے۔ لہٰذا شاہ صاحب کرتے ہیں کہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ مجدّد قانون شجاعت و دلاوری، خان عوالی مرتبت خان زمان خاں جیو را مدتِ مدید در ردِّ مکاید طاغیان کفر از بیضۂ اہلِ اسلام منصور ومظفر دارد۔

یعنی خدا تبارک وتعالیٰ مجدد قانونِ شجاعت و دلاوری خان عالی مرتبت خان زمان خاں جیو کو مدتِ مدید تک اہلِ کفر کی مخالفت میں کامیاب وکامران رکھے۔

اوصافِ گوناگوں

شاہ ولی اللہ، اوصافِ گوناگوں کے حامل اور خصوصیاتِ بوقلموں کے مالک تھے۔ انھوں نے اس وقت شعور کی آنکھیں کھولیں جب ہندوستان کی سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب لبِ بام آچکا تھا، قدیم مسلم معاشرہ ختم ہو رہا تھا، اور یہ سیاسی نظام جو کم وبیش دو سو سال سے مغل حکمرانوں کے لیے مضبوط بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا، انہدام پذیر ہو چکا تھا، ہر شعبۂ حیات میں زوال اور ہر گوشۂ زندگی میں انحطاط کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے، دینی اور اخلاقی اقدار میں بھی کوئی استحکام نہ رہا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی، انتشار اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ دہلی کی وہ عظمت جو شاہ جہان اور عالم گیر کے دورِ حکومت

طرۂ امتیاز تھی، خاک میں مل چکی تھی۔ ایسے وقت میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے اور تنہا ایک شخص نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ پوری ایک جماعت بھی نہیں دے سکتی۔ [۹]

شاہ ولی اللہ صاحب کو اللہ نے بے شمار کمالات سے نوازا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، کلام، منطق، فلسفہ، تاریخ، سیاست، اقتصادیات، معاشیات، ہر موضوع پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے اسلام اور فلسفۂ اسلام کو جس مربوط شکل میں پیش کیا ہے اور جس اسلوب میں اس کے تمام گوشوں کو نکھارا اور واضح فرمایا ہے، اس میں کوئی ان کا حریف نہیں، انھوں نے جس نہج سے مختلف پیش آئند مسائل پر بحث کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ موضوع کی وضاحت میں وہ جو دلائل پیش کرتے ہیں اور جس زورِ بیان اور منطقی تسلسل سے بات کو آگے بڑھاتے ہیں، اس میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

تصنیفات

مصنف کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ کا درجہ بہت بلند ہے اور ان کا شمار معمورۂ ارض کے جلیل القدر مصنفین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جو بیش قیمت علمی ترکہ تصنیفات کی صورت میں اپنے پیچھے چھوڑا ہے، وہ ایک قوم یا ایک اقلیم کی میراث نہیں، بلکہ بجا طور پر پوری ملتِ اسلامیہ اور پورے عالمِ اسلام کا سرمایۂ افتخار ہے۔

---

۹ ان تینوں خطوط (یعنی شاہ عبدالرحیم کے خط آصفیہ خاندان کے بانی نظام الملک آصف جاہ کے نام اور شاہ ولی اللہ کے دونوں خطوط، بنام پائندہ خاں روہیلہ اور نوجدار خان زمان خان) کا ذکر شیخ محمد اکرام نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ خط ابھی تک شائع نہیں ہوئے، اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) کے ایک قلمی مجموعے میں درج ہیں۔ دیکھیے رودِ کوثر ص ۵۴۵ تا ۵۴۷

ان کی تصانیف کی عظمت کا راز، صرف کثرت ہی میں پوشیدہ نہیں، بلکہ موضوع کا تنوع، کتابوں کی مقبولیت و ترویج، مضامین کے اشکال اور پیچیدگی کی عقدہ کشائی، دقیق سے دقیق مسائل کا حکیمانہ پیرایۂ بیان میں اظہار، کتابوں کی ضخامت، خیالات کا عمق، افکار کی گہرائی، الفاظ میں اختصار اور مطالب میں وسعت، یہ وہ اوصاف ہیں، جو ان کی تصانیف کو دیگر مصنفین کی تصانیف سے امتیاز بخشتے ہیں۔

ایسے مصنفین کی تعداد بہت کم ہو گی جن کی تصانیف میں کسی نہ کسی نہج سے ان کے دور کی عکاسی نہ ہوتی ہو اور ان کے حالات و ظروف کی جھلک نہ پائی جاتی ہو، یا کسی حد تک اس زمان و مکان کی نشان دہی نہ ہوتی ہو، جس میں وہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ کی تصانیف بالعموم زمان و مکان کی قید سے مبرّا اور اپنے وقت و دور کے شکوہ و شکایت سے پاک ہیں۔ ان کی بعض تصانیف کے چند مقامات کو چھوڑ کر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس دور میں معرضِ تحریر میں لائی گئی ہیں، جب اس ملک کا امن و سکون غارت ہو گیا تھا اور ارضِ ہند میں خانہ جنگی، سیاسی بد امنی اور شور و شر کا دَور دَورہ تھا۔ دہلی کی سیاسی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور اس کا احترام خاک میں مل گیا تھا۔ ایک طرف سکھ اودھم مچا رہے تھے، دوسری طرف مرہٹوں نے ہنگامۂ بغاوت بپا کر رکھا تھا، تیسری طرف جاٹ یلغار کر رہے تھے اور چوتھی طرف روہیلے خود سری پر اتر آئے تھے۔ ان اندرونی سرکش عناصر کے علاوہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جن کا شمار اس دور کے مشہور سپاہ سالاروں میں ہوتا تھا، خیبر کے دروازے پر مسلح ہو کر کھڑے تھے، جب جی چاہتا ہندوستان کی سرزمین میں گھس آتے اور پھر اپنی مرضی سے واپس جاتے۔ کسی کو ان کے سامنے نظر اٹھانے کی جرأت اور ان سے مقابلے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اس اثنا میں دہلی کو بار بار لوٹ مار کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے سیاسی و مرکزی وقار کو پامال کیا گیا۔ لیکن قربان

جائیے دہلی کے اس تاج دارِ علم اور علم بردارِ تحقیق کے کہ یہ سب تماشہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا، اور وہ کامل امن و اطمینان کا پیکر بنا رہا۔ نہ دل میں اضطراب، نہ روح میں اضمحلال، نہ افکار میں انتشار، نہ قلم میں اضطرار، نہ زبان پر زمانے کی ستم رانیوں کا شکوہ، نہ لبوں سے حرفِ شکایت کا اظہار۔ ان کی تصانیف تو قلمون مضامین کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، مگر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بارھویں صدی ہجری کے پُر فتن اور پُر آشوب زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ ہر موضوع پر پورے اطمینان سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور ہر مسئلے کو کامل دلجمعی سے بیان کیا گیا ہے۔ نہ آسمان کی ہیبت ناک بجلیاں ان کے افکار کی روانی کو روک سکیں اور نہ زمین کی خوف ناک آندھیاں ان کے خیالات کے تسلسل میں خلل انداز ہو سکیں۔ فہم و فراست کی جو دولت اللہ نے ان کو بخشی تھی، مصائب و مشکلات کا سخت سے سخت ریلا بھی اس میں کسی نوع کی کمی نہ کر سکا۔ انھوں نے زمان و مکان کی گردشوں کی کبھی پروا نہیں کی اور اپنے قول و عمل سے ثابت کر دکھایا کہ اصحابِ تسلیم و رضا کا منصب کتنا بلند اور اربابِ علم و اہلِ حق کی شان کتنی اونچی ہے۔

شاہ صاحب کی تصانیف، کیفیت و کمیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی وفات کے وقت رائے بریلی کے مشہور بزرگ سید محمد نعمان حسنی دہلی میں موجود تھے اور شاہ صاحب کے پاس تھے۔ انھوں نے رائے بریلی ہی کے ایک دوسرے بزرگ سید ابوسعید حسنی (متوفی ۹ رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ) کے نام ایک مکتوب ارسال کیا تھا جس میں شاہ صاحب کے اوصاف و کمالات، علم و فضل، تدین و تقویٰ، آخری علالت اور وفات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہ مکتوب فارسی زبان میں ہے اور غیر مطبوعہ شکل میں ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس مکتوب میں انھوں نے شاہ صاحب کی تصنیفات کی تعداد نوّے بلکہ اس سے بھی زیادہ بتائی ہے۔ اس ضمن میں مکتوب نگار سید محمد نعمان حسنی کے الفاظ لائقِ ملاحظہ ہیں:

صاحب من! ظاہر صحبتِ ایشاں رو باستتار کشیدہ، تصنیفات آنحضرت نود بل زیادہ، در علومِ دین، از تفسیر و اصول و فقہ و کلام و حدیث مثل حجۃ اللہ البالغہ و اسرارِ فقہ و منصور و ازالۃ الخفا عن الخلفا، و ترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب بہ ہشتاد و نود جز کلاں بہ حجم خواہد بود، و دیگر رسائل در حقائق و معارف مثل الطاف القدس و ہمعات و فیوض الحرمین و انفاس العارفین وغیرہم کہ نشان از صحبت و برکت خدمت می دہند، می باید کہ عزیمت بر ایں آرند کہ ہمہ را نویسانیدہ رائج نمایند، باندک توجہات سرانجام خواہد یافت، و مثل ایں تصنیفات واللہ اعلم در اسلام تصنیف شدہ باشد یا نہ۔

صاحبِ من! حضرت (شاہ صاحب) رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہری صحبت تو اب میسّر نہیں آسکتی۔ البتہ علومِ دینیہ میں ان کی تصنیفات نوّے کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں، جو تفسیر، اصول، فقہ، کلام اور حدیث سے متعلق ہیں۔ جیسے حجۃ اللہ البالغہ، اسرارِ فقہ، منصور، ازالۃ الخفا عن الخلفا اور ترجمۂ قرآن۔ ان میں سے ہر کتاب کافی بڑی ضخامت پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں دیگر رسائل ہیں، جو حقائق و معارف کو محیط ہیں، جیسے الطاف القدس، ہمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہ۔ یہ کتابیں حضرت شاہ صاحب کے فیوض و برکات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج کرنے کا عزم فرمائیں۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پا سکتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسلام کے گزشتہ دور میں اس قسم کی کتابیں معرضِ تصنیف میں آئی ہیں یا نہیں۔

شاہ صاحب کی ان رفیع الشان تصانیف کا مختصر سا تعارف مندرجہ ذیل سطور میں کرایا جاتا ہے:

۱۔ فتح الرحمٰن: برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کا ترجمہ سب سے پہلے کس زبان میں ہوا، اور کس عالمِ دین نے کس زمانے میں کیا؟ یہ ایک نہایت اہم سوال اور تحقیق طلب موضوع ہے۔ واقعات کی ترتیب سے معلوم

ہوتا ہے کہ قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ سندھی زبان میں ہوا۔[۱۰] مغل حکمران جہاں گیر نے بھی (جس کا انتقال ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو ہوا) گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک عالمِ دین شیخ محمد بن جلال حسینی گجراتی کو قرآنِ مجید کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا، اور کہا تھا کہ ترجمہ لفظی ہو، اور الفاظِ قرآن سے ایک حرف بھی زائد نہ ہو۔ نیز تاکید کی تھی کہ ترجمہ آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ الفاظ اور زبان میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع ہرگز نہ ہو۔[۱۱]

معلوم نہیں یہ ترجمہ مکمل ہوا یا نہیں ہوا، یا اب کہیں موجود ہے یا نہیں ہے۔ اگر یہ ترجمہ تکمیل کے مراحل سے گزر گیا، یا کسی حد تک بھی ہو چکا تو غالباً قرآن مجید کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو برِصغیر کے ایک عالم نے فارسی زبان میں کیا، یا اس ملک کے ایک حکمران نے ایک عالمِ دین کو اس اہم خدمت پر مامور کیا۔

لیکن اس وقت برصغیر میں فارسی زبان میں قرآن مجید کا جو ترجمہ دست یاب ہے، یا جو اولین ترجمے کی حیثیت سے معروف ہے، وہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا ترجمہ ہے، جو نہایت مستند اور عمدہ ترین ترجمہ ہے اور فتح الرحمٰن کے نام سے موسوم ہے، اس کے مقدمے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "صبیان اہلِ حرفہ وسپاہیان" جو عربی کی پوری تعلیم حاصل نہیں کر پاتے، اس ترجمے سے استفادہ کریں گے، اور "جمہورِ مسلمانان" کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ یہ نہایت مختصر مگر بہت جامع ترجمہ ہے، اور عمدہ ترین "فوائد" بھی اس کے ساتھ تحریر فرمائے گئے ہیں۔ اس کی تکمیل ماہِ رمضان ۱۱۵۱ھ میں ہوئی۔

---

[۱۰] دیکھیے عجائب الہند ص ۲ تا ۴۔ نیز تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فقہائے ہند جلد اوّل ص ۸۹ تا ۹۱

[۱۱] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۱۔ نیز دیکھیے فقہائے ہند جلد ۴ حصہ دوم ص ۱۹

شاہ صاحب کی یہ ایک عظیم الشان خدمت ہے۔ اس برصغیر میں فہمِ قرآن کا دروازہ اسی ترجمے کی بدولت کھلا۔ اس کے بعد جو ترجمے ہوئے وہ سب اسی سے مستفاد ہیں۔

۲۔ **الفوز الکبیر** : یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور اصولِ تفسیر سے متعلق نہایت مفید اور بصیرت افروز کتاب ہے۔ چار ابواب پر مشتمل ہے، ان ابواب میں علمِ احکام، علمِ مخاصمہ، علم تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ، تذکیر بالموت و مابعد الموت اور ترتیبِ نزول وغیرہ اہم امور سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے سببِ تالیف کا ذکر شاہ صاحب ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں :

چوں بریں فقیر درے از فہم کتاب اللہ کشادند، خواست کہ بعضے نکاتِ نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یاراں را بہ کار آید، در رسالہ مختصرے مضبوط نماید۔

یعنی جب اس فقیر (ولی اللہ) پر اللہ نے قرآن مجید کے فہم کے دروازے وا کردیے تو دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ چند ایسے مفید نکات بیان کردیے جائیں جو قرآن سے متعلق تدبر و غور کے سلسلے میں لوگوں کے لیے افادے کا باعث ہوسکیں، چنانچہ اس مختصر رسالے میں وہ نکات معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

الفوز الکبیر، ۱۸۹۰ء میں مطبع مجتبائی دہلی نے شائع کی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا رشید احمد انصاری نے مطبع احمدی علی گڑھ سے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا۔

۳۔ **فتح الخبیر** : عربی زبان میں قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح اور غرائب کی شرح پر مشتمل ہے۔ کہنا چاہیے کہ قرآن کی تفسیر کا یہ نہایت مختصر مگر جامع نمونہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے تفسیر کے بارے میں صحیح طریقے سے جو کچھ منقول ہے، تقریباً وہ سارا مواد اس میں سمیٹ لیا گیا ہے۔

۴۔ **مصفّٰی** ۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق کتاب "موطا"

کی فارسی شرح ہے۔ جلد اوّل مطبع فاروقی دہلی سے اور جلد دوم مطبع مرتضوی دہلی سے ۱۲۹۳ھ میں طبع ہوئی تھی۔

۵۔ **مسوّٰی** : موطا امام مالکؒ کی عربی شرح ہے۔ ۱۲۹۳ھ اور ۱۳۴۷ھ میں دو دفعہ دہلی سے شائع ہوئی۔ شاہ صاحب درسِ حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے، موطا کی یہ دونوں فارسی اور عربی شرحیں یعنی مصفّٰی اور مسوّٰی اس کا ایک نمونہ ہیں۔

۶۔ **حجۃ اللہ البالغۃ** : اسرارِ دین اور فلسفۂ اسلام سے متعلق یہ معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ اس کو فلسفیانہ اسلوب میں پورے اسلام کی شرح سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ارکانِ دین اور اجزائے اسلام کو اس میں نہایت حکیمانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اسلام ایک مکمل اور مربوط نظام حیات کا نام ہے، جس میں انسان کی دینی زندگی اور حیاتِ اجتماعیہ کے تمام سلسلے بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ اس میں انسان کی تمدنی ترقی کے مختلف مراحل اور سیاستِ ملی کے مدارج کی تفصیلات سے بھی بحث کی گئی ہے اور اس کو جن اقتصادی، معاشی اور سیاسی منازل سے گزرنا پڑتا ہے، اس کی تشریح بھی انتہائی عمدہ اور دل نشین طریقے سے کی گئی ہے۔ شاہ صاحب کے فکری رجحانات کو سمجھنے اور احکامِ اسلام کے فلسفیانہ مزاج کو ذہن کی گرفت میں لانے کے لیے یہ کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب عربی زبان میں ہے اور کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مشمولات و مضامین کی اہمیت کے پیش نظر متعدد اہلِ علم نے اس کو اردو کے قالب میں بھی ڈھالا ہے۔

۷۔ **البدور البازغہ** : اس کتاب کو حجۃ اللہ البالغہ کے بعض خاص ابواب کی تلخیص کہنا چاہیے۔ سب سے پہلے اسے مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کیا تھا۔

۸۔ **ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء** : اس کتاب میں

"خلافتِ راشدہ" کو شاہ صاحب نے "اصلِ دین" قرار دیا ہے، اور اسلامی فکر کے ارتقا اور اس کے سیاسی تصوّرات کی تدوین میں اس کو بنیاد اور اساس ٹھہرایا ہے۔ اسلام کے "اصول عمران" اور "نظریۂ سیاست" کی پوری تشریح اس میں بیان کردی گئی ہے۔ نیز بہت سے تاریخی حقائق کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور متعدد مسائل کی زلفِ گرہ گیر کو سلجھایا گیا ہے۔ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ سب سے پہلے ۱۲۸۶ھ میں مطبع صدیقی بریلی میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔

۹- قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین: فارسی زبان میں یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں شاہ صاحب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی افضلیت بیان فرمائی ہے۔

۱۰- الانصاف فی سبب الاختلاف: اس کتاب میں کتبِ احادیث کی تالیف و ترتیب اور مختلف مذاہبِ فقہ کے نشوو ارتقا کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ نیز مسائل دینی میں فقہی نہج کے جو اختلافات پیدا ہوئے، ان کے اسباب اور پس منظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ کتاب عربی زبان میں ہے اور صحابہ، تابعین اور بعد کے ائمۂ مجتہدین کے درمیان جن مسائل کے بارے میں مختلف آرا نے جنم لیا، اس کی پوری تفصیل اس میں موجود ہے۔ اصل عربی میں کتاب مع اردو ترجمے کے مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی نے ۱۳۰۸ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع کی تھی۔

۱۱- عقد الجید: تقلید اور اجتہاد سے متعلق محققانہ مباحث کو محیط ہے۔

۱۲- تحفۃ الموحّدین: دعوتِ توحید اور ردِّ شرک میں شاہ صاحب کی یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اگرچہ مختصر ہے مگر مطالب و معانی کے لحاظ سے نہایت جامع اور بہترین کتاب ہے۔ توحید خالص کی تعریف و تصریح اور اس موضوع کے طریقِ بیان کے لحاظ سے شاہ ولی اللہ کی "تحفۃ الموحدین" کو حضرت شاہ

اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان" کے متن یا اساس و بنیاد سے تعبیر کرنا چاہیے بہت عرصہ پیشتر حکیم اجمل خاں دہلوی مرحوم کے بڑے بھائی حکیم حافظ عبد المجید خاں مرحوم (بانی طبیہ کالج دہلی) کے پریس اکمل المطابع دہلی میں یہ کتاب اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اپنے موضوع اور صاف ستھرے اسلوب بیان کی وجہ سے اس کتاب نے بڑی شہرت حاصل کی۔

۱۳۔ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری: صحیح بخاری کے تراجم الابواب کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں یہ کتاب اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ عربی زبان میں ہے۔ ۱۳۲۳ھ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوئی تھی۔ پھر اصح المطابع دہلی کی طرف سے جو صحیح بخاری شائع ہوئی تھی، اس کے شروع میں اس کتاب کو بطور مقدمے کے چھاپ دیا گیا ہے۔

۱۴۔ مجموعہ رسائل اربعہ: یہ بہت چھوٹے چھوٹے چار رسائل کا مجموعہ ہے۔ ہر رسالہ فن حدیث سے متعلق ہے۔ ایک کا نام "الارشاد الیٰ مہمات علم الاسناد" ہے۔ اس میں ارض حجاز کے شیوخ و اساتذہ کا ذکر ہے۔ دوسرے کا نام رسالہ اوائل ہے۔ تیسرا تراجم البخاری ہے۔ یہ رسالہ "شرح تراجم ابواب صحیح البخاری" کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق کا ہے۔ چوتھے رسالے کا نام ما یجب حفظہ للناظر ہے۔

۱۵۔ تفہیمات الٰہیہ: (دو جلد) اس میں عربی اور فارسی میں تصوف و سلوک اور علوم شریعت سے متعلق مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں بعض ذاتی کیفیات و مشاہدات بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ بعض تفہیمات عربی میں ہیں اور بعض فارسی میں ہیں۔

۱۶۔ الخیر الکثیر: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ علم اسرار و حقائق اور تصوف کے بارے میں بلند پایہ کتاب ہے۔

۱۷۔ فیوض الحرمین: قیام حرمین کے زمانے میں جو روحانی

افاضات و مشاہدات روح و قلب پر وارد ہوتے، انھیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۸- الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین: اس میں اُن "مبشرات" کا ذکر ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود شاہ صاحب کو یا ان کے بعض نسبی یا روحانی بزرگوں کو حاصل ہوئے۔

۱۹- انفاس العارفین: اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال و سوانح کا تذکرہ تحریر فرمایا ہے۔ کتاب بعض بیش قیمت معلومات کو محیط ہے

۲۰- انسان العین فی مشائخ الحرمین: اس میں اپنے مشائخ و اساتذۂ حرمین مثلاً شیخ احمد شناوی، شیخ احمد قشاشی، سید محمد علوی، سید عبدالرحمٰن الادریسی، الشہیر بالمحجوب اور شمس الدین محمد وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

۲۱- القول الجمیل فی بیان سواء السبیل: اس میں برصغیر پاک و ہند میں صوفیا کے جو سلسلے رائج ہیں، ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۲۹۱ھ میں یہ کتاب مولوی خرم علی نے مطبع نظامی کان پور سے شاہ عبدالعزیز دہلوی کے اردو ترجمے اور حاشیے کے ساتھ "شفاء العلیل" کے نام سے شائع کی تھی۔

۲۲- الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ: یہ کتاب صوفیا کے مختلف سلسلوں کی تاریخ اور ان کی بعض تعلیمات کے مختصر تذکرے پر مشتمل ہے۔ ۱۳۱۱ھ میں سیّد ظہیر الدین عرف سیّد احمد نے جو حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کے نواسے تھے اس کو مع اردو ترجمے کے مطبع احمدی سے شائع کیا تھا۔

۲۳: الطاف القدس: اس میں تصوف کے بنیادی تصوّرات کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔

۲۴- سطعات: مسائلِ تصوف سے متعلق ہے۔ یہ کتاب سیّد ظہیر الدین عرف سیّد احمد نے مطبع احمدی سے شائع کی تھی اور اس کی وجہِ اشاعت ان الفاظ میں بیان کی تھی ـــــ "منشا دلی اس کم ترین کا یہ ہے کہ اس کے نفع سے اعانت

مدرسہ کہنہ مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی بجاوے اور جو عرصہ چالیس سال سے چراغِ علم گل ہوگیا ہے جس میں اولاد مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رہتی ہے از سر نو روشن کیا جاوے۔

۲۵- **لمعات**: اس میں علمِ تصوف کے بعض اہم مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۲۶- **مکتوبات فی مناقب امام بخاری و ابن تیمیہ**: یہ شاہ صاحب کے چند اہم مکاتیب کا مجموعہ ہے، جن میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مکاتیب نذیریہ لائبریری دہلی کے مہتمم مولانا سید عبدالرؤف مرحوم نے مع اردو ترجمے کے شائع کیے تھے۔

۲۷- **مکتوب المعارف مع مکاتیب ثلثہ**: یہ شاہ صاحب کے بعض اہم مکاتیب کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے۔

۲۸- **سرور المحزون**: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے بارے میں ابن سید الناس کا ایک مختصر سا رسالہ نور العین ہے۔ شاہ صاحب کی یہ کتاب اس کا فارسی ترجمہ ہے، جو بعض احباب کی درخواست پر انھوں نے کیا تھا۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتا ہے اور اسی بنا پر کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ متعدد حضرات نے اس کے اردو ترجمے بھی کیے۔ ان ترجموں میں ایک ترجمہ مولا بخش چشتی نے کنز المکنون کے نام سے کیا جو مطبع ستارہ ہند دہلی میں ۱۳۱۵ھ میں چھپا۔ ایک ترجمہ مولانا عاشق الٰہی نے کیا، جس کا نام الذکر المکنون رکھا۔ یہ ترجمہ فتح پرنٹنگ ورکس دہلی میں شائع ہوا۔ ایک ترجمہ قرۃ العیون کے عنوان سے نواب محمد وزیر خاں کے حکم سے ۱۲۷۱ھ میں کیا گیا اور مطبع محمدی ٹونک سے شائع ہوا۔

۲۹- **الجزء اللطیف**: شاہ صاحب کی خود نوشت مختصر سوانح عمری۔

۳۰- **المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیہ**: شاہ صاحب کا

یہ وصیت نامہ ہے اور وصیت نامہ کے نام سے کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس کی شرح لکھی تھی جو مطبع مطیع الرحمٰن شاہ جہان آباد سے ۱۲۶۸ھ میں شائع ہوئی۔

۳۱- تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء: اس میں آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا علیہم السلام کے واقعات وقصص اس نہج سے بیان کیے ہیں کہ مختلف زمانوں میں جو شریعتیں رائج تھیں ان کے بنیادی اصول واضح ہو جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد (سندھ) نے اسے شائع کیا ہے۔

۳۲- ھوامع شرح حزب البحر: یہ حزب البحر کی شرح ہے۔

۳۳- العقیدۃ الحسنہ: اسلام کے بنیادی عقائد اس میں نہایت واضح انداز میں بیان کیے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۳۴- چہل حدیث: چالیس احادیث جمع کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ سب سے عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۵ھ) نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے اہلِ علم نے مختلف مضامین کی چالیس احادیث جمع کیں، اور لوگوں نے اس سے استفادہ کیا۔ شاہ صاحب نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ ان کی جمع کی ہوئیں چہل احادیث کئی مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

۳۵- شرح رباعتین: خواجہ باقی باللہ (متوفی ۲۵ جمادی الاخری ۱۰۱۲ھ) کی دو رباعیوں کی شرح، جس میں تصوف کے بعض اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔

۳۶- امداد فی مآثر الاجداد: یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں شاہ صاحب نے اپنے بعض بزرگوں کے حالات تحریر کیے ہیں۔

۳۷- العطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ: یہ چھوٹا سا رسالہ شیخ محمد پھلتی کے حالات میں ہے جو شاہ صاحب کے نانا تھے۔

۳۸- مسلسلات: عربی میں ہے اور فنِ حدیث سے متعلق ہے۔

۳۹- رسالہ دانش مندی: فنِ دانش مندی کے متعلق فارسی میں ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔

۴۰- اطیب النغم فی مدح سیّد العرب والعجم: یہ قصائد ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وتوصیف فرمائی گئی ہے، آپ کی نبوت ورسالت کے بارے میں دلائل بیان کیے گئے ہیں اور آپ کی اطاعت کو ضروری اور فرض قرار دیا گیا ہے۔

۴۱- نبذۃ الابریزیہ فی الطبقۃ العزیزیہ: اس میں اپنے ایک بزرگ شیخ عبدالعزیز دہلوی کا ترجمہ درج ہے۔ سات صفحے کا یہ رسالہ مطبع احمدی سے مجموعہ رسائل خمسہ میں شائع ہوا تھا۔

۴۲- بوارق الولایتہ: یہ رسالہ انفاس العارفین میں شامل ہے۔

۴۳- شفاء القلوب۔

۴۴- زہراوین۔

۴۵- المقدمۃ السنیہ۔

۴۶- فتح الودود فی معرفۃ الجنود۔

ان کے علاوہ شاہ صاحب کی اور بھی بہت سی تصانیف تھیں جو دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئی ہیں اور آج ان کے نام معلوم کرنا بھی ممکن نہیں۔

یوں تو یہ تمام تصانیف بہترین عنوانات پر مشتمل اور اپنے اپنے موضوع میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، لیکن ان میں حجۃ اللہ البالغہ بالخصوص انتہائی شان دار کتاب ہے۔ نواب صدیق حسن خاں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایں کتاب اگرچہ در علمِ حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ، و حِکم و اسرار آں بیان نمودہ تا آں کہ در فنِ خود غیر مسبوق الیہ واقع شدہ

ومثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجرت از ہیچ یکے از علمائے عرب وعجم تصنیفے بوجود نیامدہ، ومن جملۂ تصانیف مؤلفش مرضی بودہ است، وفی الواقع بیش ازاں است کہ وصفش تواں نوشت۔[۱۲]

یعنی یہ کتاب اگرچہ علم حدیث سے متعلق نہیں ہے، تاہم اس میں بہت سی احادیث کی شرح کر دی گئی ہے، اور ان کے فلسفے، حکمت اور اسرار کو اس انداز سے معرضِ بیان میں لایا گیا ہے کہ اپنے موضوع میں یہ منفرد حیثیت اختیار کر گئی ہے، اور اس سے قبل کوئی کتاب اس اسلوب سے نہیں لکھی گئی۔ یہاں تک کہ اسلام کے گزشتہ بارہ سو سال کے عرصے میں علمائے عرب وعجم میں سے کوئی شخص اس قسم کی کتاب تصنیف نہیں کر سکا۔ اس کے مؤلف شہیر (شاہ ولی اللہ) کی تصانیف میں یہ عمدہ ترین تصنیف ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب کے بے بہا معلومات کی وجہ سے اس کی تعریف وتوصیف کو حیطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ صاحب کی نہایت مہتم بالشان کتاب ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ آغاز میں حضرت مؤلف نے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں تالیف کتاب کی اصل وجہ بیان کی ہے۔ نیز طبقاتِ محدثین اور علم حدیث کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ مقدمہ بہترین معلومات کو محیط ہے۔

اس کتاب میں شاہ صاحب نے اسرارِ دین اور فلسفۂ دین کی عمدہ ترین انداز میں وضاحت کی ہے۔ نیز بتایا ہے کہ احکامِ اسلام میں کیا مصلحتیں اور حکمتیں کار فرما ہیں۔ ارکانِ اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو الگ الگ ابواب میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس سلسلے کی احادیث نقل کر کے بتایا ہے کہ عقلی نقطۂ نظر سے اس میں کیا مصالح پنہاں ہیں۔ سیاستِ مدن، معیشت،

---

[۱۲] اتحاف النبلاء ص ۱۷

اقتصادیات، معاملات، احسان، آدابِ مجلس، مکارمِ اخلاق، تربیتِ منزل، خطابت، قضا وغیرہ امور کو مناسب تفصیل کے ساتھ انتہائی عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ غرض یہ کتاب اپنے مشمولات و مندرجات کے اعتبار سے شاہ صاحب کی تصانیف میں بہ درجہ غایت اہمیت کی حامل ہے۔ اہلِ حدیث، فقہائے کرام اور فقہائے حدیث کے متعلق اس کے مباحث نہایت معلومات افزا اور لائقِ مطالعہ ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شریعتِ اسلامی کے اسرار و حقائق کچھ اس نہج سے معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں کہ اس کتاب کا شمار علم کلام کی عظیم کتابوں میں ہونے لگا ہے۔ علم کلام کا مطلب اسلام کے بارے میں یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا ہے اور بالکل صحیح اور سچا مذہب ہے۔

کتاب کی بے پناہ افادیت کی وجہ سے اس کو حضرت نواب صدیق خاں رحمۃ اللہ علیہ کے خسر مدار المہام محمد جمال الدین خاں بہادر نائب ریاست بھوپال نے شاہ صاحب کی ایک اور عمدہ تصنیف ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفا کے ساتھ اپنے خرچ سے ۱۲۸۵ھ میں مطبع صدیقی بریلی سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کئی دفعہ مختلف مطابع سے شائع ہوئی۔ ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں اسے مکتبہ سلفیہ، لاہور نے بھی خوب صورت کاغذ و طباعت کے ساتھ شائع کیا۔

شاہ صاحب کی تصنیفات کا یہ مجمل سا تعارف تھا۔ اب ان کی موٹی موٹی خدماتِ علمی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

خدمتِ قرآن مجید

شاہ صاحب کی عظیم الشان خدماتِ دینیہ میں سب سے نمایاں اور رفیع المرتبت خدمت قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب کے زمانے

میں برِصغیر کی دفتری زبان فارسی تھی اور مدارس میں زیادہ تر اسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن قرآن مجید کا فارسی زبان میں کوئی ترجمہ متداول نہ تھا۔ اس سے قبل بلاشبہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطینِ جون پور کے ابتدائی عہد میں "بحرِ مواج" کے نام سے قرآن کی ایک تفسیر سپردِ قلم کی تھی، اس تفسیر میں ہر آیت کی تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ بھی درج تھا، لیکن یہ پورے قرآن کا ترجمہ نہ تھا، قرآن کے بعض حصوں کا ترجمہ تھا، اسی لیے اسے شہرت و قبولیت حاصل نہ ہوسکی شیخ سعدی کی طرف بھی ایک فارسی ترجمہ منسوب کیا جاتا ہے اور وہ دست یاب بھی ہے لیکن شیخ ممدوح کی طرف اس کی نسبت بہر حال مشکوک ہے۔ ویسے بھی یہ ترجمہ اہل علم میں کبھی مروج نہیں ہوا۔

بہر حال شاہ ولی اللہ اس برِصغیر کے پہلے عالم ہیں، جنھوں نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے کی سنجیدگی سے ضرورت محسوس کی، اور پھر شروع سے آخر تک پورے قرآن پاک کا ترجمہ کر ڈالا۔ اس سے قبل قرآن مجید کو حفظ کرنے کا رواج تو ضرور تھا اور اس کی تفسیریں بھی موجود تھیں لیکن اس کے الفاظ کے معانی و مفہوم کو سمجھنے کے لیے سرزمینِ ہند کے کسی عالم کے پاس کوئی باقاعدہ ترجمہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ یہاں کے علما اس کی پاکیزہ تعلیمات سے یکسر محروم تھے۔ قرآن کے کسی حصے پر کوئی غیر مسلم اعتراض کرتا تو ترجمے سے ناواقفیت کی بنا پر اس کا جواب دینا اور اسے مطمئن کرنا مشکل تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کے دربار میں جب مسلمان علمائے دین اور پرتگیزی پادریوں کے درمیان اسلام اور قرآن سے متعلق مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان پادریوں نے جو قرآن کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے مضامین و محتویات سے اچھی طرح واقف تھے، اس کے بعض مقامات کو اعتراض و تنقید کا ہدف ٹھہرایا۔ اس وقت اس راز سے پردہ اٹھا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا، وہ بھی اس کے مضامین و مشمولات کے بہت سے پہلوؤں سے پوری طرح واقفیت نہ رکھتے تھے۔ دورانِ بحث بعض اوقات

ایسا بھی ہوتا کہ پادری قرآن مجید کے کسی واقعہ یا مضمون پر معترض ہوتے، اور مسلمان کم علمی کی بنا پر اس کا جواب نہ دے پاتے تو فوراً کہہ دیتے کہ یہ بات تو قرآن میں سرے سے موجود ہی نہیں، لیکن جب قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جاتا تو وہ واقعہ قرآن میں موجود ہوتا۔

بہرکیف شاہ صاحب نے قرآن مجید کے ترجمے کی ضرورت کو بہت ہی شدت سے محسوس کیا، اور واقعات کے تسلسل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا احساس انھیں حجازِ مقدس کے زمانۂ قیام میں ہوا۔ وہاں کے علمائے تفسیر و حدیث کے اثرِ صحبت سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اس ملک کے مسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ چنانچہ حجاز سے واپس دہلی تشریف لانے کے بعد رمضان المبارک ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۷ یا ۱۷۳۸ء) میں اس کی تکمیل فرمائی۔

تکمیلِ ترجمے کے بعد شاہ صاحب کو ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، وہ تھی علمائے وقت کی مخالفت۔ علما کو جب پتا چلا کہ شاہ صاحب نے قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے تو شدید مخالفت شروع کر دی، بلکہ دشمنی پہ اُتر آئے اور کلام الٰہی کے معانی کو کسی دوسری زبان میں بیان کرنا ان کے نزدیک قرآن کی توہین اور بے ادبی قرار پایا۔ یہ ہنگامہ یہاں تک بڑھا کہ شاہ صاحب کی زندگی خطرے میں پڑ گئی اور انھیں کچھ عرصے کے لیے دہلی کی سکونت ترک کر کے کسی دوسری جگہ جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ بالآخر شاہ صاحب نے جرأت سے کام لے کر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کر دی کہ قرآن مجید کا مقصد محض یہی نہیں کہ حصولِ برکت کے لیے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر اسے گھروں میں رکھ لیا جائے، یا اس کی آیات سے بیماروں پہ دم کر دیا جائے۔ یہ تو انسانی زندگی کے لیے ایک لائحۂ عمل مہیا کرتا اور لوگوں کو عظیم الشان دستورِ حیات سے نوازتا ہے۔ دینی اور دنیوی زندگی میں کامیابی کے تمام راز اس میں مضمر

ہیں، اگر اس کے معانی و مطالب کو اچھی طرح سمجھ کر اس کی تلاوت کی جائے تو انسانی فلاح و بہبود کے دروازے ایک ایک کرکے وا ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی صورت یہی ہے کہ جو زبانیں ملک میں رائج ہوں، ان زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے اس اندازِ تفہیم سے مخالفت کا زور کم ہوا، اور پھر ان کے فارسی ترجمے کی بھی خوب اشاعت ہوئی اور اردو اور دوسری زبانوں کے تراجم کے لیے بھی راہ ہموار ہو گئی۔

شاہ صاحب کے ترجمے پر ڈھائی سو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس اثنا میں بے شمار اہلِ علم نے قرآن کے ترجمے کیے، یہاں تک کہ بعض حضرات نے علاقائی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ کیا، لیکن اس کی اولیت کا سہرا شاہ ولی اللہ کے سر ہی بندھے گا۔ وہ پہلے عالم ہیں، جن کے ترجمے نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور لوگوں کی وسیع تعداد نے اس سے استفادہ کیا۔ اب بھی حوالے کے لیے اسی ترجمے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب ان تمام اوصاف سے متصف اور ان تمام خصوصیات سے مالا مال تھے، جن سے قرآن کے مترجم کو ہونا چاہیے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں وہ اوصاف و خصائص جمع نہیں ہوئے۔ مولانا نذیر احمد کے حوالے سے شیخ محمد اکرام مرحوم لکھتے ہیں:[۱۳]

فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علیٰ وجہ الکمال پائی جاتی تھیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہی کا حصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیشِ نظر

---

۱۳ رودِ کوثر ص ۵۵۳، ۵۵۴۔

ہیں، اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں، اسے اختیار کرتے ہیں ۔

شاہ صاحب نے قرآنِ مجید کا ترجمہ بھی کیا اور اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا جس میں اس اہم موضوع کے بعض بنیادی گوشوں کی وضاحت کی اور بعد میں آنے والے مترجمینِ قرآن کے لیے رہنما اصول متعین کیے۔ علاوہ ازیں علم تفسیر کے متعلق انھوں نے "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کے نام سے عظیم الشان کتاب تصنیف کی علوم قرآن اور فہم قرآن کے لیے یہ کتاب اولین اہمیت کی حامل ہے اور اہلِ علم کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

شاہ صاحب نے "وصیت نامہ" میں بھی قرآن مجید کے بارے میں بعض باتیں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلے قرآن کا لفظی ترجمہ پڑھنا چاہیے، تفسیر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ترجمہ مکمل کرنے کے بعد تفسیر پڑھی جائے۔ استاد کو چاہیے کہ طویل مباحث والی تفسیروں کے بجائے تفسیر جلالین پڑھائے اور اسی قدر پڑھائے، جتنی کہ درس میں داخل ہے۔ آیات کے شانِ نزول اور نحو کے مشکل مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا جائے، تاکہ طالب علم بات کی تہ تک پہنچ جائے اور قرآن اور اس کے ضروری مطالب کو سمجھنے میں دقت پیدا نہ ہو۔

حدیث کی خدمت

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے زمانے میں حدیثِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی بے حد خدمت کی۔ انھوں نے حجاز مقدس میں جید اور مشہور اساتذہ سے پہلے خود حدیث پڑھی اور اس کے متعلقہ علوم پر عبور حاصل کیا۔ اس کے بعد واپس ہندوستان تشریف لائے تو اس بنیادی علم کو مزید مرکزِ التفات ٹھہرایا۔ شاہ صاحب سے قبل برصغیر کے مدارس دینیہ میں حدیث کی زیادہ ترویج نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور بعض دیگر علمائے کرام کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی اور بعض اہم کتابوں کی شرحیں سپرد قلم کیں

تاہم اس علم کی مزید خدمت کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے حدیث کے فروغ و اشاعت کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا اور ان علما و طلبا کو جو منطق و فلسفہ، صرف و نحو اور فقہ کی کتابوں پر زیادہ زور دیتے تھے، علم حدیث کے حصول کی ترغیب دی۔ باشندگانِ ہند کے ذہن میں انھوں نے اس حقیقت کو راسخ کرنے کی کوشش کی کہ علم حدیث کی تعلیم ہمارے فرائض میں داخل ہے، جب تک اس علم کی تحصیل نہیں کی جائے گی، معرفت و ادراک میں درجۂ کمال تک رسائی نہیں ہو سکے گی۔

حدیث کی نشر و اشاعت کے لیے شاہ صاحب نے تحریری خدمت بھی انجام دی اور تدریسی بھی۔ تحریری خدمت یہ ہے کہ موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ موطا امام مالک حدیث کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ اس کی ترتیب اور اسلوب سے شاہ صاحب نہایت متاثر تھے اور اس کی بہت ہی تعریف فرماتے تھے۔ ”وصیت نامہ“ میں لکھتے ہیں کہ طالب علم میں جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھانا چاہیے۔ موطا کو ہرگز ترک نہ کیا جائے، کیوں کہ یہ علم حدیث کی اساس اور اصل ہے۔ اس کے پڑھنے سے بے شمار علمی فیوض حاصل ہوتے ہیں۔ بعض حیثیتوں سے شاہ صاحب موطا کو صحیح بخاری پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس اہم کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں اور دوسری عربی میں۔ فارسی شرح کو ”المسوّٰی“ کے نام سے موسوم کیا اور عربی شرح کا نام ”المصفّٰی“ رکھا۔ یعنی شاہ صاحب نے ان دونوں زبانوں میں جو ان کے عہد میں اظہارِ خیال کا ذریعہ تھیں، موطا کی شرحیں قلم بند کیں۔ اس سے ان کا مقصد ہر قسم کے اہلِ علم میں موطا کو متعارف کرانا اور اس کے مطالب کو عام کرنا تھا۔

مسوّٰی اور مصفّٰی کے علاوہ انھوں نے شرح تراجم ابواب صحیح البخاری کے نام

سے ایک کتاب تصنیف کی، جو صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح پر مشتمل ہے۔ پھر حجۃ اللہ البالغہ تحریر فرمائی، جو اسرارِ شریعت اور فلسفۂ احکام سے متعلق ایک ضخیم اور مشہور ترین کتاب ہے۔ اس کے مضامین و محتویات کا زیادہ تر حصہ احادیث پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب علمِ حدیث میں بے حد عمق اور درک رکھتے تھے۔

عوام میں اشاعتِ حدیث کے لیے بھی انھوں نے مختصر مگر بعض اہم کتابیں لکھیں، جن میں چہل حدیث، النوادر من الحدیث اور الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

بہرحال شاہ صاحب نے حدیث اور اس کے متعلقات کے بارے میں بہترین خدمت انجام دی اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بے حد کوششیں کیں۔ چنانچہ برصغیر میں حدیث اور علومِ حدیث کا آج جو چرچا ہے اس میں شاہ صاحب اور ان کے اخلاف کا بہت بڑا حصہ ہے۔

علمِ فقہ

شاہ ولی اللہ، یوں تو علمِ فقہ اور مسائلِ فقہ میں کامل مہارت رکھتے تھے اور اس کی تفصیلات اور جزئیات سے پوری طرح آگاہ تھے، لیکن ان کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم فقہ سے ان کو زیادہ دلچسپی یا قلبی لگاؤ نہ تھا۔ اس موضوع سے متعلق نہ انھوں نے کوئی خاص اور قابلِ ذکر کتابیں لکھیں اور نہ بہت زیادہ فتوے تحریر کیے۔ البتہ اس علم کے صحت مندانہ اصولوں سے علما کو متعارف ضرور کرایا اور جن حالات میں اس علم کی تدوین عمل میں آئی اور عہد بہ عہد اس نے ارتقا کی جو منزلیں طے کیں اس کو واضح کیا۔ اس سلسلے میں ان کی تصنیف "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" بڑی اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے اور ایک رسالے کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم تاریخ فقہ اور تاریخ علم حدیث میں نہایت معلومات افزا ہے۔ اسلام کے عہدِ آغاز سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک

تدوینِ فقہ، کتب احادیث کی تیاری اور مختلف مذاہبِ فقہ کے آغاز اور ان کے ضروری کوائف کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں حضرت مصنف نے وہ تمام بنیادی مسائل وضاحت اور پورے اعتدال کے ساتھ بیان کیے ہیں، جو علما کے نزدیک مختلف فیہ ہیں۔ پھر اختلاف کے وجوہ و اسباب پر بھی محققانہ اسلوب میں روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں اہلِ سنت کے مذاہبِ اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسالکِ فقہی کی خصوصیات اور ان کی تدوین و تشکیل کا پورا پس منظر بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب نے احادیث کی جمع و تدوین اور اصحابِ حدیث کی مختلف کتابوں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، اور سنن ابی داؤد کی خصوصیات و امتیازات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اجتہاد اور تقلید کے اہم مسئلے کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا ہے اور ان وجوہ کی صراحت کی ہے جو تقلید کی ترویج کا باعث بنے۔ تقلید کے متعلق متاخرین کے گروہ نے جس غلو سے کام لیا ہے، شاہ صاحب نے اس کا بھی ذکر فرمایا ہے، اور لکھا ہے کہ بعد کے لوگوں نے محض تقلید کو کافی سمجھ لیا اور اسی پر جم کر بیٹھ گئے۔ اجتہاد کے دروازے بند کر لیے اور تحقیق سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نہ حق کو باطل سے الگ کرنے کی زحمت گوارا کی اور نہ جدل کو استنباط سے ممتاز کرنے پر توجہ مبذول کی۔ ان کے نزدیک فقیہ وہی کہلاتا تھا جو بہت زیادہ باتیں کرنے کا عادی ہو، اور جس نے فقہائے متقدمین کے قوی و ضعیف اقوال میں امتیاز کیے بغیر بیان و اظہار کو اپنا شیوہ بنا لیا ہو۔ ان کے نقطہ نظر سے محدث وہ تھا جو صحیح و ضعیف حدیثوں کو شمار کرتا اور انھیں بلا سوچے سمجھے بیان کرتا پھرے۔ اس کے بعد ایسا دور آیا کہ لوگ مزید فتنے میں مبتلا ہو گئے اور تقلید میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ دلوں سے دیانت داری کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور دین کے معاملے میں غور و فکر سے منہ موڑ لیا۔ انھوں نے اس قسم کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ ہم اسی روش پر چلیں گے جو ہمارے آبا و اجداد کی تھی اور اسی دین پر کاربند رہیں گے جو ہمارے بڑوں کا تھا ہمارا کام

فقط ان کے نقوشِ قدم کی پیروی کرنا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں علمِ فقہ باقاعدہ مدوّن اور مرتب شکل میں نہ تھا۔ نہ اس کی یہ تعریف کی جاتی تھی جو بعد میں کی جانے لگی۔ نہ اس زمانے میں احکامِ فقہ پر اس اسلوب سے بحث کی جاتی تھی جس طرح ہمارے زمانے کے فقہا میں کی جاتی ہے۔ اب یہ حالت ہے کہ فقہا، احکامِ دین میں سے ہر حکم کے الگ الگ ارکان، شرائط اور آداب کو دلائل سے ثابت کرتے اور معرضِ بیان میں لاتے ہیں۔ وہ مسائلِ شرعیہ کی مختلف صورتیں متعین اور فرض کر لیتے ہیں۔ پھر ان بیرونی فرضی صورتوں کو باقاعدہ موضوعِ بحث ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلے کو بعض اوقات وہ بہت دور تک پھیلا دیتے ہیں۔ عہدِ رسالت میں ایسا قطعاً نہ ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ چنانچہ وہ اسی طرح وضو کرتے، جس طرح آنحضرتؐ کو دیکھتے۔ ایسا نہ ہوتا کہ آنحضرتؐ، یہ بتاتے کہ یہ چیز وضو کا رکن ہے، یہ آدابِ وضو میں سے ایک ادب ہے اور یہ شرائطِ وضو ہیں۔ اسی طرح آنحضرتؐ نماز پڑھتے اور صحابہ آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے، چنانچہ اسی طرح نماز پڑھتے، جس طرح آپ نے نماز پڑھی تھی۔ آنحضرتؐ نے حج کیا، اور صحابہ نے آپ کو مناسکِ حج ادا کرتے ہوئے دیکھا، چنانچہ انھوں نے بھی اسی طرح حج کیا جس طرح آنحضرتؐ نے کیا تھا۔

غرض عام طور پر آنحضرتؐ کا یہی معمول تھا۔ آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ وضو کے فرض چھ ہیں یا چار، نہ کبھی یہ فرض کیا کہ ہو سکتا ہے کوئی شخص اس طرح وضو کرے کہ اعضائے وضو پر برابر پانی نہ ڈالے، جس کی وجہ سے وضو کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا حکم لگایا جا سکے۔ ان امور کے بارے میں صحابہ کرام آپ سے بہت ہی کم سوال کرتے تھے۔

اس موقع پر شاہ صاحب نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی ۔ وہ آنحضرتؐ سے زیادہ سوال کرنے اور مسائل دریافت کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے ۔ انھوں نے آپ کی رحلت تک آپ سے صرف تیرہ سوال پوچھے، ان سب کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے ۔ ان تیرہ سوالوں میں سے ایک یہ ہے :

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۔

یہ لوگ آپ سے، اے نبی! حرمت کے مہینوں میں لڑائی کی بابت پوچھتے ہیں ۔

دوسرا سوال ہے : يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۔

(اے پیغمبر!) آپ سے یہ لوگ حیض کے متعلق احکام کے سلسلے میں دریافت کرتے ہیں ۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں، صحابہ کرام، آنحضرتؐ سے وہی بات پوچھتے تھے، جو ان کے لیے دینی لحاظ سے مفید ہوتی تھی ۔

اس کے بعد صحابہ کرام مختلف شہروں اور ملکوں میں پھیل گئے، اور حالات بدلے تو بکثرت واقعات رونما ہوئے، جس کی وجہ سے نئے نئے مسائل سامنے آئے ۔ اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں مسائل میں مزید اضافہ ہوا، اور پہلے سے زیادہ باتیں معرض ظہور میں آئیں ۔ اس طرح مسائل کے حل و کشود کے لیے فقہی مذاہب وجود میں آئے اور پیش آئند معاملات سے نمٹنے کے لیے نئی نئی شکلوں نے جنم لیا ۔

شاہ ولی اللہ نے اس طرح فقہ کی نشو و نما اور فقہی مسائل کے عالم وجود میں آنے کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام بحث نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے ۔

اجتہاد اور تقلید

شاہ صاحب نے اجتہاد اور تقلید کو بھی ہدفِ بحث بنایا ہے اور اس موضوع سے متعلق ان کی تصانیف میں سے "عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید" لائق مطالعہ تصنیف ہے۔ شاہ صاحب اپنی اس کتاب میں اجتہاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ علما کے مباحث اور نقطۂ نظر سے اجتہاد کی جو تعریف فہم کی گرفت میں آتی ہے، وہ ہے، شریعت کے فروعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے دریافت کرنے اور سمجھنے کی پوری پوری کوشش کرنا۔ ان تفصیلی دلائل کا تمام تر مرجع چار چیزیں ہیں :

(۱) قرآن مجید۔ (۲) سنتِ نبوی۔ (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔!

شاہ صاحب نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اجتہاد کے لیے کیا شرائط ہیں اور مجتہد کون ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اجتہاد کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن و سنت کے ان مسائل سے معرفت و ادراک رکھتا ہو، جن کا تعلق احکام سے ہے۔ پھر وہ مواقعِ اجماع، شرائطِ قیاس، کیفیتِ نظر[۱] عربی زبان، ناسخ و منسوخ اور راویوں کے حالات کا عالم ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں، اجتہاد کے لیے علمِ کلام اور فقہ کی ضرورت نہیں، لیکن امام غزالی کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں فقہ کی مشق و ممارست سے اجتہاد کی استعداد حاصل ہوتی ہے، اور اس دور میں مسائل کو صحیح طور سے سمجھنے کا یہی طریقہ ہے، البتہ صحابہ کے زمانے میں اس کی ضرورت نہ تھی۔

امام بغوی کے نزدیک مجتہد وہ ہو سکتا ہے، جو ان پانچ اقسام علم پر

---

[۱] مقدماتِ قیاس کو اس طرح مرتب کرنا کہ ان سے صحیح نتیجہ حاصل ہو سکے، نظر کہلاتا ہے۔

حاوی ہو:

(۱) قرآن مجید کا علم۔

(۲) سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم۔

(۳) علمائے سلف کے اقوال کا علم، ان اقوال کا علم جن پر ان کا اجماع تھا، اور ان کا بھی جن میں وہ اختلاف رائے رکھتے تھے۔

(۴) لغتِ عربی کا علم اور

(۵) قیاس کا علم۔! "قیاس" کہتے ہیں، کتاب وسنت سے استنباطِ حکم کو، جب کہ پیش نظر مسئلے کا حکم نہ تو صراحتاً کتاب وسنت میں ہو، اور نہ اجماع میں۔!!

شاہ صاحب بلاشبہ اجتہاد کے قائل ہیں، لیکن ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت نہیں دیتے۔ جس عالم میں وہ شرائط پائی جائیں جو مذکورہ بالا سطور میں بیان کی گئی ہیں اور ہمارے اسلاف سے ثابت ہیں، اس کو وہ یقیناً اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں۔

اسی طرح تقلید کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر اعتدال پر مبنی ہے اس ضمن میں ان کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص کتاب وسنت کے احکام پر نظر رکھتا ہو، مسائل کی تحقیق کر سکتا ہو، اور صحیح وغیر صحیح میں امتیاز پر قادر ہو، اسے تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ براہِ راست قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرے اور اپنے علم وتحقیق کی روشنی میں نصوصِ شرعیہ پر نگاہ ڈالے۔ پھر وہ انہی امور پر عمل پیرا ہو، جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں۔ لیکن جو شخص علم وفضل سے آراستہ نہیں، عام لوگوں کی صف میں شامل ہے، اس کے لیے ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" کے آخر میں قرآن مجید کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اگر تم خود علم نہیں رکھتے تو اصحابِ علم سے پوچھ لو۔

شاہ صاحب نے اجتہاد و تقلید اور اس کے حدود پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ شیخ عبدالوہاب شعرانی کی تصنیف الیواقیت والجواھر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کہا کرتے تھے کہ جو شخص کسی مسئلے میں میری پیش کردہ دلیل سے آگاہ نہیں، اسے محض میرے کلام کی بنیاد پر فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ معمول تھا کہ جب وہ فتویٰ دیتے تو اس پر تحریر فرماتے کہ یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے، اور جتنی میں استطاعت رکھتا تھا، اس کے مطابق یہ بہترین رائے ہے، جو شخص اس سے بہتر رائے پیش کرے، وہ صواب کا مستحق ہوگا — امام مالک کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنی بات میں قابلِ گرفت نہ ہو، اور اس کی بات اسی کی طرف لوٹائی نہ جائے، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے۔

شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ امام حاکم اور امام بیہقی نقل کرتے ہیں کہ امام شافعی کہا کرتے تھے کہ جب کوئی مسئلہ آنحضرتؐ کی حدیث سے ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ اگر تم میری بات کو حدیث کے خلاف پاؤ تو حدیث پر عمل کرو، اور میری بات کو دیوار پر دے مارو۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد پر کسی کو کلام کرنے کا حق نہیں۔ انھوں نے ایک شخص سے یہ بھی فرمایا کہ نہ تم میری تقلید کرو، نہ مالک کی، نہ اوزاعی کی، نہ نخعی کی، اور نہ کسی اور کی۔ تم وہیں سے احکام اخذ کرو، جہاں سے ان لوگوں نے اخذ کیے تھے۔ یعنی کتاب و سنت سے۔!

بہرحال شاہ ولی اللہ اس مجتہد کے اجتہاد کے قائل تھے جو ان اوصاف سے متصف ہو، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ جو لوگ مسائلِ شرعیہ میں خود تحقیق کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں، ان کو وہ تقلید کی اجازت نہیں دیتے۔ تقلید میں

غلو اور حد سے تجاوز کرنے کے بھی شدید مخالف تھے۔ اس ضمن میں وہ اعتدال کے حامی تھے اور صرف عوام کے لیے تقلید کی حمایت کرتے تھے۔ تقلید کی ایک قسم کو تو شاہ صاحب قطعاً حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تقلید کی یہ وہ قسم ہے، جس میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر مقلد ہر صورت میں صراحتاً حدیث رسول کریم پر اپنے مفتیوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تقلید حرام کی صورت یہ ہے کہ کسی فقیہ کے بارے میں یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ علم و ادراک میں انتہائی درجے کو پہنچ گیا ہے۔ اس سے غلطی اور خطا کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے مقلد کو اگر ایسی کوئی صحیح اور واضح حدیث سنائی جائے جو اس کے فقیہ کے قول کے مخالف ہو تو وہ اس کے قول کو ترک نہیں کرتا۔

مسلکی نقطۂ نظر

شاہ صاحب بہ ظاہر اگرچہ حنفی تھے، لیکن فروعی مسائل اور ان امور میں جو اہل حدیث اور احناف کے درمیان مختلف فیہ ہیں، ان کا نقطۂ نظر بڑے اعتدال و توازن پر مبنی تھا۔ تشدد اور غلو سے ان کو نفرت تھی، جو بات قرآن و حدیث کی میزان میں پوری اترتی، اسی پر عمل کرتے اور تحریر و تقریر میں اسی کا اظہار فرماتے۔ اگر کوئی شخص مسئلہ دریافت کرتا تو اسی کے مطابق جواب دیتے۔ انھوں نے ائمہ حدیث کی فقہ یا فقہ الحدیث کے کچھ بنیادی اصول مقرر کیے ہیں، جن کا اپنی معروف تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں ذکر فرمایا ہے۔ وہ اصول مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اگر قرآن مجید میں کوئی حکم صراحت سے موجود ہو، تو اہلِ حدیث کے نزدیک اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ کسی دوسری طرف التفات کی ضرورت نہیں۔

۲- اگر حکم قرآنی میں تاویل کی گنجائش ہو اور مختلف مفہوم پیدا ہونے کا احتمال ہو تو اس صورت میں سنت کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ قرآن کے اسی مفہوم کو

صحیح سمجھا جائے گا جس کی تائید سنت سے ہوتی ہو۔

۳۔ اگر قرآن کسی حکم کے بارے میں خاموش ہو تو عمل سنت پر ہوگا، اگرچہ وہ سنت تمام فقہا میں متعارف اور معلوم ہو، یا کسی خاص شہر، علاقے اور خاندان سے مروی ہو، کسی نے اس کو معمول بہا ٹھہرایا ہو، یا نہ ٹھہرایا ہو۔ ائمہ حدیث کے نزدیک وہ بہر حال قابلِ حجت اور لائق استناد قرار پائے گی۔

۴۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مل جائے تو اس کے مقابلے میں کسی مجتہد اور امام کے قول کو کوئی اہمیت نہ دی جائے گی، نہ کوئی اثر قابلِ توجہ ہوگا۔

۵۔ اگر پوری کوشش کے باوجود کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے کے لیے کوئی حدیث نہ ملے تو صحابہ کرام کے ارشادات اور تابعین کے اقوال کو لائقِ عمل ٹھہرایا جائے گا، اور اس میں کسی شہر، علاقے یا خاندان کی قید یا تخصیص نہیں ہوگی۔

۶۔ اگر جمہور فقہا کسی معاملے میں متفق ہوں، تو اسے عمل کے لیے کافی قرار دیا جائے گا۔

۷۔ اگر فقہا کے درمیان اختلاف ہو، تو ان فقہا سے مروی حدیث قبول کی جائے گی جو تقویٰ اور ضبط میں زیادہ اچھی شہرت کے مالک ہوں، یا پھر اس روایت کو قابلِ قبول سمجھا جائے گا جو زیادہ مشہور ہو۔

۸۔ اگر علم و فضل، ورع و تقویٰ اور ضبط و حفظ میں سب ایک سے ہوں اور زیر بحث مسئلے میں متعدد اقوال منقول ہوں، تو جس امام کے قول پر مناسب سمجھیں، عمل کیا جائے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۹۔ اگر اس میں بھی اطمینان بخش کامیابی نہ ہو تو قرآن و سنت کے عمومی اقتضا اور ارشادات پر عمل کیا جائے گا اور مسئلہ زیر بحث کے نظائر کو دیکھا جائے گا، پھر اس کی روشنی میں حکم کا استخراج کیا جائے گا۔ اس میں اصول فقہ کے مروّج و مشہور قواعد پر اعتماد نہ کیا جائے گا بلکہ اطمینانِ قلب اور ضمیر کے سکون کو۔

قابلِ اعتماد گردانا جائے گا۔

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ شاہ ولی اللہ تقلید سے وابستگی کے زیادہ قائل نہیں ہیں، اور مسائل میں کتاب وسنت کو ہر حال میں مقدم رکھنے کے سختی سے حامی ہیں۔ ائمۂ سلف کے عمل و قول کا درجہ ان کے نزدیک بہت بعد میں آتا ہے۔ وہ حتی الامکان شخصی آرا و افکار اور تقلید کے جمود و تقید سے ذہنوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اہلِ سنت کو شاہ صاحب دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک فریق کو وہ اہل الحدیث کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ایک کو اہل الرائے کے نام سے۔ یوں تو دونوں فریقوں کے نہج و اسلوب کو وہ صحیح سمجھتے ہیں، لیکن فقہائے اہلِ حدیث کے طریقِ عمل کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غلو خواہ کسی طرف سے ہو، اس کے وہ سخت مخالف ہیں۔ مسائل میں تعصب اور حدِ اعتدال سے تجاوز کو وہ قطعاً برداشت نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

باید دانست کہ سلف در استنباطِ مسائل و فتاویٰ بر دو وجہ بودند۔ یکے آں کہ قرآن و حدیث و آثارِ صحابہ جمع می کردند و از انجا استنباط می نمودند دریں طریقہ اصل راہِ محدثین است، و دیگر آں کہ قواعد کلیہ کہ جمع از ائمہ تنقیح و تہذیب آں کردہ اند یاد گیرند بے ملاحظہ ماخذ آنہا۔ پس ہر مسئلہ کہ وارد می شد جواب آں از ہمہ قواعد طلب می کردند، و ایں طریقہ اصل راہِ فقہاست و غالب بر بعض سلف طریقہ اولیٰ بود، و بر بعض آخر، طریقہ ثانیہ[۱۵]

یعنی یاد رکھنا چاہیے کہ سلف میں فتاویٰ و مسائل میں استنباط کے دو طریقے مروج تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ جمع کرتے تھے، اور انھیں اصل قرار دے کر ان کی روشنی میں پیش آئند مسائل پر غور کرتے تھے۔ یہ محدثین کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ائمہ کے منقح و مہذب کیے ہوئے قواعد کلیہ کو اصل

۱۵۔ مصفّیٰ ج ۱ ص ۴

قرار دیا جائے اور انہی سے پیش آئندہ مسائل کا حل تلاش کیا جائے، اور اصل ماخذ کو لائقِ اعتنا قرار دینے کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ یہ فقہا کا طریقِ عمل ہے۔ سلف کا ایک کثیر طبقہ پہلے طریقے کا پابند ہے اور ایک طبقہ دوسرے طریقِ عمل کا!

یہاں شاہ صاحب نے دونوں فریقوں کے الگ الگ طریقِ عمل کا ذکر کر دیا ہے، کسی کو تنقید کا ہدف نہیں بنایا۔ یہ ان کی میانہ روی اور اقتصاد و اعتدال کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اصحاب الحدیث اور محدثین کے طریقِ عمل کو دوسرے طریقِ عمل پر ترجیح دیتے ہیں۔ وصیت نامے میں بھی کتاب و سنت کی پیروی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں:

وصیّتِ اوّل، ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب وسنت در اعتقاد و عمل و پیوستہ بتدبر ہر دو مشغول شدن و ہر روز حصہ از ہر دو خواندن، و اگر طاقت خواندن نہ دارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن، و در عقائد مذہب قدمائے اہلِ سنت اختیار کردن و از تفصیل و تفتیش آنچہ سلف تفتیش نہ کردند، اعراض نمودن و بہ تشکیکات معقولیانِ خام التفات نہ کردن، و در فروع پیروی علمائے محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن، و دائماً تفریعات فقہیہ را برکتاب وسنت عرض نمودن، آنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن، و الاّ "کالائے بد بریش خاوند" دادن، امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات برکتاب وسنت استغنا حاصل نیست، و سخن متقشفہ فقہا کہ تقلید عالمے را دستاویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نشنیدن و بدیشاں التفات نہ کردن، و قربت خدا جستن بہ دوری ایناں۔

یعنی اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب و سنت (قرآن و حدیث) کو نہایت مضبوطی سے پکڑا جائے، اور برابر ان کے تدبر میں مشغول رہا جائے، اور اگر عربی نہ جاننے کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتا ہو، تو کسی

دوسرے سے دونوں کا کم از کم ایک ورق ترجمہ ہی سن لیا کرے ۔ اور عقائد میں قدمائے اہلِ سنت کا مسلک اختیار کیا جائے، اور اسلافِ کرام نے جس چیز کی کھود کرید نہیں کی، اس کے پیچھے نہ پڑا جائے، اور "معقولیانِ خام" جو شبہات پیدا کرتے ہیں ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی جائے، اور فروعِ فقہ میں ان علمائے محدثین کی پیروی کی جائے جو حدیث و فقہ کے جامع ہوں، اور فقہی تخریجات کو لازماً ہمیشہ کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے، جو بات اس کے مطابق ہو اس کو قبول کر لیا جائے، ورنہ "کالائے بد بریش خاوند" والا معاملہ کیا جائے ۔ اور یہ یاد رکھا جائے کہ امت کسی وقت بھی "مجتہداتِ فقہا" کو کتاب و سنت کی بنیاد پر جانچنے سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتی ۔ اور وہ متقشف فقہا جو کسی عالم کی بات کو دستاویز قرار دے کر سنت کے تتبع سے بے پروا ہو گئے ہیں، ان کی بات تک نہ سنی جائے اور نہ ان کو قابلِ التفات گردانا جائے، بلکہ ان سے دور رہ کر اللہ کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کیا جائے ۔

شاہ صاحب کسی ایک ہی امام یا مجتہد کے مقلد نہ تھے، بلکہ جو بات حدیث سے ہم آہنگ ہوتی، اس پر عمل کرتے ۔ اس سلسلے میں وہ احناف یا شوافع میں کسی امتیاز کے پابند نہ تھے ۔ چنانچہ تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں :

ونحن ناخذ من الفروع ما اتفق علیہ العلماء لاسیما ھاتان الفرقتان العظیمتان الحنفیۃ والشافعیۃ وخصوصا فی الطہارۃ والصلوٰۃ فان لم یتیسر الاتفاق واختلفوا فناخذ بما یشھد لہ ظاہر الحدیث ومعروفہ [16]

ہم فروعات میں ان مسائل پر عمل کرتے ہیں، جن پر علما کا اتفاق ہو خصوصیت سے جن پر اہل سنت کی دو بڑی جماعتیں حنفی اور شافعی متفق ہوں ۔ طہارت اور

---

[16] تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ۲۴۲

نماز سے متعلق مسائل میں ہم بالخصوص اس کا التزام کرتے ہیں۔ اگر ان دو بڑی جماعتوں کا اتفاق نہ ہو، تو جو مسائل ظواہر حدیث کے موافق ہوں، ان پر عمل کرتے ہیں۔

اب ذیل میں وہ چند مسائل درج کیے جاتے ہیں جن میں شاہ صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر عمل فرماتے تھے:

۱۔ امام کی اقتدا میں سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ یہ ایک مشہور مسئلہ ہے۔ احناف اس کے قائل نہیں، لیکن شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

وان کان ماموما وجب علیہ الانصات والاستماع، فان جھر الامام لم یقرأ الا عند الاسکاتۃ وان خافت فلہ الخیرۃ فان قرأ فلیقرأ الفاتحۃ قرأۃ لا یشوش علی الامام، وھذا اولی الاقوال عندی، وبہ یجمع بین احادیث الباب [کله]

مقتدی کو چاہیے کہ امام کے پیچھے خاموشی سے سنے، اگر امام اونچی آواز سے پڑھے تو مقتدی سکتوں میں پڑھے۔ اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہو، تو مقتدی کو اختیار ہے، جس طرح چاہے پڑھے۔ لیکن سورہ فاتحہ اس طرح پڑھے کہ امام کی قرأت میں تشویش اور پریشانی نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ نقطۂ نظر اولی ہے، اور اس مسئلے کے متعلق جو احادیث مروی ہیں، ان میں توافق و تطابق کی صحیح صورت یہی ہے۔

۲۔ حضرات احناف نماز میں رفع یدین کے قائل نہیں، لیکن شاہ ولی اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ رفع یدین کرنے کی احادیث "اکثر" اور "اثبت" ہیں۔ اسی طرح وہ وتر کی ایک رکعت کو بھی "سنت" قرار دیتے ہیں، جب کہ احناف تین رکعت کے قائل ہیں۔ مگر شاہ صاحب ان مسائل میں جھگڑا فساد کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

والحق عندی فی مثل ذلک ان الکل سنۃ، ونظیرہ الوتر برکعۃ

[کله] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۹

واحدۃ او بثلاث، والذی یرفع، أحب الی ممن لایرفع، فان احادیث الرفع اکثر واثبت، غیر انہ لاینبغی لانسان فی مثل ھٰذہ الصور ان یثیر علیٰ نفسہ فتنۃ عوام بلدہ۔[18]

میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا دونوں سنت ہیں۔ یہی معاملہ ایک رکعت یا تین رکعت وتر پڑھنے کا ہے۔ رفع یدین کرنے والا میرے نزدیک نہ کرنے والے سے زیادہ اچھا ہے، کیوں کہ رفع یدین کی احادیث تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور زیادہ صحیح بھی ہیں۔ لیکن انسان کو اس قسم کے مسائل میں اپنے شہر کے لوگوں کو یہ موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ اس کے خلاف ہنگامہ بپا کریں۔

۳۔ فقہائے حنفیہ وتر ول کو واجب قرار دیتے ہیں اور محدثین اسے سنت کہتے ہیں۔ شاہ صاحب بھی اس میں محدثین کی تائید فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

والحق ان الوتر سنۃ ھو اوکد السنن، بینہ علی وابن عمر وعبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہم۔[19]

وتر سنت مؤکدہ ہے۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے اور انھوں نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

۴۔ عذر کی بنا پر دو نمازیں جمع کرنے کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ فقہائے حنفیہ نہ جمع تقدیم کے قائل ہیں، نہ جمع تاخیر کے۔ لیکن شاہ صاحب جمع تقدیم کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جمع تاخیر کو بھی۔ فرماتے ہیں:

ومنھا الجمع بین الظھر والعصر، والمغرب والعشاء۔[20]

---

[18] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۱۰

[19] ایضاً ص ۱۷

[20] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۲۴۔

یعنی ایک مسئلہ نماز ظہر اور نماز عصر کو اور نماز مغرب اور نماز عشا کو جمع کر کے پڑھنے کا ہے۔

فشرع لھم جمع التقدیم والتاخیر لکنه لم یواظب علیه ولم یعزم علیه مثل ما فعل فی القصر[21]

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں کی اجازت دی لیکن نہ اس پر ہمیشگی کا حکم دیا اور نہ اس کی تاکید فرمائی، جیسا کہ سفر میں نماز قصر کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

۵۔ جمعۃ القریٰ یعنی دیہات میں جمعہ پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ احناف اور اہلِ حدیث کے درمیان یہ ایک مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ احناف دیہات میں جمعے کے قائل نہیں ہیں، جب کہ حدیث کی روشنی میں اہلِ حدیث اسے ضروری قرار دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ بھی دیہات میں جمعے کے وجوب کے قائل ہیں۔ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل فرماتے ہیں:

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیه الجمعة واجبة علی کل قریة[22]

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جمعہ ہر گاؤں میں پڑھنا واجب ہے۔

اس سے آگے فرماتے ہیں:

ومن تخلف عنها فھو الآثم[23]

جو شخص جمعہ ترک کر دے وہ گناہ گار ہے۔

۶۔ عیدین کی تکبیرات میں فقہائے حنفیہ اور محدثین میں اختلاف ہے، محدثین کا نقطۂ نظر اس باب میں وہی ہے، جو اہل الحرمین

---

۲۱ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۲۴

۲۲ و ۲۳ ایضاً ص ۳۰

(ساکنانِ مکہ اور باشندگانِ مدینہ) کا ہے۔ یعنی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ اس کے بعد خطبہ دیا جائے۔ شاہ صاحب بھی اسی طریقِ عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔ رقم فرماتے ہیں:

یکبر فی الاولی سبعاً قبل القرأۃ، والثانیۃ خمساً قبل القرأۃ، و عمل الکوفیین ان یکبر اربعاً کتکبیر الجنائز فی الاولی قبل القرأۃ، و فی الثانیۃ بعدھا وھما سنتان، وعمل الحرمین ارجح، ثم یخطب یامر بتقوی اللہ و یعظ و یذکر۔[۲۴]

پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری میں قرأت سے پہلے پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ (یہ عمل اہلِ حرمین کا ہے) لیکن اہلِ کوفہ کا عمل یہ ہے کہ تکبیراتِ جنازہ کی طرح پہلی رکعت میں قرأت سے قبل چار تکبیریں کہی جائیں اور دوسری میں قرأت کے بعد کہی جائیں۔ اگرچہ یہ دونوں طریقے مسنون ہیں، لیکن اہلِ حرمین کا عمل زیادہ راجح اور قابلِ حجت ہے۔ اس کے بعد خطیب خطبہ دے، اللہ سے تقوی اختیار کرنے کا حکم دے اور وعظ و نصیحت کرے۔

۷۔ فقہائے حنفیہ اور فقہائے شافعیہ میں اس مسئلے سے متعلق بڑا اختلاف ہے کہ "ماءِ کثیر" کیا ہے اور پانی کتنی مقدار میں ہو تو نجس ہو جاتا ہے، اور کتنی مقدار میں ہو تو نجاست سے آلودہ نہیں ہوتا۔ شوافع کا مسلک اس ضمن میں یہ ہے کہ پانی قلتین ہو تو نجاست سے محفوظ رہتا ہے اور احناف "عشر فی العشر" یعنی "دہ در دہ" کی مقدار میں پائے جانے والے پانی کو نجاست کی آلودگی سے مبرا گردانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کنوئیں میں کتا، بلی، چوہا وغیرہ مر جائے تو احناف کے نزدیک پانی کے ڈولوں کی ایک خاص تعداد مقرر ہے جن کا کنوئیں سے نکالنا واجب ہے، اگر اس تعداد میں ڈول نہ نکالے جائیں تو پانی نجس ہی رہتا ہے۔ شاہ ولی اللہ بھی حجۃ اللہ البالغہ میں اس مسئلے پر بحث کرتے

۲۴؎ حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۳۱

ہیں اور فرماتے ہیں کہ کنوئیں میں جانوروں کے مرنے سے پانی کی نجاست و طہارت کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی جاتی ہیں، ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ اقدس یا حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بحث کو فقہا نے خواہ مخواہ طول دیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

وقد اطال القوم فی فروع موت الحیوان فی البئر، والعشر فی العشر، والماء الجاری ولیس فی کل ذلک حدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم البتۃ[۲۵]

کنوئیں میں مختلف قسم کے حیوانات (کتا، بلی، چوہا وغیرہ) کے مرنے اور دہ در دہ اور ماء جاری کے متعلق مسائل میں فقہا نے طویل بحثیں کی ہیں، لیکن ان میں سے کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ علیہ وسلم کی قطعاً کوئی حدیث نہیں ہے۔

اس سے آگے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

وبالجملۃ فلیس فی ھذا الباب شئ یعتد بہ ویجب العمل علیہ وحدیث القلتین اثبت من ذلک کلہ بغیر شبھۃ[۲۶]

بات یہ ہے کہ ان مسائل کے سلسلے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے قابلِ اعتماد اور واجب العمل گردانا جائے۔ البتہ قلتین والی حدیث بلاشبہ زیادہ ثابت اور صحیح ہے۔

بہرحال شاہ صاحب کی تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہر مسئلے میں کتاب وسنت کو پیش نگاہ رکھتے ہیں، خود بھی اسی پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین فرماتے ہیں۔ اگر کوئی بات کتاب وسنت میں موجود نہ ہو، تو ائمہ کرام میں سے جس کے قول کو سنت سے اوفق یا اقرب پاتے ہیں، اس کو اپنے

---

[۲۵] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۸۵

[۲۶] ایضاً

لیے قابلِ عمل قرار دے لیتے ہیں اور ہر ایک کو اسی کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ حق کو کسی ایک ہی امام یا مجتہد کے قول و عمل میں منحصر نہیں سمجھتے۔

احناف اور غیر احناف کے درمیان جن مابہ الامتیاز مسائل میں زیادہ قوی دلائل کی بنا پر شاہ صاحب احناف سے اظہارِ اختلاف فرماتے ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں :

آپ (شاہ صاحب) نے دیگر ائمہ کے بعض اقوال کو از روئے ادلّہ، زیادہ قوی سمجھ کر اختیار بھی فرمایا ہے، اور یہ ذکر، نادر قسم کے مسائل ہی کا نہیں ہے بلکہ جن مسائل کو آج کل حنفیوں اور غیر حنفیوں میں مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے بعض ایسے مسائل میں بھی شاہ صاحب نے کسی دوسرے امام کے قول کو قوتِ دلائل کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ مثلاً قلتین، رفع یدین، الترجیع فی الأذان والایتار فی الاقامۃ اقامۃ الجمعۃ فی القری التی فیھا اربعون رجلاً حرًا وغیرہ وغیرہ [۲۷]

ان الفاظ کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں :

میرا خیال ہے کہ اگر آج کوئی فاضل دیانت داری سے اس روش پہ چلے اور شاہ صاحب ہی کی طرح اس کو "حنفیت" کے مناقض نہ سمجھتا ہو، بلکہ اس کو بھی حنفیت ہی کا ایک طریقہ سمجھتا ہو، اور اسی بنا پر اپنا رشتہ حنفیت سے بھی رکھنا چاہتا ہو تو ہمارے زمانے کے ٹکسالی قسم کے حنفی حضرات کبھی بھی اس کو حنفی تسلیم نہیں کریں گے [۲۸]

بلاشبہ شاہ صاحب اور ان کے رفقائے کرام عقائد، اصول اور فروعی مسائل میں تقلید و جمود کے حامی نہیں۔ ان کا اپنا مکتبِ فکر یہ ہے (اور اسی کو وہ تمام لوگوں میں رائج کرنا چاہتے تھے) کہ کسی پابندی اور تقید کے بغیر

---

[۲۷] الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۴۰۱

[۲۸] ایضاً

مذاہب اربعہ اور ائمہ حدیث سے منقول مسائل پر، عمل کا قصرِ رفیع تعمیر کیا جائے بہ ظاہر حنفی ہونے کے باوجود وہ اصحاب الحدیث اور شوافع کے معمولات و رجحانات کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ شاہ صاحب نے فقہی اعتبار سے مسائل حنفیہ پر کثرت سے عمل کا سلسلہ ہندوستان میں دیکھا، لیکن جب وہ حجاز تشریف لے گئے تو وہاں انھیں فقہائے شافعیہ کی بہت بڑی تعداد سے میل جول کے مواقع میسر آئے، یہ حضرات مسائل فقہیہ میں عملِ حجاز اور حدیث رسول اکرم کو مقدم گردانتے تھے، شاہ صاحب چوں کہ فکری لحاظ سے بلند مرتبے پر فائز تھے، لہٰذا انھوں نے ان دونوں عظیم مکاتبِ فکر میں اتحاد کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا، اور اپنی تصانیف میں جابجا یہی طرزِ عمل اختیار فرمایا۔ ان کے اندازِ بیان اور اسلوب تحریر سے صاف پتا چلتا ہے کہ فقہی مسائل و افکار میں وہ اہل علم کے اذہان کو تقلید کی جکڑبندیوں سے آزاد دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ اصحابِ فکر و نظر کو سخت لب و لہجے میں فرماتے ہیں:

خضتم فی الخوض فی استحسانات الفقهاء من قبلکم و تفریعاتهم۔ اما تعرفون ان الحکم ما حکمه الله و رسوله، و رب انسان منکم یبلغه حدیث من احادیث نبیکم فلا یعمل به، ویقول انما عملی علی مذهب فلان لا علی الحدیث ثم اختال بانّ فهم الحدیث و القضاء به من شان الکمل المهرة و ان الائمة لم یکونوا ممن یخفیٰ علیهم هذا الحدیث فما ترکوه الا لوجه ظهر لهم فی الدین من نسخ و مرجوحیة[۲۹]

تم نے پوری طرح اپنے سے پہلے کے فقہا کے استحسانات اور تفریعات کی طرف توجہ

---

[۲۹] تفہیماتِ الٰہیہ ج ۱ ص ۲۸۳

مرکوز کر رکھی ہے ۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ درحقیقت حکم تو صرف اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے ۔ تم میں سے بہت سے لوگوں کو آنحضرت کی حدیث پہنچ جاتی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم تو فلاں امام کے مذہب کے پابند ہیں، حدیث کے نہیں ۔ وہ اپنے دل میں یہ خیال جمائے بیٹھے ہیں کہ حدیث کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ماہرین اور اصحابِ کمال کا شیوہ ہے ، اور ائمہ کرام سے کوئی بات مخفی نہ تھی ۔ ان کو اس حدیث کا ضرور علم ہوگا ، انھوں نے اس کو چھوڑ دیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اس کی وجہ یا تو اس کا نسخ ہوگا یا مرجوحیت ہوگی، ورنہ وہ ضرور اس پر عمل کرتے ۔

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ان حضرات سے سخت ذہنی اور فکری کوفت محسوس کرتے ہیں، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کو ترک کر کے محض بربنائے تقلید اپنے ائمہ عظام کے ارشادات کو مرکزِ عمل قرار دے رکھا ہے ۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود شاہ صاحب حنفی تھے ۔ مگر ان کی حنفیت کا مطلب جامد تقلید نہ تھا ۔ وہ ہر چیز کو کتاب وسنت کی میزان میں رکھتے تھے اور اسی بات پر عمل کرتے تھے، جو کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہوتی ۔ کسی خاص امام کے قول کے مقابلے میں کتاب وسنت کے صریح احکام کا ترک ان کے نزدیک انتہائی مذموم اور قابلِ نفرت ہے ۔

وہ ان معنوں میں اہلِ حدیث بھی نہ تھے ، جو بعض حضرات کے نزدیک مشہور ومتعارف ہیں ۔ ان کا نقطۂ فکر یہ تھا کہ جو بات کسی فقہی مسلک میں قرآن اور حدیث کی نصِ صریح سے ثابت ہے ، یا اس بنیادی ماخذ سے مطابقت رکھتی ہے ، اس کو معمول بہا ٹھہرایا جائے ۔ اس سلسلے میں ان کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے ، جو مندرجہ ذیل ہے :

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی بارھویں صدی ہجری کے نامور عالم تھے ۔ ان کے

حالات گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں، وہ ۱۱۲۰ھ میں صوبہ یوپی کے شہر الٰہ آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ کو برہان پور میں وفات پائی۔ شیخ محمد ممدوح غالباً جب پہلی مرتبہ دہلی تشریف لائے تو انھیں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، وہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں نماز پڑھی تو آمین بالجہر پکاری۔ وہاں کے لوگوں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی، اور وہ شیخ کے مرتبۂ علم و فضل سے بھی واقف نہ تھے۔ نماز میں آمین بالجہر کی آواز سنی تو سخت حیران ہوئے۔ نماز کے بعد شیخ کو گھیر لیا اور مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے شیخ نے ہر چند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا حوالہ دے کر انھیں اپنی بات سمجھانے اور مطابقِ سنت ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر کسی نے ایک نہ مانی۔ اور بدستور ان سے بحث کرتے رہے۔ آخر شیخ نے فرمایا کہ میری بات تم نہیں مانتے تو مجھے اپنے شہر کے کسی عالم کے پاس لے چلو، ان سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ وہ لوگ آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ کے پاس لے گئے اور ساری بات ان کے گوش گزار کی۔ شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے آمین بالجہر پکارنا ثابت ہے۔ شاہ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر لوگ چلے گئے اور بھیڑ چھٹ گئی۔ شیخ محمد فاخر اور شاہ ولی اللہ دونوں رہ گئے تو موقع پاکر شیخ محمد فاخر نے شاہ صاحب سے کہا۔ "آپ کھلتے کیوں نہیں؟" شاہ صاحب نے جواب دیا۔ "اگر کھل جاتا تو آج آپ کو کیسے بچاتا؟"

اس قسم کے واقعات سے صاف پتا چلتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کو معروف معنوں میں حنفی کہنا یا اہلِ حدیث کے زمرے میں داخل کرنا محض کھینچا تانی اور ان کے ساتھ زیادتی ہے۔

علمِ تصوف

شاہ ولی اللہ صاحب بحرِ تصوف کے شناور اور اس کی تمام اداؤں سے بہ درجہ نہایت آشنا تھے۔ اس کی چند وجوہ ہیں:

۱- ان کے دَور میں تصوّف کا عام چرچا تھا اور اہلِ علم میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

۲- شاہ صاحب کے اسلاف اس علم سے گہری وابستگی رکھتے تھے، ان کے خاندان کے دیگر اہلِ علم کو بھی اس سے لگاؤ تھا۔ شاہ صاحب کے اخلاف کو بھی اس سے دلچسپی قائم رہی۔

۳- انہی اہلِ علم کی بات کو زیادہ لائق اعتنا سمجھا جاتا تھا، جو تصوف سے راہ و رسم رکھتے تھے۔ اب بھی عام طور پر یہی حال ہے۔

۴- ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی جو اس دَور میں بھی ہے اور اسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے متعدد علوم و فنون میں تصوف کی چھاپ موجود ہے۔ مثلاً ان کے ادب میں تصوف کے اثرات پائے جاتے ہیں، ان کی شعر و شاعری کو اس نے بہت متاثر کیا ہے، فلسفۂ اسلام کی توضیح و تبیین میں اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، مذہب میں اس کا باقاعدہ عمل دخل ہے، اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے اسلوب میں اس سے مدد لی جاتی ہے، مسلمانوں کی ثقافت کا یہ ایک اہم جز بن گیا ہے اور ان کے رسم و رواج تک میں اس کی جڑیں پیوست ہو گئی ہیں۔ لہٰذا شاہ صاحب کا اس سے اثر پذیر ہونا اور اس کے مختلف گوشوں سے واقفیت حاصل کرنا وقت کا ضروری تقاضا تھا۔

شاہ صاحب نے اس علم کو مرکزِ التفات ٹھہرایا اور پھر اس میں اس درجے رسوخ حاصل کیا اور گہرائی کو پہنچے کہ اسے بطورِ مثال پیش کیا جاتا ہے۔

تصوف کو مسلمانوں کے لٹریچر کے ایک لازمی جز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، اگر کوئی شخص اس سے عدمِ اعتنا کرتا ہے تو اسے یہ سوچنا پڑے گا کہ اس طرزِ عمل سے مسلمانوں کے بہت سے اجزائے علم متاثر ہوں گے اور ان امور سے تہی دامن ہونے کے خطرات ابھریں گے، جو ہمارے متعدد علوم میں پوری

طرح رچ بس گئے ہیں۔

علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر و بصر سے اوجھل نہیں کیا جا سکتا کہ صحیح تصوف سے قلب میں اخلاص کے جذبات ابھرتے اور روح میں احسان کے داعیے کروٹ لیتے ہیں۔ اخلاق کا پاکیزہ عاطفہ جنم لیتا اور کردار کی نئی دنیا عالمِ وجود میں آتی ہے۔ زبان آشنائے عذوبت اور گفتار ہم آہنگِ لطافت ہوتی ہے۔

بہرکیف تصوّف کے کچھ اثرات مثبت اسلوب میں ظاہر ہوتے ہیں اور کچھ منفی انداز میں۔ مثبت اسلوب یہ ہے کہ صحت مندانہ تصوف سے، بہ الفاظ واضح اس تصوّف سے جسے کتاب و سنت کی روشنی میں اختیار کیا جائے، انسان کے دل میں ترحم، تلطف، دوسرے کی ہمدردی، ایثار، خدمت گزاری، خدا ترسی اللہ کا خوف، ابنائے جنس سے محبت، مخلوقِ خدا سے مودت، تقویٰ الٰہی، فرائض شرعی کی تکمیل، اصلاحِ نفس، بڑے کی تکریم اور چھوٹے پر شفقت وغیرہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ منفی انداز یہ ہے کہ غلظتِ قلب، انتقامی جذبات، حسد و کدورت، خواہشاتِ نفس، عداوت و دشمنی، ہوا و ہوس، غیظ و غضب اور دیگر برائیوں کا تصوّف سے خاتمہ ہوتا ہے۔

یہی وہ تصوّف ہے جس کو اپنانے سے انسان نیکی اور صالحیت کا پیکر بن جاتا ہے، اور یہی وہ تصوّف ہے جو عین اسلام ہے، اور شاہ صاحب اپنے مخاطبین کو اسی تصوّف کی تلقین اور تبلیغ فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ "تصوف" کی جو بھی قسم اور شکل ہے، سب خلافِ شریعت اور کتاب و سنت کے منافی ہے۔

اصحابِ تصوّف کے اس طرزِ عمل سے جو شرعی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہے، شاہ صاحب خوب آگاہ تھے۔ وہ اس کی سخت الفاظ میں تردید کرتے ہیں اور جو بدعات ان صوفیا نے مسلمانوں میں رائج کر دی تھیں، ان سے بچنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ چنانچہ وصیت نامہ میں اپنی تیسری وصیت میں کہتے ہیں کہ اس

زمانے کے جو مشائخ کئی قسم کی بدعات میں مبتلا ہیں، اور اپنی کرامتوں کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں، ان کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے اور کبھی ان کے حلقۂ بیعت میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب اس قسم کے لوگوں کو "دغاباز" اور "کرامات فروشانِ این زمانہ" قرار دیتے ہیں۔

شاہ صاحب بلاشبہ صوفی اور اہلِ سلوک میں سے تھے، لیکن تصوّف و طریقت کے کسی ایک ہی خاص سلسلے کے پابند نہ تھے، جس صاحبِ فیض کو احکامِ شریعت کا منبع سمجھتے، اس سے فیض حاصل کرتے۔ یعنی جس طرح وہ فقہ کے مذاہبِ اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کے مقلد نہ تھے، اسی طرح اہلِ سلوک کے سلسلوں میں سے بھی کسی ایک ہی سلسلے سے وابستگی نہ رکھتے تھے بلکہ تمام مذاہبِ فقہ اور سلاسلِ تصوّف میں سے جس کی جو بات قرآن و حدیث کے زیادہ مطابق اور انسان کی دینی اور روحانی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ فائدہ مند سمجھتے، اس کو اختیار فرما لیتے۔

شاہ صاحب نے علمِ تصوّف کے بارے میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں قول الجمیل، الطاف القدس، خیر کثیر، انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، سطعات، ہمعات، لمعات قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں تفہیماتِ الٰہیہ کا اکثر حصہ مسائل تصوف سے متعلق ہے۔ انفاس العارفین میں بھی تصوّف کے بہت سے مباحث آ گئے ہیں۔ ان کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے بیشتر مسائل نہایت مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ ان کا سمجھنا بھی ہر صاحبِ علم کے بس کا روگ نہیں۔ ان میں بعض ایسی چیزیں بھی آ گئی ہیں جن کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں ایک سے زائد رائیں ہو سکتی ہیں اور شرعی نقطۂ نظر سے ان میں بہرحال اختلاف یا اتفاق کی گنجائش موجود ہے۔

اقتصادی، معاشی اور اصلاحی نظریات

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب

ابتغاء الرزق، باب سیاسۃ المدینہ، باب الرسوم السائرۃ بین الناس، باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم وغیرہ میں معاشرتی اصلاح کے کچھ اصول بیان کیے ہیں، جو مذہبیات، تجارت، اقتصادیات، سیاسیات، نظامِ حکومت، آجر اور کاشت کار کے حقوق اور بعض دیگر معاملات میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:

● ۔ جو معاشرہ کسی کی محنت اور جدوجہد کا قدردان نہیں، اور اس کی مناسب اجرت ادا نہیں کرتا، آجر اور مزارع پر ناقابلِ برداشت محصولات عائد کرتا ہے، وہ قوم کا دشمن ہے، اسے ختم ہو جانا چاہیے۔

● ۔ عیاشی کے مرکز اور جوئے اور قماربازی کے اڈے وغیرہ یک قلم بند کر دیے جائیں۔ اگر یہ باقی رہیں گے تو دولت کی تقسیم کا صحت مندانہ نظام قائم نہیں ہو سکے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دولت زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں جانے اور صحیح خطوط پر گردش کرنے کے بجائے چند محدود افراد کے قبضے میں چلی جائے گی۔

● ۔ پیداوار اور آمدنی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ایک دوسرے سے تعاون کرے۔ اگر اس میں تعاون کا اصول کارفرما نہیں ہوگا تو معاشرتی خرابیاں پیدا ہوں گی۔

● ۔ مزدور اور کاشت کار کی حیثیت قوتِ کاسبہ کی ہے، اور دولت کا حصول محنت اور باہمی تعاون کا متقاضی ہے۔ کیوں کہ شہریت اور مدنیت کی اصل روح یہی ہے۔ جو شخص ملک اور قوم کی خدمت کے لیے تگ و دو نہیں کرتا، وہ ملکی دولت میں حصے دار بننے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

● ۔ دولت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اجرت اور زراعت کے ذریعے یا دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک و قوم کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ان کی خوش حالی اور ارتقا ملک و قوم کی خوش حالی اور ارتقا کے مترادف ہے۔ جو معاشرتی نظام ان قوتوں کو کمزور کرنے کے درپے ہے، اس کو قائم نہیں رہنا چاہیے۔

• - آجر کے اوقاتِ کار کی تعیین اور تحدید ضروری ہے، اس کو اتنا وقت بہرحال ملنا چاہیے جس میں وہ اپنی اخلاقی اصلاح اور روحانی پاکیزگی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکے، اور اپنی ان صلاحیتوں کا جائزہ لے سکے جو اللہ نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔

• - تجارت، باہمی تعاون کا عظیم ذریعہ ہے، اس لیے تجارت کو اسی بنیادی اصول کے مطابق جاری رہنا چاہیے۔ نہ تاجر پیشہ طبقے کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ غلط طریقِ کار اختیار کر کے چیزوں کی قیمتیں بڑھائے اور نہ حکومت کے لیے مناسب ہے کہ وہ بھاری بھرکم محصول عاید کر کے تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے۔ یہ چیزیں ترقی اور باہمی تعاون کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتی ہیں۔

• - زمین کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے، ملک کے باشندوں کی حیثیت فقط اتنی ہے، جتنی کہ مسافر خانے میں قیام کرنے والے کسی مسافر کی ہو سکتی ہے

• - تمام انسان بحیثیت انسان کے یکساں ہیں۔ کوئی شخص مالک الملک یا ملک الناس یا مالکِ قوم نہیں کہلا سکتا۔ کوئی اپنے آپ کو انسانوں کا مالک نہ سمجھے۔ کوئی شخص کسی بڑے سے بڑے آدمی کے لیے بھی اس قسم کے الفاظ استعمال نہ کرے۔

• - ریاست کے امیر یا سربراہ کی حیثیت کسی وقف کے متولّی کی سی ہے وقف کا متولّی اگر ضرورت مند ہو تو اس میں سے اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ جس سے ملک کے ایک عام شخص کی طرح زندگی بسر کر سکے۔

شاہ صاحب نے اپنی مشہور تصنیف البدور البازغہ کے بعض مباحث اور حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف ابواب میں انسان کے بنیادی حقوق کی بھی وضاحت فرمائی ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے۔

• - رہائش کے لیے مکان، کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کے لیے کپڑا، اور

اتنی استطاعت کہ نکاح وازدواج کا سلسلہ قائم ہو سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت ہو سکے، یہ وہ ضروریات ہیں جن کے حصول کا مذہب اور نسل کی تفریق کے بغیر ہر شخص کو استحقاق ہے۔

- بلا امتیازِ مذہب و نسل اور بلا تفاوتِ رنگ و لون ملک کے تمام لوگوں میں عدل و انصاف، مال و جان کا تحفظ، عزت و ناموس کی حفاظت اور شہری حقوق میں یکسانیت سب کا بنیادی حق ہے۔
- اپنی زبان اور تہذیب و ثقافت کو محفوظ اور زندہ رکھنا ہر فرقے اور جماعت کا حق ہے۔

مذہبی معاملات میں شاہ صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تمام فرقوں میں سچائی کے اصول اور صداقت کے بنیادی تقاضے مسلّمہ ہیں۔ مثلاً سب لوگ اللہ کی عبادت کو ضروری قرار دیتے ہیں، صدقات و خیرات کو لازمی چیز سمجھتے ہیں، اور روزے کے قائل ہیں، البتہ عبادت کے طریقے اور شکلیں مختلف ہیں۔ کسی کو پریشان کرنا، قتل و غارت پر آمادہ ہونا، بے حیائی پر اُتر آنا، معصیت کا ارتکاب کرنا اور بُرائی پھیلانا یا کسی کو غلط باتوں کی ترغیب دینا، سب کے نزدیک معیوب اور مذموم ہے۔ ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں۔

بہر حال شاہ صاحب نے معاشرتی اصلاح کے جو اصول اور نظریات بیان کیے ہیں وہ نہایت شاندار ہیں، ان سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اپنی مختلف تصانیف کے متعدد ابواب میں موقع و محل کی مناسبت سے انھوں نے انتہائی صفائی کے ساتھ ایسی باتیں تحریر فرمائی ہیں جو ہر دور میں ہر شخص کے لیے قابل قبول ہیں اور آسانی سے ذہن و فکر میں اترتی جاتی ہیں۔

اقتصادی اور معاشی نظریات کی بھی انھوں نے تفصیل سے وضاحت کی ہے اور نہایت زوردار الفاظ میں دردناک انداز کے ساتھ ملک کے مختلف طبقوں

کو مخاطب کیا ہے۔ وہ امرائے مملکت کو ان الفاظ سے خطاب فرماتے ہیں:

اے طبقۂ امرا۔ غور سے سنو! کیا تمھیں اللہ کا خوف نہیں، تم دنیا کی عارضی اور فانی لذتوں میں غرق ہو رہے ہو، اور جن لوگوں کی حفاظت کی ذمے داری تم پر عائد کی گئی ہے، ان سے تم نے روگردانی کر لی ہے۔ تاکہ ان کے بعض لوگ بعض لوگوں کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ تمھاری تمام تر ذہنی توانائیاں فقط اس پر خرچ ہو رہی ہیں کہ مختلف قسم کے لذیذ کھانے پکواتے اور عورتوں سے لطف اندوز ہوتے رہو۔ بہترین کپڑوں اور بلند و بالا مکانوں کے سوا تم اور کسی چیز کی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔

سپاہیوں اور فوجیوں میں ان کے عہد میں جو برائیاں پیدا ہوگئی تھیں، ان کی نشان دہی کرتے ہوئے ملک کے اس طبقے کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

تم اپنے اخراجات میں میانہ روی اختیار کرو اور اعتدال کی راہ اپناؤ، اپنے آپ کو صرف اتنی ہی روزی پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ کرو جو تمھیں آخرت کی زندگی کے بہتر نتائج تک پہنچانے کے لیے کافی ہو۔ اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے کم رکھو۔ اس میں سے جو بچ جائے اس سے مسافروں اور مسکینوں کی مدد کرو۔ ناگہانی اور اتفاقی مصیبتوں اور ضرورتوں کے لیے بھی بچا کر رکھا کرو۔

مشائخ کو بالخصوص سخت الفاظ اور ترش لب و لہجے سے خطاب کرتے ہیں فرماتے ہیں:

ہم ایسے لوگوں کو ہرگز پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے جو لوگوں کو محض اس لیے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے ہیں تاکہ ان سے روپے پیسے وصول کریں۔

اس سلسلے میں شاہ صاحب مذکورہ بالا طبقوں کے علاوہ ملک کے عام لوگوں کو بھی خطاب کرتے ہیں اور انھیں نصیحت کے اسلوب میں فرماتے ہیں:

اپنے رہن سہن اور اندازِ زیست میں تکلف سے کام نہ لو۔ اگر ایسا کرو گے تو بالآخر فسق کی حدود میں داخل ہو جاؤ گے۔ اللہ کے نزدیک پسندیدہ چیز یہ ہے کہ اس کے بندے اس کی پیدا کردہ سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اتنا کچھ کمانے کی

سعی کرنا، جس سے تمھاری ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ معاشی طور سے دوسروں پر اس طرح بوجھ نہ بنو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھاؤ، یا ان سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اسی طرح ارباب سلطنت اور اصحاب حکومت پر بھی بوجھ نہ بنو۔ تمھارے لیے مناسب اور بہتر بات یہی ہے کہ خود کما کر کھاؤ، اگر ایسا کرو گے تو خدا تمھیں معاش کی ایسی راہ سجھا دے گا جو تمھاری ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی ہوگی۔

اے ابنائے آدم! اللہ نے جس کو سکونت کے لیے جگہ عنایت کر دی ہو، جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی عطا فرما دیا ہو، جس سے سیراب ہو سکے، اتنا کھانے کو دے دیا ہو جس سے گزر بسر ہو سکے، اتنا کپڑا ہو، جس سے تن بدن کو ڈھانپ سکے، ایسی بیوی اس کے گھر میں ہو، جو رہن سہن کے معاملات میں اس کو مدد دے سکتی ہو، یاد رکھو، پوری دنیا اس شخص کو مل چکی ہے، ضروری ہے کہ ان نعمتوں پر وہ خدا کا شکر ادا کرے۔

اس سے آگے لکھتے ہیں:

انسان کو کمائی کی کوئی نہ کوئی راہ بہرحال اختیار کرنی چاہیے۔ یہ اس کے لیے بہت ضروری ہے۔

شاہ صاحب کا زمانہ چوں کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ ہے، اس لیے انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے باب سیاست المدینہ میں زوال سلطنت کے اسباب پر بھی بحث کی ہے اس کے انھوں نے مختلف اسباب بیان کیے ہیں، جن میں بڑا سبب اقتصادی ہے۔ اس زمانے میں سپاہی، شاعر، زاہد، صوفی اور بعض دیگر لوگ بالکل بے کار ہو کر بیٹھ گئے تھے اور بادشاہ خود ان کو انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ اسی طرح اہل کاروں نے محنت اور سعی و کوشش کو ترک کر دیا تھا۔ حکومت نے کاشت کاروں اور تاجروں سے بھاری محصول لینا شروع کر دیے تھے، اور اس سلسلے میں ان پر سختی کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت کو شدید دھچکا لگا اور حالات روز بروز بگڑتے چلے گئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اس زمانے میں ملک کی خرابی اور ویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں۔ ایک بیت المال یعنی

ملک کے خزانے پر مالی بوجھ، وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی قسم کی محنت کرنے اور مشقت اٹھائے بغیر ملکی خزانے سے اس دعوے کے ساتھ روپیہ حاصل کریں کہ وہ ملک کے سپاہی ہیں یا عالم ہیں، جو اس ملک کے خزانے کی آمدنی میں اپنا حق رکھتے ہیں ——— یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام و اکرام عطا کیا کرتے ہیں، جیسے زہد پیشہ لوگ یا شعرا حضرات، اسی طرح دوسرے طبقوں کے لوگ جو ملک اور سلطنت کا کوئی کام کیے بغیر کوئی نہ کوئی ایسا ذریعہ اختیار کر کے روزی حاصل کرتے ہیں، جس میں ان کو کوئی محنت نہیں کرنا پڑتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ملک کے ذرائع آمدنی کو کم کرتے ہیں اور ملک کے خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

ملک کی اقتصادی حالت کی خرابی کا دوسرا سبب کاشت کاروں، تاجروں اور مختلف پیشے کے لوگوں پر بھاری بھرکم محصول لگانا اور اس سلسلے میں ان پر سختی کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ حکومت کے اطاعت شعار اور اس کے تابع احکام ہیں، وہ تباہ ہو رہے ہیں، اور جو سرکش اور نادہند ہیں وہ اور سرکش ہو رہے ہیں، اور ان کے ذمے حکومت کے جو واجب الادا محصول ہیں، وہ ادا نہیں کرتے، حالاں کہ ملک اور سلطنت کی ترقی اس بات میں مضمر ہے کہ محصول کم ہو، اور فوج اور اہل کاروں کا تقرر ضرورت کے مطابق کیا جائے۔ اس زمانے کے لوگوں کو ہوشیار ہو کر اس راز اور نکتے کو سمجھنا چاہیے۔[۱۳۰]

شاہ صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ فرسودہ نظام بہر حال تباہی سے ہم کنار ہوگا۔ انھیں ملکی فضا میں فَکُّ کُلِّ نِظَامٍ یعنی انقلابِ احوال کی صدائیں بلند ہوتی سنائی دیتی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ معاشی نظام کو صحیح اصولوں کے مطابق ترقی دینا اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنا انسانی معاشرے کے استحکام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں وہ وضاحت سے کہتے ہیں کہ زمین کو درست کرنا، اس کو قابلِ کاشت

۱۳۰؎ حجۃ اللہ البالغۃ باب سیاسۃ المدینۃ ج ۱ ص ۴۵

بنانا، مویشیوں کی افزائشِ نسل کے لیے کوشاں ہونا اور باہمی تعاون سے کام لینا لازمی ہے۔ اس ضمن میں حجۃ اللہ البالغہ میں انھوں نے جو الفاظ تحریر کیے ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

انسانی معاشرے میں معاشی وسائل کو بروئے کار لانے کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ جائز مال کو قبضے میں لایا جائے اور اس کو مناسب اور جائز طریقے سے ترقی دی جائے، جیسے مویشیوں کی افزائشِ نسل، آب پاشی اور زمین کو درست کرکے زراعت کرنا وغیرہ۔ لیکن اس تعاون باہمی سے معاشی وسائل کے حصول کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں ترقی کی طرف قدم زن ہونا ایک دوسرے کی معاشی زندگی کے لیے تکلیف اور تنگی کا سبب نہ بن جائے، جس کا نتیجہ تمدنی فساد کی صورت میں ظاہر ہونے لگے[۳۱]

مال کو بڑھانے اور اقتصادی ذرائع کو ترقی دینے کے مسئلے پر بھی شاہ صاحب نے بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں باہمی تعاون ضروری ہے، جن ذرائع میں باہمی تعاون کا فقدان ہوگا اور ایک دوسرے کی رضامندی مفقود ہوگی، وہ ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہوں گے۔ شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فان کان الاستمناء فیما لیس لہ دخل فی التعاون کالمیسر او بما ھو تراض یشبہ الاقتضاب کالربا فان المفلس یضطر الی التزام مالا یقدر علی ایفائہ ولیس رضاہ رضا فی الحقیقۃ فلیس من العقود المرضیۃ ولا الاسباب الصالحۃ وانما ھو باطل وسحت باصل الحکمۃ المدنیۃ[۳۲]

یعنی اگر مال بڑھانے میں باہمی تعاون کو دخل نہ ہو جیسے جوئے بازی یا ایسی رضامندی

۳۱؎ حجۃ اللہ البالغہ ابواب ابتغاء الرزق، ج ۲ ص ۱۰۳۔

۳۲؎ ایضاً۔

ہو جس میں جبر پایا جاتا ہو، جیسے سود، ایک مفلس آدمی سود مجبوری کی حالت میں ادا کرتا ہے، کیوں کہ وہ درحقیقت اس کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا، اس قسم کے تمام معاملات ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہیں، اور اجتماعی زندگی میں جو اصول کارفرما ہیں، ان کے مطابق یہ معاملات باطل اور حرام قرار پاتے ہیں، ان کا صاف ستھری مدنیت اور صحت مندانہ شہریت سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ صاحب محصولات کی بھرمار، عیاشانہ زندگی، زیورات کی کثرت اور بلند و بالا عمارتوں کو بھی اقتصادی اعتبار سے تباہ کن اور ملک کے مفادِ عامہ کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

وکذلک من مفاسد المدن ان ترغب عظماءهم فی دقائق الحلی واللباس والبناء والمطاعم وعید النساء ونحو ذلک زیادۃ علی ما تعطیه الارتفاقات الضروریۃ التی لابد للناس منها واجتمع علیها عربهم وعجمهم۔

یعنی شہروں کی بربادی اور مدنیت کی (اقتصادی) خرابی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ وہاں کے باشندے عمدہ زیورات، بہترین لباس، شاندار عمارات، لذیذ کھانوں اور عورتوں کے حسن وغیرہ کو اپنے لیے مرغوب اور پسندیدہ چیزیں قرار دے لیں، اور اس طرح وہ ان ارتفاقاتِ ضروریہ یا مفاداتِ عامہ کے حصول میں حد سے تجاوز کرنے لگیں، جو انسان کی ضروریات میں شامل ہیں اور جن پر عرب و عجم کے لوگوں کا بہرحال اتفاق ہے۔

شاہ صاحب بے پناہ بصیرت کے مالک تھے، آج سے دو ڈھائی سو سال پہلے اقتصادیات کے بارے میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس بنیادی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھتے تھے حجۃ اللہ ہی میں لکھتے ہیں:

اگر کسی قوم میں تمدن کا ارتقا خاص تسلسل کے ساتھ جاری رہے تو اس کی صنعت و

صرفت درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے، پھر اگر حکمران طبقہ آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کو زندگی کا شعار بنالے تو اس کا تمام تر بوجھ قوم کے کاری گر طبقے پر پڑے گا اور اتنا بڑھ جائے گا کہ معاشرے کا بہت بڑا حصہ حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور انسانیت کا اجتماعی اخلاق اس وقت تباہ ہو جائے گا۔ جب جبر کے ذریعے سے لوگوں کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح فقط روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔ جب انسانوں پر ایسی سخت مصیبت نازل ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی نجات کے لیے ضرور کوئی راستہ ان کو سجھا دیتا ہے۔ یعنی ضروری ہو جاتا ہے کہ قدرتِ الٰہیہ انقلاب و تغیر کے سامان پیدا کر کے اس غلط حکمران طبقے کا بوجھ قوم کے سر سے اتار دے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے ملکیتِ زمین کے مسئلے کو بھی موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق حقیقت میں ساری زمین سرائے یا مسجد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے انتفاع میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

والارض کلھا فی الحقیقۃ بمنزلۃ مسجد او رباط جعل وقفا علی ابناء السبیل وھم شرکاء فیہ فیقدم الاسبق فالاسبق ومعنی الملک فی حق الآدمی کونہ احق بالانتفاع من غیرہ[۳۳]

زمین درحقیقت سب کی سب مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے جو مسافروں کے لیے وقف کی گئی ہے، اور وہ سب اس میں برابر کے شریک ہیں، تقدم صرف پہلے اور پھر اس سے پہلے کو حاصل ہو گا۔ انسان کے حق میں ملک کا مطلب فقط اتنا ہے کہ وہ دوسرے کی نسبت اس سے انتفاع کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔

---

۳۳ حجۃ اللہ البالغہ، ابواب ابتغاء الرزق ج ۲ ص ۱۰۳۔

سیاسی بصیرت کی چند مثالیں

شاہ ولی اللہ کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی لحاظ سے نہایت پُر آشوب زمانہ تھا۔ پورا ملک بدامنی کی خوف ناک لہروں کی زد میں تھا، ہر طرف بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی، نظم و نسق کی تمام چولیں ڈھیلی پڑ گئیں تھیں، بادشاہ کا احترام لوگوں کے دلوں سے ختم ہو چکا تھا، عسکری نظام تباہ ہو گیا تھا، مغلوں کے ڈیڑھ سو سالہ اقتدار کا ملک گیر سایہ تیزی سے سمٹ رہا تھا، سرکش اور باغی عناصر ہر طرف دندناتے پھرتے تھے، کسی کو انھیں روکنے اور ٹوکنے کی جرأت نہ تھی۔ روہیلے، جاٹ، مرہٹے، سکھ سب ہوسِ ملک گیری میں مبتلا تھے۔ لوٹ مار کا دَور دَورہ اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور مغل بادشاہوں کا تاج ان ہیبت ناک طوفانی موجوں کی لپیٹ میں آکر اپنا روایتی وقار کھو چکا تھا۔

ظاہر ہے یہ حالات نہایت مایوس کن اور ذہنی طور سے بہ درجۂ غایت اذیت ناک تھے۔ لیکن شاہ صاحب نے ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے تاریکیوں میں روشنی تلاش کرنے کی کوشش کی اور ظلمت کے مہیب طوفانوں میں شمع جلانے کا عزم کیا۔ تمام واقعات کا پوری سیاسی بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا، زوالِ سلطنت کے اسباب پر غور کیا، ملک میں بسنے والی سب قوموں کے نقطۂ نظر کا اندازہ لگایا، امرا و سلاطین کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو پرکھا اور پھر اصلاحِ احوال کے لیے کام کا ایک نقشہ تیار کیا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شاہ صاحب کے اسلاف میں سے دو ایک کے سوا (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے) اربابِ حکومت اور اصحابِ اقتدار سے کبھی کسی کو کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود شاہانِ مغلیہ کے ہاں شاہ صاحب کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی، وہ ان سے اس درجہ عقیدت رکھتے تھے کہ ان کے مدرسے میں آتے تھے، اور ان کی مجلس

میں بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے میں شامل ہونے کو اپنے لیے باعث برکت اور موجب سعادت قرار دیتے تھے۔ شاہی محل کی خواتین بعض اہم امور میں ان سے مشورہ کرتیں اور امرا و وزرا ان کی نصیحت آموز باتوں سے مستفید ہونے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

اس مشورت اور حاضری کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاہ صاحب نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، اور مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ، سلطنت و حکومت کے بعض اہم اور پیچیدہ معاملات سے متعلق ان سے رائے لینے اور دعا کی درخواست کرتے تھے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب انتہائی سیاسی بصیرت کے مالک تھے، وہ ملک کی فضا سے واقعات کی رفتار کا پوری طرح اندازہ کر لیتے تھے۔ پھر اس کے اظہار میں جو الفاظ استعمال فرماتے، وہ بڑی احتیاط کے حامل ہوتے، وہ الفاظ کتابوں میں مرقوم ہیں اور بلاشبہ شاہ صاحب کی علمی اور فکری بلند پروازی کا عمدہ ترین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مختلف حضرات کے نام انھوں نے جو مکتوبات تحریر فرمائے، ان میں بھی اس دور کی سیاست اور اس کے بارے میں ان کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت موجود ہے۔

شاہ صاحب کے تلامذۂ کرام میں سے ایک بزرگ شیخ محمد عاشق پھلتی تھے، انھوں نے شاہ صاحب کی زندگی ہی میں "قول الجلی و اسرار الخفی" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو شاہ صاحب کے ملفوظات اور حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی ایسے بہت سے واقعات مندرج ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سیاسیات کے نشیب و فراز پر شاہ صاحب گہری نظر رکھتے تھے۔ یہ کتاب خود شاہ صاحب کے ملاحظۂ گرامی میں بھی آئی تھی، اور ان کی وفات کے بعد حضرتِ مصنف نے اس میں ایک باب کا مزید اضافہ کیا تھا۔ اس کتاب کے حوالے سے ہندوستان کے نامور محقق پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی تصنیف "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" میں شاہ صاحب کے سیاسی افکار

کی وضاحت کی ہے اور بعض اہم واقعات تحریر کیے ہیں۔ ان واقعات میں سے بعض باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ کتاب کی فارسی عبارتوں کا اُردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

۱۔ جب رفیع الدرجات (جو اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد چوتھا مغل بادشاہ تھا) مہلک مرض میں مبتلا ہوا اور اس کی زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی، تو سید عبداللہ خاں قطب الملک کو (جو ساداتِ بارہ میں نہایت اہم شخصیت کے مالک تھے) اس کے جانشین کی فکر ہوئی، خواجہ محمد سلطان اس سلسلے میں مشورے کے لیے شاہ ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، بادشاہ کی اولاد کافی ہے، معلوم نہیں ان میں سے کون تختِ حکومت پر بیٹھے گا۔ شاہ صاحب نے روشن اختر کا نام لیا اور کہا کہ وہ مستقل بادشاہ ہوگا۔ خواجہ محمد سلطان کو اس بشارت سے خوشی ہوئی اور شاہ زادے کو بھی یہ خبر سنادی، لیکن جب رفیع الدرجات کا انتقال ہوا تو سب نے متفقہ طور پر رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ قول الجلی کے مصنف لکھتے ہیں، یہ بات شاہ صاحب کے لیے تشویشِ خاطر کا باعث ہوئی۔ لیکن پھر بھی بشارت کے ظہور کا انتظار رہا۔ آخر چند روز بعد رفیع الدولہ کا انتقال ہوگیا اور شاہ صاحب کی بشارت پوری ہوئی۔ روشن اختر جس کا لقب محمد شاہ ہے تختِ سلطنت پر بیٹھا۔[۳۴]

۲۔ جب سید محمد عبداللہ خاں قطب الملک مذکور نے محمد شاہ کی زندگی میں سلطان ابراہیم کو تختِ دہلی پر بٹھایا اور محمد شاہ سے جنگ کا ارادہ کیا تو خواجہ سلطان محمد پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ اس جنگ میں کون کامیاب ہوگا؟ محمد شاہ یا ابراہیم؟ شاہ صاحب نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمایا:

مجھے اس طرح دکھایا گیا ہے کہ عبداللہ خاں کی تمام فوج منتشر ہوگئی ہے اور اس کا ہاتھی تنہا میدان میں کھڑا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فوج کو شکست

۳۴؎ قول الجلی ص ۶۴

ہوگی اور محمد شاہ فتح یاب ہوگا۔ پھر جب دونوں میں جنگ ہوئی تو وہی ظہور میں آیا جس کی شاہ صاحب نے پیش گوئی فرمائی تھی۔[۳۵]

۳۔ ایک شخص نے شاہ صاحب کی خدمت عرض کیا کہ فلاں مہینے میں سلطنتِ مغلیہ میں انقلاب آجائے گا، آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا، اس وقت تو کوئی چیز معلوم نہیں ہو رہی، جب کچھ معلوم ہوگا، بتا دیا جائے گا۔ دوسرے دن فرمایا۔ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک اونچا دروازہ ہے، جس پر محمد شاہ اور دو اور شخص بیٹھے ہیں۔ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ اتنے میں ایک شخص محمد شاہ کے معزول ہونے کی خبر سناتا ہے اور اس کو ایذا پہنچانا چاہتا ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ اس کو معزول کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی محمد شاہ سے کہتا ہوں کہ یہ شخص تیرا دشمن ہے، اس کو ختم کر دے۔ محمد شاہ کی کمر میں ہتھیار بندھے ہوئے ہیں، لیکن حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ اس شخص سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ شخص بھی محمد شاہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن ڈر محسوس کرتا ہے۔ بالآخر محمد شاہ اس مجلس میں محفوظ رہتا ہے۔" یہ خواب بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں انقلابِ سلطنت ہرگز نہ ہوگا"۔[۳۶]

۴۔ قول الجلی میں دہلی پر نادر شاہ کے حملے کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔ لکھا ہے کہ ایک دن شاہ صاحب نے فرمایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا ایک دریا امنڈا آرہا ہے، اور بڑے بڑے حوادث پیش آنے کے آثار نظر آرہے ہیں۔ پھر جو کچھ فرمایا، اس کا ترجمہ یہ ہے:

آباد بستیاں تباہ اور برباد ہو جائیں گی اور ایسی آفت آئے گی کہ ارکانِ سلطنت

۳۵۔ قول الجلی ص ۶۵

۳۶۔ ایضاً ص ۸۳

اس کا علاج نہ کر سکیں گے . . . اور ایسا بھی نظر آتا ہے کہ دہلی شہر جو ملک کا دارالسلطنت ہے، زیادہ تر وہی آفات کی زد میں ہے[۳۷]

۱۱۴۸ھ کے سال کا آغاز ہوا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان مصائب کا وقت قریب آ گیا ہے، جن سے آباد شہر ویران اور بستے ہوئے دیہات و قصبات تباہی سے ہم کنار ہو جائیں گے، اور شہر دہلی بالخصوص ان مصائب کا ہدف بنے گا چنانچہ اس زمانے میں اتنی بارش ہوئی کہ مضبوط تر محل (قصور مشیدہ) گر گئے اور ملک کی بہت بڑی آبادی مصیبتوں کے خوف ناک ریلے میں آگئی۔ اسی زمانے میں "غنیم دکھنی" (مرہٹوں) نے حملہ کیا اور شاہی عساکر کی موجودگی کے باوجود وہ دہلی کے قریب پہنچ گیا اور اس کو تباہ کرنے کا عزم کیا۔

دریا کے کنارے سخت مقابلہ ہوا، کثیر تعداد میں لوگ مارے گئے۔ بہت بڑی جنگ اور تباہی کے بعد اس مصیبت سے نجات حاصل ہوئی۔ اس کے بعد شاہ صاحب کے بعض عقیدت مندوں نے دریافت کیا کہ جس مصیبت کا خطرہ تھا، کیا وہ گزر گئی؟ فرمایا، نہیں، وہ تو آنے والی ہے۔

انھی دنوں کا واقعہ ہے کہ شاہ نور اللہ، دہلی کے شاہی بازار "سوق سلطانی" میں کچھ چیزیں خریدنے کے لیے گئے۔ واپس آئے تو شاہ صاحب نے پوچھا:

حالِ اہلِ بازار چگونہ دیدید؟

بازار کے لوگوں کو کس حال میں دیکھا؟

انھوں نے جواب دیا کہ ابھی تک تو محفوظ ہیں لیکن سب پر وحشت سی چھائی ہوئی ہے ــــ یہ سن کر شاہ صاحب نے کہا:

ایں بازارہا بلسانِ حال می گویند کہ دریں جا جوہائے خون رواں شوند[۳۸]

---

[۳۷] قول الجلی ص ۹۰۔

[۳۸] ایضاً، ص ۹۱

یہ بازار زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ یہاں خون کے دریا رواں ہوں گے۔

اگرچہ اس وقت بہ ظاہر کوئی خاص خطرہ نظر نہ آتا تھا لیکن شاہ صاحب کے ان الفاظ سے لوگوں میں اضطراب اور بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس سے تقریباً ایک سال بعد دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا۔

نادر شاہ کا حملہ اہلِ دہلی کے لیے نہایت الم ناک فتنہ تھا، جس سے تباہی اور بربادی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ "قول الجلی" کے بیان کے مطابق نادر شاہ "ہزاراں ہزار" افراد کے سفاک ہجوم کے ساتھ ملک کے شہروں اور قصبوں کو روندتا ہوا کرنال پہنچا اور محمد شاہ اس کے مقابلے میں آیا۔ اس زمانے میں کچھ لوگوں نے شاہ صاحب کو خطوط لکھے اور دریافت کیا کہ اب کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا کہ بہت بڑی مصیبت آئے گی، لیکن محمد شاہ بہ دستور اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔

اس لڑائی میں محمد شاہ کے ۵۲ ہاتھی مارے گئے اور لشکر کا خاصا بڑا حصّہ تباہ ہوگیا۔ جو لوگ باقی بچے ان پر اتنا رعب چھا گیا کہ اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" میں "قول الجلی" کی یہ عبارت درج ہے:

و باقی ماندگان را عساکرِ قزلباش محصور ساختند، دریں میاں عالمی از گرسنگی جان بداد، و سلطان و وزیر ہر دو اسیر شدند[۳۹]

یعنی جو باقی بچے ان کو عساکرِ قزلباش (افغانوں) نے گھیرے میں لے لیا، ان دنوں بہت سے لوگوں نے بھوک کی شدت سے جان دے دی۔ بادشاہ اور وزیر دونوں پکڑ لیے گئے۔

وہاں سے چل کر نادر شاہ دہلی میں داخل ہوا، اور تیسرے دن اس نے قتلِ عام کا حکم دیا۔ صبح سے لے کر تین گھڑی دن گزرے تک اس کے تیس ہزار سواروں نے

۳۹؎ قول الجلی ص ۹۲

قتل وغارت کا بازار گرم کیے رکھا۔ شیخ محمد عاشق پھلتی افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں :

ہر جان داری کہ یافتند از انسان وحیوان ہمہ را بہ تیغ کشیدند تا سگ وگربہ را ہمدراں میاں نگزاشتند وشہر را آتش دادہ بازارہا را و کوشکہا را بسوختند۔۔۔ از کشتگان پشتہ ہا برپا شدند، و در بازارہا خصوصاً در سوق سلطانی کہ بہ چاندنی چوک مشہور است جوہائے خون رواں گردید[۴۰]

(نادر شاہ کے فوجی) جس جان دار کو پاتے، وہ انسان ہوتا یا حیوان اسے قتل کر دیتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کتّوں اور بلّیوں کو بھی نہ چھوڑا، شہر کے بازاروں اور مکانوں کو آگ لگا دی، اور مقتولوں کے ڈھیر لگ گئے۔ سوقِ سلطانی میں جو چاندنی چوک کے نام سے مشہور ہے، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔

شہر دہلی کی حالت اس زمانے میں انتہائی ابتر تھی۔ نہ اس میں کوئی داخل ہو سکتا نہ اس سے باہر جا سکتا تھا۔ نہ کھانے کی کوئی چیز میسّر تھی نہ عام استعمال کے لیے کچھ حاصل ہوتا تھا۔ ہزاروں آدمی بھوک سے بے تاب ہو کر مر گئے تھے۔ گلی کوچے لاشوں سے اٹے پڑے تھے، ان کو دفن کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کی عفونت سے بے شمار لوگ دم توڑ گئے تھے۔ ملکی حالات اس قدر بگڑ گئے تھے کہ مغل حکومت کے باقی رہنے کا بھی کسی کو یقین نہ تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ نادر شاہ دہلی کو لوٹ کر تمام نئے اور پرانے خزانے اپنے ساتھ لے گیا۔ شاہ صاحب نے اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ محمد شاہ بہ حیثیت بادشاہ کے موجود رہے گا، وہ پوری ہوئی۔

اس ہنگامہ خیز اور الم ناک دور میں شاہ صاحب کے بہت سے عقیدت مندوں نے ان کو خطوط لکھے اور دعا کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے سب کو تسلی دی، اور لکھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، تمام متعلقین محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی

---

۴۰ قول الجلی، ص ۹۳

ہوا۔ ان کے سب متعلقین و معتقدین بھی محفوظ رہے اور ان کا محلہ بھی اللہ کے فضل سے محفوظ رہا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر جو مسلسل حملے کیے، ان کا ذکر "القول الجلی" میں شیخ محمد عاشق پھلتی نے متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ان حملوں کے ملک کی سیاسی فضا پر جو اثرات مرتب ہوئے اور جو نتائج نکلے، ان کی نشان دہی بھی کی ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" کے مقدمے میں اسے خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

دہلی میں اس سے جو اضطراب پھیلا اور بے چینی پیدا ہوئی، قول الجلی کے حوالے سے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً شاہ صاحب کے حلقۂ تعلقات کے بعض بزرگوں ـــ خواجہ حبیب اللہ کشمیری اور عمر خاں قصوری ـــ نے ان سے پوچھا کہ اس دورِ پُر آشوب میں ہم اپنا مال و اسباب کہاں منتقل کریں اور اپنی حفاظت کے لیے کیا قدم اٹھائیں؟ شاہ صاحب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:

ما و ہمہ مخلصانِ ما بلکہ تمام اہلِ شہر دریں شور و فتنہ انشاء اللہ محفوظ خواہیم ماند و خدائے تعالیٰ لطیفہ خواہد پیدا کرد کہ امن از جمیع وجوہ ظہور خواہد آمد[۱۴]

ہم اور ہمارے مخلصین بلکہ تمام باشندگانِ دہلی اس فتنے میں محفوظ رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ایسی صورت ظاہر فرما دے گا کہ امن کی فضا پیدا ہو جائے گی۔

شیخ محمد عاشق پھلتی لکھتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور باشندگانِ دہلی محفوظ رہے۔

یہ انتہائی فتنہ خیز دور تھا، ہر طرف ہنگامے بپا تھے اور ملک کی حالت نہایت خراب ہو گئی تھی۔ مرہٹوں نے بالخصوص بہت طاقت پیدا کر لی تھی اور وہ سلطنتِ مغلیہ کے لیے زبردست مصیبت بن گئے تھے۔ ان کی طاقت کو

---

[۱۴] قول الجلی، ص ۶۰

پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی نے ختم کیا۔ احمد شاہ ابدالی یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت کے میدان میں پہنچا، اس سے دو روز پہلے ۲۹ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو مرہٹہ جرنیل سداشیو راؤ بھاؤ پانی پت کے میدان میں اپنی فوجیں اتار چکا تھا۔ ابدالی کی افغان فوجوں اور مرہٹوں کے درمیان ڈھائی مہینے تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا بالآخر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی نے شدید جنگ کے بعد مرہٹوں کو شکستِ فاش دی، سداشیو راؤ بھاؤ اور پیشوا کا بیٹا وشواس راؤ میدانِ جنگ میں مارے گئے، اور بقول ایک مورخ کے مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اُڑ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کی اس بہت بڑی طاقت کا جس نے ہندوستان کی مغل حکومت کو انتہائی پریشان کر رکھا تھا، اس جنگ کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود مرہٹوں کے مرکز میں کوئی گھر ایسا نہ تھا، جس میں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو، مرہٹہ لیڈروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکے میں صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی اس دور کے ہندوستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ "پانی پت کا میدانِ کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ کا سجایا ہوا تھا"[۴۲]

شاہ صاحب نے ملک کی سیاسی ابتری کو ہدفِ فکر ٹھہرایا تو اس کی اصلاح کے لیے ان کی نظر دو شخصیتوں پر پڑی۔ ایک ملک سے باہر احمد شاہ ابدالی پر، دوسرے ملک کے اندر نجیب الدولہ پر! احمد شاہ ابدالی اپنی دیگر خوبیوں کے ساتھ اس خوبی کا بھی مالک تھا کہ تمام افغان فوج اس کے زیر کمان تھی، اور نجیب الدولہ میں یہ صفت پائی جاتی تھی کہ روہیلوں کی عسکری طاقت اس کے تابع فرمان تھی۔ اپنے مکتوبات میں شاہ صاحب نجیب الدولہ کو بے حد اہمیت دیتے ہیں اور اسے "رئیس الغزاۃ" اور

۴۲؎ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۴۲

"راس المجاہدین" کے پُرعظمت خطاب سے مخاطب فرماتے ہیں۔

ملک کے انتہائی بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کے لیے ان دو شخصیتوں کا انتخاب شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ روہیلوں کی جنگی صلاحیت اور فوجی قوت سب کے نزدیک مسلمہ تھی۔ ان کا رہنما نجیب الدولہ بھی عظیم سیاسی مدبر، بہادر سپاہی اور دُور اندیش جرنیل تھا۔ شاہ صاحب نے اپنے وقت کی ان دو ممتاز شخصیتوں کو ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لیے متعین کر کے انتہائی حقیقت شناسی کا ثبوت بہم پہنچایا۔

بہرکیف شاہ ولی اللہ صاحب کا ذہن سیاسی لحاظ سے بہت زرخیز تھا۔ انھوں نے اس بات کی کھل کر وضاحت کی ہے کہ ملک کی سیاسی ترقی کا راز پانچ چیزوں میں مضمر ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ملکی خزانے میں کسی موقعے پر بھی کمی واقع نہ ہو۔ خزانہ ہر آن بھرپور رہنا چاہیے، تاکہ افواجِ شاہی اور تمام ملازمینِ سلطنت کی تنخواہیں بروقت ادا ہوتی رہیں، اور حکومت کی مخالفت کا کوئی خطرہ کسی طرف سے باقی نہ رہے۔

۲۔ ملک میں جاگیرداروں کی کثرت نہیں ہونی چاہیے، ان کی تعداد جہاں تک ممکن ہو، کم کر دینی چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی بہت سی جاگیرداریوں کی بنا پر زمین چھوٹے چھوٹے قطعوں کی شکل میں بے شمار حصوں میں بٹ جاتی ہے جاگیر کے رقبے میں اضافے کی وجہ سے مرکزی حکومت کا استحکام متاثر ہوتا ہے، اور وہ جاگیرداروں کے رحم و کرم کی محتاج ہو جاتی ہے۔ جاگیریں جتنی زیادہ ہوں گی اسی قدر حکومت کے نظم و نسق کا ڈھانچہ کمزور ہو گا اور کاشت کار پریشانی میں مبتلا ہوں گے، جس سے ملکی سیاست کے مجروح ہونے کے امکانات اُبھریں گے۔

۳۔ ملک کے تمام گروہوں کو اعتدال میں رکھا جائے۔ کسی گروہ کی کسی معاملے میں اس طرح اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے کہ وہ معاشرے کے کمزور افراد کو مالی یا

ذہنی تکلیفوں میں مبتلا کر دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ملک کے سیاسی حالات مستحکم نہیں رہ سکیں گے۔

۴۔ ملک کی فوج بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کا عظیم فرض فوج ہی سرانجام دیتی ہے۔ اس کی تنخواہیں باقاعدگی کے ساتھ وقت پر ادا کی جائیں۔ اسے کسی قسم کی شکایت نہ پیدا ہونے دی جائے۔

۵۔ خالصہ کا علاقہ محدود نہ رکھا جائے، جہاں تک ہو سکے اسے وسیع کیا جائے۔

"خالصہ" اس علاقے کو کہا جاتا تھا، جو براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا۔ یعنی "خالصہ" سے مراد وہ علاقہ ہے جو مرکزی حکومت کے انتظام یا اختیار میں ہو۔ دورِ بادشاہت میں علاقۂ خالصہ کے محاصل اپنے مقرر کردہ حکام کے ذریعے خود بادشاہ وصول کرتا تھا۔ اس کے برعکس جاگیر کا علاقہ وہ کہلاتا تھا جس کے محاصل جاگیردار وصول کرتے تھے اور جس کا مرکزی حکومت سے براہِ راست کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔

دہلی کے تختِ حکومت پر جتنے بھی بڑے بڑے حکمران متمکن ہوتے ہیں وہ سب اس کوشش میں رہتے تھے کہ خالصہ کے علاقے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے، کیوں کہ اگر خالصہ کا علاقہ زیادہ ہوتا اور اس سے معقول آمدنی ہوتی تو بادشاہ آمدنی کے لحاظ سے صوبائی گورنروں اور علاقائی جاگیرداروں کا محتاج نہیں ہوتا تھا، مرکزی دفاتر اور بادشاہ کے محل کے اخراجات کے لیے جس قدر رقم کی ضرورت ہوتی، وہ برابر اس علاقے سے بادشاہ کو وصول ہوتی رہتی جو براہِ راست بادشاہ کے قبضے میں ہوتا تھا، اور اس علاقے کو "خالصہ" سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اگر کبھی صوبائی حکومتیں یا بعض علاقوں کے جاگیردار بادشاہ سے بغاوت بھی کر دیتے اور محاصل ادا کرنے سے انکار کر دیتے، جب بھی خالصہ کی آمدنی سے مرکزی حکومت

کے اخراجات بلا کسی تکلیف کے پورے ہوتے رہتے تھے۔

ظہیر الدین بابر کے حالات میں کتبِ تاریخ میں مرقوم ہے کہ جب اس نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور اس پر حکومت کرنے لگا تو مختلف حاکموں کو اس نے جاگیریں عطا کیں، لیکن "خالصہ" میں اضافے کا پورا خیال رکھا۔ کہتے ہیں، اس نے بہار کی جاگیر ایک شخص محمد زمان کو دی، لیکن ایک کروڑ پچیس لاکھ کے محاصل کے علاقے کو خالصہ قرار دے دیا۔

شاہ ولی اللہ نے خالصہ کے علاقے میں اضافے پر جو زور دیا اور اسے مرکزی حکومت کے استحکام کا بہت بڑا ذریعہ قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زمانے میں اس میں بہت کمی واقع ہوگئی تھی اور جاگیر داروں کا سلسلہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ صوبۂ دہلی کے دیہات اور بعض دوسرے صوبوں کے گاؤں جو پہلے خالصہ میں شامل تھے، اور جن سے بادشاہ کے مرکزی دفاتر اور ذاتی ملازموں کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں، سب کے سب ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

سہارن پور، جس کے محاصل جاگیرداروں کو دے دیے گئے تھے، نجیب خاں روہیلہ کے قبضے میں آگیا تھا۔ آگرے کے گرد و نواح کے علاقے جاٹوں کے انصرام میں تھے، جے پور کے مادھو سنگھ نے نارنول وغیرہ کے علاقوں پر تسلط جما لیا تھا، اسی طرح اور بھی بعض جاگیرداروں نے خالصہ کے علاقوں کو اپنے قبضے میں کر کے بادشاہ کو مالی اعتبار سے اس درجے بے بس کر دیا تھا کہ بعض دفعہ فوجیوں اور ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنا بھی اس کے لیے انتہائی مشکل ہو جاتا تھا۔

شاہ صاحب کی فراست اور سیاسی بصیرت ملاحظہ ہو کہ وہ اپنے ان خطوط میں جو انھوں نے بادشاہوں، وزیروں اور مملکت کے امیروں کے نام تحریر کیے صاف لفظوں میں مشورہ دیتے ہیں کہ "خالصہ" کے علاقے کو اس قدر وسیع ہونا چاہیے کہ دہلی کے گرد و نواح کا پورا علاقہ خالصہ میں شامل ہو، پھر وہاں سے وہ گرہ، حصار، دریائے گنگا اور سرہند تک ممتد ہوتا چلا جائے۔ اس کے لیے

ان کے الفاظ قابل مطالعہ ہیں، فرماتے ہیں:

خالصہ را کشادہ تر باید ساخت، خصوصاً آنچہ گرداگرد شاہ جہان آباد است، تا اکبر آباد و تا حصار و تا دریائے گنگ تا حد حدود سہرند، ہمہ اش یا اکثرش خالصہ شریفہ باشد کہ موجب ضعف امور سلطنت کمی خالصہ و قلت خزانہ است۔[۴۳]

علاقۂ خالصہ کو وسیع تر کرنا چاہیے، خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد واقع ہے، آگرہ، حصار، اور دریائے گنگا اور حدود سرہند تک کا تمام تر علاقہ یا اس کا اکثر علاقہ خالصہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ امور سلطنت میں ضعف کا باعث خالصہ کی کمی اور خزانے کی قلت ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کی بلندیِ فکر کا اندازہ کیجیے کہ مرکز کے استحکام کے لیے وہ اربابِ حکومت اور بادشاہ کو صاف لفظوں میں مشورہ دیتے ہیں کہ چھوٹے منصب داروں کو جاگیریں نہ دی جائیں، اور علاقۂ خالصہ کو وسعت دی جائے، تاکہ مرکزی حکومت میں کمزوری کے آثار نمودار نہ ہوں۔

بہر حال شاہ صاحب نے حکومت کے استحکام اور سیاسی ترقی کے لیے جو یہ پانچ اصول بیان کیے ہیں، وہ بلاشبہ اپنی جگہ بڑے اہم اور ان کی بے پناہ سیاسی بصیرت کے عکاس ہیں۔

مکتوبات

شاہ ولی اللہ صاحب کے افکارِ عالیہ میں ان کے مکتوبات بھی شامل ہیں، جو انھوں نے مختلف مواقع پر ہند اور بیرون ہند کے متعدد حضرات کے نام تحریر فرمائے۔ یہ مکتوبات عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں، اور ایک مستقل علمی ذخیرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بعض خطوط تو وہ ہیں جو انھوں نے اپنے بعض اساتذہ کی خدمت میں ارسال کیے۔ بعض اس دور کے علما و زعما کو تحریر فرمائے۔

---

[۴۳] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب اوّل ص ۴۔

بعض خطوط مختلف مسائل دریافت کرنے اور ضروری معاملات کے متعلق استفسار کرنے والوں کو لکھے۔ بعض خطوط بالکل علمی، مذہبی اور خالص فقہی نوعیت کے ہیں اور بعض کا تعلق ذاتی اور نجی قسم کے معاملات سے ہے۔ ان میں بیالیس خطوط سیاسی نوعیت کے ہیں جو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مرتب کر کے شائع کر دیے ہیں۔ ان خطوط میں ایک خط ایک مغل بادشاہ کے نام ہے، کچھ وزرائے سلطنت اور امرائے مملکت کے نام ہیں، کچھ خطوط ملک کی بعض اہم شخصیتوں کے نام ہیں اور ایک طویل خط افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کے نام ہے۔ اس خط میں شاہ صاحب نے اس دور کے ہندوستان کے سیاسی حالات، تاریخی واقعات اور قابلِ اصلاح امور کی وضاحت کی ہے، اور سلطنت کے امراد وزرا کی سازشوں اور باہمی رقابتوں کا ذکر کیا ہے۔ نیز مرہٹوں، جاٹوں اور دیگر قوموں نے ملک میں جو اودھم مچا رکھا تھا، اس کی ضروری تفصیلات بیان کر کے احمد شاہ ابدالی سے درخواست کی ہے کہ وہ صورتِ احوال کی اصلاح کے لیے مضبوط قدم اٹھائے۔

چنانچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ اس خط کے بعد احمد شاہ ابدالی نے جو پہلے کئی بار ہندوستان پر حملے کر چکا تھا، پھر ہندوستان کا رُخ کیا اور پانی پت میں مرہٹوں سے زبردست جنگ کی۔ اس جنگ میں مرہٹوں کو احمد شاہ کے مقابلے میں شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ نظامی صاحب لکھتے ہیں:

اس خط کے نتیجے میں پانی پت کا میدانِ کارزار سجا۔ اس جنگ کی تاریخی اہمیت سے تاریخ کا ہر طالبِ علم واقف ہے۔ لیکن یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مدرسہ رحیمیہ کا ایک مدرس اس تاریخی جنگ کے نقشے تیار کر رہا تھا۔ اس خط کے مطالعے کے بعد شاہ صاحب کی سیاسی خدمات کا ایک اہم پہلو روشن ہو جاتا ہے۔[۵۴۲]

بیالیس مکتوبات کے اس مجموعے میں سولہ خط شیخ محمد عاشق پھلتی کے نام ہیں۔

---

۵۴۲ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص ۵۴

یہاں شیخ محمد عاشق پھلتی کا تعارف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ شیخ ممدوح بارھویں صدی ہجری کے ایک مشہور بزرگ تھے جو شاہ ولی اللہ کے ماموں شیخ عبید اللہ صدیقی کے بیٹے تھے۔ موضع پھلت (ضلع مظفر نگر ہندوستان) کے باشندے تھے۔ اپنے عہد کے جید عالم اور متقی تھے۔ عرصے تک شاہ صاحب کی صحبت و رفاقت میں رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ ۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحب حجاز مقدس گئے تو یہ بھی اُن کے ساتھ تھے۔ ان کی علمی رفعت اور سلوک و طریقت میں درک کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین نے ان سے فیض حاصل کیا اور ان کی زبانی اپنے جلیل القدر باپ ــــ حضرت شاہ ولی اللہ ــــ کے معارف و تصوف سے متمتع ہوئے۔ سبیل الرشاد، قول الجلی اور شرح دعاء الاعتصام ان کی تصانیف ہیں۔ ۱۱۸۷ یا ۱۱۸۸ھ میں فوت ہوئے۔

بہر حال شاہ ولی اللہ اپنے دَور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کے افکار و خیالات کا سلسلہ نہایت وسعت پذیر تھا۔ وہ جس مسئلے پر گفتگو کرتے اور جس معاملے کو موضوعِ بحث ٹھہراتے، اس کے تمام پہلوؤں کو واضح اور منقح کرتے جاتے۔ اس کا اندازہ ان کے مکتوبات سے بھی ہوتا ہے، جس طرح وہ اپنی تصانیف میں پورے زور اور دلائل سے بات کرتے ہیں، مکتوبات میں بھی انھوں نے اسی اسلوبِ انشا اور طرزِ ادا کو برقرار رکھا ہے۔ قلم میں وہی زور، استدلال میں وہی قوت، الفاظ کے انتخاب میں وہی احتیاط اور بیان و کلام میں وہی اعتدال ہے، جو ان کی باقاعدہ تصانیف کا طرۂ امتیاز ہے۔

شعر و شاعری

شاہ ولی اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف و کمالات سے نوازا، اور علم و فضل کے متعدد گوشوں سے مالا مال کیا تھا، ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ شعر و

شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے اور بہت عمدہ شعر کہتے تھے، آمین تخلص کرتے تھے۔ عربی اور فارسی میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، ان کی متعدد غزلیں اور رباعیاں معرفت و تصوف کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃِ نبی است — واللہ کہ سیرابی از و تشنہ لبی است
جائیکہ بود جلوۂ حق حاکمِ وقت — تابع شدن حکم خرد بو لہبی است

"نخستین بادہ کاندر جام کردند"[۴۵] — مزاجش عکس آں گلفام کردند
شرابِ وحدت از خمخانۂ غیب — مرا صبح ازل در کام کردند
چو غلطیدم ز مستیہا بہر سو — حریفاں مستی از من دام کردند

دلی دارم زِ خود خالی حبابش مینواں گفتن — درو کیفیتِ جوش شرابش مینواں گفتن
وجودِ بے نمود معنی نادیدنی دارد — درین نیرنگہا بوئے عنابش مینواں گفتن
سویدای دل ما یابی اندر پیچ و تاب او — نفوسِ عالمِ ام الکتابش مینواں گفتن
فرو باشید از ہم کثرتِ موہوم چوں شبنم — زفیض معنئ ما آفتابش مینواں گفتن

غزل کے چند شعر پڑھیے:

تا بکے محنتِ مہجوری و دوری بکشم — نازنینِ وطنم سوئے وطن باز روم
تا بکے با خس و خاشاک بود صحبتِ من — صدرِ بزم چمنم سوئے چمن باز روم
تا بکے ہمدمِ سنگ شود شیوۂ من — گوہرے از عدنم سوئے عدن باز روم
تا بکے بستۂ زنجیر تعلق باشم — آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم
بوئے جان میرسد از بادِ یمن در دوجہاں — شاہ ملک یمنم سوئے یمن باز روم

---

[۴۵] یہ مصرع صوفی شاعر فخر الدین ابراہیم عراقی (۶۳۱ھ - ۱۲۸۹ء) کی ایک غزل کا ہے۔ دوسرا مصرع یہ ہے: "ز چشم مست ساقی وام کردند"۔ شاہ صاحب نے اس مصرعے کو تضمین کیا ہے، لیکن تذکرہ نگار نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، جس سے عام قاری کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ مصرع شاہ صاحب کا ہے۔

چند شعر عربی کے ملاحظہ فرمائیے:

کان نجوما او مضت فی الغیاھب — عیون الافاعی او رؤس العقارب
ثلث خصال من تعاجیب ربنا — نجابۃ اعقاب لوالد طالب
خلافۃ عباس و دین نبینا — تزاید فی الاقطار من کل جانب
یؤید دین اللہ فی کل دورۃ — عصائب تتلو مثلھا من عصائب
فمنھم رجال یدفعون عدوھم — بسمر القنا والمرھفات القواضب
ومنھم رجال یغلبون عدوھم — باقوی دلیل مفحم للمغاضب
ومنھم رجال بینوا شرع ربنا — وما کان فیہ من حرام و واجب
ومنھم رجال یدرسون کتابہ — بتجوید ترتیل وحفظ مراتب
ومنھم رجال فسروہ بعلمھم — وھم علمونا مابہ من غرائب
ومنھم رجال بالحدیث تولعوا — وما کان فیہ من صحیح وذاھب
ومنھم رجال مخلصون لربھم — بانفاسھم خصب البلاد الاجادب
ومنھم رجال یھتدی بعظاتھم — قیام الی دین من اللہ واصب
علی اللہ رب الناس حسن جزائھم — بما لایوافی عدہ ذھن حاسب
فمن شاء فلیذکر جمال نبیہ — ومن شاء فلیغزل بحب الربائب
سأذکر حبی للحبیب محمد — اذا وصف العشاق حب الحبائب

اذا اخبرت یوما عن ضیاء — فلا تلھج ببدر او ذکاء
وان تمدح بجود او سمو — فلا تنظر لجود او سماء
وان لابد تمدح ذا معال — فحسبک مدح خیر الانبیاء
وان تمدح رسول اللہ یوما — فحاذر ان تقصر فی الثناء

عربی اور فارسی میں ان کے بہت سے اشعار کا پتا چلتا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف چند شعر درج کیے گئے ہیں:

آخری مرض اور وفات

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ۱۱۷۶ھ کے محرم کی آخری تاریخ کو ہفتے کے دن باسٹھ سال عمر پاکر دہلی میں انتقال فرمایا۔ ان کے آخری مرض اور وفات کے وقت رائے بریلی کے ایک نامور بزرگ سید محمد نعمان حسنی جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے اسلاف میں سے تھے، ان کے پاس موجود تھے، انھوں نے رائے بریلی ہی کے اپنے ایک عزیز سید ابوسعید حسنی کو اس کی بعض تفصیلات ایک مکتوب میں تحریر فرمائی تھیں، یہ مکتوب فارسی میں ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔ سید محمد نعمان اور سید ابوسعید دونوں شاہ صاحب کے مخلصین میں سے تھے:

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ شانہٗ، کے نام کے ساتھ — سب تعریف اللہ کی ہے اس کی نعمتوں پر، رضا بالقضا کے حصول پر، مصیبت و تکلیف میں صبر حاصل ہونے پر، اور درود و سلام سید الشاکرین، زبدۃ الراضین، قدوۃ الصابرین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ پر، اور آپ کے آل و صحاب پر جو کہ طیب و طاہر تھے، اور آپ کے وارثین یعنی علمائے راسخین اور اولیائے مرشدین پر، یہ سلسلہ قیام قیامت تک جاری رہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ امام سنت، مقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زمان، سر آمد اولیائے جہان، قطب زمانی، محبوب سبحانی سیدنا و مرشدنا ولی اللہ فاروقی مجدد وقت رضی اللہ عنہ کے انتقال پُرملال کا واقعہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہم جیسے غم زدہ لوگوں کے لیے عین مناسب ہے:

چہ بخاطر رسید یار مرا
کہ بہ ہجراں کشید کار مرا

(یعنی ہمارے دوست کے دل میں کیا آیا کہ ہمیں فراق و مہجوری میں مبتلا کر گیا)

وامصیبتاہ! اللہ کی شان بے نیازی کا یہ عجب نمونہ ہے کہ ایسے مقتدا کی روح کو صرف ۶۲ سال کی عمر میں اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔

(اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف راضی اور پسندیدہ ہوکر واپس جا) کی ندا دی گئی اور اہلِ بدعت وضلالت کو خوش اور اصحابِ دین کو اندوہ گین کر دیا گیا۔ یعنی ہفتے کے دن ظہر کے وقت، محرم کی آخری تاریخ ۱۱۷۶ھ کو حکمِ خداوندی سے حضرت کے طائرِ روح نے قالبِ عنصری سے پرواز کرکے اوجِ علیین میں اپنا نشیمن بنالیا۔ آپ کی مفارقت سے آپ کے احباب ورفقا کی حالت ایسی خستہ وخراب تھی کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی — انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم سے اس عاصی کو حضرت (شاہ ولی اللہ) رحمۃ اللہ علیہ کی کشش نے اپنی طرف کھینچا، چنانچہ ماہ ذی قعدہ (۱۱۷۵ھ) میں بڈھانہ جاکر آستانہ بوسی کی سعادت حاصل ہوئی، اور آپ کی صحبتِ اقدس سے شرف یاب ہوا۔ بڈھانہ سے ۹ ذی الحجہ (۱۱۷۵ھ) کو آپ بغرضِ علاج دہلی تشریف لائے اور بافضل اللہ کے مکان پر مسجد روشن الدولہ کے احاطے میں جو چوک سعد اللہ خاں میں واقع ہے، فروکش ہوئے۔ فرزندانِ گرامی قدر میں سے میاں محمد صاحب، میاں عبدالعزیز اور میاں رفیع الدین مدظلہم العالی، اور اقربا وتلامذہ میں سے میاں محمد عاشق صاحب، میاں اہل اللہ صاحب، میاں محمد فائق، میاں محمد جواد اور خواجہ محمد امین وغیرہ حاضرِ خدمت تھے۔

یہ غلام (یعنی سید محمد نعمان حسنی) میر محمد عتیق اور میر قاسم علی جنھوں نے حضرت کے آخری ایام میں شرفِ بیعت حاصل کیا تھا، ہر روز خدمت گاری کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے تھے۔

مشفق من! یہ آخری مجلسیں بھی عجیب پُر کیف اور پُر فیض تھیں نفحاتِ اُنس ورحمت اور رشحاتِ قدس وبرکت بارش کی طرح برستے تھے۔ اکثر اہلِ نسبت حضرات اپنے وجدانِ صحیح سے اس صورتِ حال کو محسوس کرتے تھے۔ اہل اللہ اور عارف تو ہمیشہ اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں، مگر ایسا مردِ حقانی

جو جمیع اوصافِ حمیدہ کا حامل اور کتاب و سنت کا مجتہدانہ شان سے عالم ہو، نیز حقائق و معارف میں بحرِ مواج اور دیگر علوم میں دریائے زخار ہو، صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے :

دور ہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن

... یہ بات بھی لائق تعریف ہے کہ حضرت مرحوم و مغفور کی آپ سے رضامندی اور آپ پر اُن کی توجہاتِ عالیہ کو میں نے حدِّ بیان سے زیادہ پایا، آپ کے حالات، اکثر اوقات دریافت کرتے رہتے تھے۔

ابدالیوں کی جنگ کا واقعہ اور آپ کا عین اس ہنگامۂ قیامت خیز میں پہنچنا اور آپ کے قدومِ گرامی سے آتشِ فتنہ کا فرو ہو جانا، یہ سب باتیں حضرت اپنی زبانِ دُرفشاں سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ شاید آپ سے آخری ملاقات کی تمنا حضرت کے دل میں تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ الفاظ فرمائے :

"میر ابوسعید ارادۂ آمدن دارند، اگر زود برسند بہتر باشد"

میر ابوسعید آنے کا ارادہ کر رہے ہیں، اگر جلدی آجائیں تو اچھا ہو۔

صاحبِ من! حضرت کی ظاہری صحبت تو اب میسّر نہیں آسکتی۔ البتہ علومِ دینیہ میں ان کی تصنیفات نوّے کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ تفسیر، اصولِ فقہ، کلام اور حدیث میں جیسے حجۃ اللّٰہ البالغہ، ازالۃ الخفا عن الخلفا، اور ترجمۂ قرآن، جن میں ہر کتاب کی کافی بڑی ضخامت ہے۔ ان کے علاوہ دیگر رسائل ہیں، جو حقایق و معارف پر مشتمل ہیں، جیسے الطاف القدس، ہمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہ۔ یہ کتابیں حضرت کے فیوض و برکات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ آپ اس بات کا عزم کریں کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج فرمائیں گے۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پا سکتا ہے۔

معلوم نہیں اس قسم کی کتابیں گزشتہ دور میں معرضِ تصنیف میں آئی ہیں یا

نہیں۔ واللہ اعلم — ارباب بصیرت ان کتابوں کی افادیت کا اقرار کرتے ہیں۔

حضرت (شاہ صاحب) کا کلام ہر باب میں اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے ... اس فقیر کو اور صاحب زادگان گرامی نیز حضرت ممدوح کے تمام رفقائے کرام کو آپ کی حضرت سے محبت کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ جیسے ہی آپ اس حادثۂ عظیمہ (یعنی شاہ صاحب کی وفات) کی خبر سنیں گے، دہلی کو روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے میں بھی آپ کی آمد کا منتظر ہوں۔ اگر آپ جلدی تشریف لائیں تو میں ملاقاتِ سامی سے مسرور ہو جاؤں۔ اگر تشریف لانے میں کچھ دیر ہو تو مطلع فرمائیں، کیوں کہ یہ فقیر بھی واپس وطن آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میاں محمد عاشق صاحب بعد سلام فرماتے ہیں کہ میر ابوسعید کو لکھو کہ حضرت اقدس (شاہ صاحب) کے جتنے مکتوبات بھی ان کے نام لکھے گئے ہیں، ان کی نقول ضرور بھیجیں تاکہ ان کو مکاتیب کے مجموعے میں شامل کیا جائے۔

حضرت میاں اہل اللہ صاحب اور دیگر حضرات نیز (شاہ صاحب کے) صاحب زادگان کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

بڑھانہ میں حضرت اقدس کی خدمت میں بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے لیے دعا کی اور نہایت افسوس کا اظہار فرمایا تھا۔

شاہ صاحب کے فرزندانِ گرامی

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اختصار سے بیان کیا جا چکا، مختلف علوم و فنون میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ بہت بلند تھا اور وہ ہر مسئلے میں گہری نظر رکھتے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں ان کے فضل و کمال کی وسعتوں کا واضح الفاظ میں ذکر کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

وانصاف ایں است کہ اگر وجودِ او در صدرِ اوّل وزمانۂ ماضی می بود امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ می باشد[۴۵]

یعنی انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب دَورِ اوّل میں پیدا ہوتے اور زمانۂ ماضی سے ان کا تعلق ہوتا تو ائمۂ حدیث وفقہ کی عظیم المرتبت جماعت میں وہ امام الائمہ کے مرتبے پر فائز ہوتے اور انھیں مجتہدینِ کرام کے سرتاج گردانا جاتا۔

شاہ صاحب کی یہ بہت بڑی خوش بختی ہے کہ جس طرح انھوں نے تصنیفات کی صورت میں اپنے پیچھے علم وفضل کا عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا، اسی طرح اولاد کی شکل میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص امتیاز بخشا۔ ان کی صُلبی اولاد میں چار بیٹے فضل وکمال کے بلند مرتبے کو پہنچے جنھوں نے اپنے عالی قدر باپ کے علمی سلسلے کو باقاعدہ جاری رکھا اور آگے بڑھایا۔

شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی اپنے ماموں کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ اس خاتون سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جن کا نام محمد تھا۔ مولانا محمد ایک عالم آدمی تھے اور شاہ صاحب کی وفات کے وقت زندہ تھے، لیکن لاولد انتقال کر گئے۔

پہلی بیوی کی وفات کے بعد شاہ صاحب کی دوسری شادی سونی پت کے ایک بزرگ سیّد ثناء اللہ کی صاحب زادی سے ہوئی۔ اس نیک بخت خاتون کے بطن سے پانچ بچے متولّد ہوئے۔ ایک بیٹی اور چار بیٹے، بیٹی کا نام امۃ العزیز تھا، بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں: شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر، اور شاہ عبدالغنی۔ ان کے جو حالات مل سکے وہ ان شاء اللہ بشرطِ زندگی فقہائے ہند کی اگلی جلد (تیرھویں صدی ہجری کے ضمن میں) تحریر کیے جائیں گے۔ لیکن موقعے کی مناسبت سے ان کا مختصر تعارف ذیل کی سطور میں کرایا جاتا ہے:

---

[۴۶] اتحاف النبلاء، ص ۴۳۰

شاہ عبدالعزیز: آپ حضرت ولی اللہ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔ ان کی ولادت ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں ہوئی۔ تمام علوم مروجہ کی باقاعدہ تحصیل کی۔ نہایت ذہین و فطین اور حاضر جواب تھے۔ باپ کی وفات کے بعد ان کی مسندِ درس پر متمکن ہوئے۔ ساٹھ برس تک طالبانِ علم کو علمِ حدیث اور دیگر علومِ اسلامی کا درس دیتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے نامور حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں، جنھوں نے بالخصوص علمِ حدیث کی بہت اشاعت کی۔ شاہ عبدالعزیز کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ تین بیٹیاں تھیں، جن میں سے ایک کی شادی مولانا عبدالحی سے، دوسری کی شاہ رفیع الدین کے بیٹے مولانا عیسیٰ سے اور تیسری کی شیخ محمد افضل سے ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات کو اہلِ علم میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مختلف مسائل میں ان کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اسّی سال عمر پائی اور ۷ شوال ۱۲۳۹ھ (۷ جولائی ۱۸۲۴ء) کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔

شاہ رفیع الدین: آپ شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند تھے۔ ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں۔ تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ کیا، جو ہر حلقے میں مقبول ہے۔ ستر برس کی عمر کو پہنچ کر ۶ شوال ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) کو اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں انتقال کیا۔ اپنے والد بزرگوار کے قریب بائیں کی طرف مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالقادر: شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر تھے جو ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء) میں پیدا ہوئے اور علوم بوقلموں میں مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر فنونِ متداولہ میں خوب مہارت پیدا کی۔ نیکی اور تقوے میں ممتاز تھے۔ عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ قرآن مجید کا اردو

ترجمہ ان کا رفیع الشان کام ہے۔ یہ ترجمہ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۱ء) میں مکمل ہوا "موضح القرآن" اس کا تاریخی نام ہے [۱۲۰۵]۔ ۹ ارجب ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) میں سفر آخرت اختیار کیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ شاہ رفیع الدین نے کیا یا شاہ عبدالقادر نے۔!

شاہ عبدالغنی: شاہ ولی اللہ کے چوتھے فرزند شاہ عبدالغنی تھے انھوں نے اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح زیادہ شہرت نہیں پائی، لیکن اس کمی کو ان کے فرزند عالی قدر حضرت شاہ اسمٰعیل شہید نے پورا کر دیا۔ شاہ شہید نے شاہ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا اور اپنے جدِ امجد حضرت شاہ ولی اللہ کے کمالاتِ علمی اور معارفِ روحانی میں درجۂ کمال کو پہنچے، اور پھر اپنے عمل و کردار سے اس کی خوب اشاعت بھی کی۔ انھوں نے اس برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی، دینی اور سیاسی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اپنی خدماتِ نوع بنوع سے انوکھے اسلوبِ کار کی طرح ڈالی، جس کی ضروری تفصیلات سلسلۂ فقہائے ہند کی آئندہ جلدوں میں بیان کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزندانِ گرامی کا یہ مختصر سا تعارف ہے۔ پوری دنیا شاہ صاحب اور ان کی اولاد کے فیوضِ علمی و عملی سے بہرہ یاب ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی، ان کے حالات و سوانح بھی بے شمار حضرات نے تحریر کیے اور آئندہ کرتے رہیں گے، لیکن افسوس ہے، اس وقت اس عالم آب و گِل میں اس خاندان کا کوئی فرد موجود نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کی تصنیف "اتحاف النبلا" ۱۲۸۸ھ میں طبع ہوئی تھی۔ وہ اس میں شاہ ولی اللہ کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ولیکن دریں وقت ایں خاندانِ علم و کمال بتمامہا منقرض شدہ۔ و ہیچ یکی ازاں ہا باقی نماندہ[۴۶]

---

[۴۶] اتحاف النبلا ص ۴۳۱

یعنی اس وقت یہ پورا خاندانِ علم وکمال ختم ہو چکا ہے اور ان میں سے کوئی شخص اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔

قرآن مجید کا اردو ترجمہ

آج اردو زبان بے حد ترقی کر چکی ہے، بہت سے علوم وفنون اس میں منتقل ہو گئے ہیں اور یہ ایک علمی زبان بن گئی ہے۔ اس میں اب قرآن مجید کے بہت سے ترجمے موجود ہیں، جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں، لیکن آج سے دو سو سال پہلے کے حالات کو سامنے رکھیے، جب اردو زبان بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی، پورے ہندوستان میں اس زبان میں چند گنتی کی کتابیں لکھی گئی تھیں اور اہلِ علم اس میں تحریر و کتابت کی جرأت نہ کرتے تھے، اس لیے کہ نہ اس کے اصول وقواعد وضع ہوئے تھے، نہ یہ علمی زبان بنی تھی اور نہ اس میں الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا۔ اس زمانے میں اردو زبان کو ترجمے کی زبان بنانا اور ترجمے کے لیے بھی قرآن مجید کا انتخاب کرنا علمی لحاظ سے بہت مشکل اور دل گردے کا کام تھا۔

ترجمے کے سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ ترجمہ کرنے والے کے لیے کم سے کم تین اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے۔

۱۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہے، اس میں مہارت رکھتا ہو۔

۲۔ جس زبان سے ترجمہ کرنا چاہتا ہے اس پر عبور رہو۔

۳۔ جس موضوع کی کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی ہے، اس موضوع کو خوب سمجھتا ہو۔

شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر بے شک عربی زبان کے ماہر تھے، مروجہ علوم وفنون میں بھی عبور رکھتے تھے، لیکن اردو زبان تو ان کے زمانے میں بالکل ابتدائی دور میں تھی اور اس کا دامن ابھی الفاظ وتراکیب کی وسعت سے مالامال نہ ہوا تھا۔ اس میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنا محض نصرتِ خداوندی اور ان بزرگوں کی بے پناہ ذہانت وفطانت کی دلیل ہے۔

بہر حال شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزندانِ گرامی ـــــ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر ـــــ کی بہت بڑی دینی خدمت، قرآنِ مجید کا اردو ترجمہ ہے جس طرح خود شاہ صاحب نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کر کے عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، اسی طرح ان کے بیٹوں نے بھی یہ عدیم المثال خدمت انجام دی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ی

۹۹۔ مولانا یار محمد لاہوری

بارھویں صدی ہجری میں خطۂ لاہور کے جن رفیع المرتبت علمائے کرام نے خاص طور پر شہرت و ناموری حاصل کی ان میں مولانا یار محمد کا اسم گرامی قابلِ ذکر ہے۔ مولانا ممدوح مسلکاً حنفی تھے اور اپنے وقت کے فاضل بزرگوں میں گردانے جاتے ہیں۔ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور مختلف اساتذہ سے علومِ متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر حجاز کی ارضِ مقدس کا قصد کیا اور حج و زیارت کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔ بعد ازاں مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور خدمتِ دین کو مقصدِ حیات ٹھہرایا۔ اپنے گوناگوں اوصاف کی بنا پر لوگوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور بڑی عزت و تکریم کے مالک تھے۔ اسلامی معاملات میں نہایت جری اور غیور تھے۔ کوئی دینی مسئلہ پیش آتا تو اس پر عمل کو ضروری قرار دیتے اور اس سلسلے میں بڑی سے بڑی طاقت کی بھی پروا نہ کرتے۔ امورِ دینیہ کی اشاعت اور تائیدِ حق میں بحث و مناظرہ میں بہت تیز تھے۔

اس ضمن میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ عالم سربر آرائے سلطنتِ ہند ہوا تو اس نے تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد یہ حکم جاری کر دیا کہ مملکتِ ہند کی تمام مسجدوں کے خطیب خطبۂ عیدین اور خطبۂ جمعہ میں خلفائے راشدین کے ذکر میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لیں تو ان کے ساتھ لفظ "وصی" استعمال کریں۔ اس حکم پر پورے ملک میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور مساجد کے خطیبوں اور عوام اہلِ سنت نے شدید احتجاج کیا اور مختلف مقامات میں سخت ہنگامے ہوئے۔ ان مقامات میں لاہور اور احمد آباد بھی شامل ہیں، یہاں کے لوگ میدان میں نکل آئے۔ احمد آباد میں تو سخت

اشتعال پیدا ہوگیا اور نوبت قتل و غارت تک پہنچ گئی۔ لاہور میں بھی بہت ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوگئی اور لوگ بادشاہ کے اس حکم کی بر سرِ عام مخالفت کرنے لگے۔ علما میں مولانا یار محمد اور مولانا محمد مراد نے بادشاہ کے اس فرمان کو ماننے اور اس پر عمل کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ مولانا یار محمد صورتِ حال کی وضاحت کے لیے لاہور کے قاضی کے پاس گئے اور کہا کہ بادشاہ یہ حکم واپس لے لے۔ جب معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تو خود بادشاہ نے علمائے لاہور سے گفتگو کی، اور اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو موضوعِ بحث ٹھہرایا۔

مولانا یار محمد بہت محتاط اور متبعِ سنت تھے، وہی زیادہ تر بادشاہ سے گفتگو کرتے رہے۔ مسئلہ چونکہ نازک منزل میں داخل ہو گیا تھا اور اس میں خود بادشاہ کے ذاتی وقار اور حکم کا سوال تھا، اس لیے بادشاہ کی یہ کوشش تھی کہ اس حکم پر بہر حال عمل کیا جائے، مگر مولانا یار محمد یہ قطعاً برداشت نہ کرتے تھے اور ان کا اندازِ کلام اتنا سخت تھا کہ منتخب اللباب کا مصنف خانی خاں اسے "گستاخانہ" قرار دیتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

حاجی یار محمد در ردِّ قولِ پادشاہ گستاخانہ و بے محابا پیش آمدہ با پادشاہ سوال و جواب می نمود، پادشاہ بر آشفتہ فرمودند کہ از غضبِ پادشاہاں نمی ترسی کہ چنیں خلافِ آدابِ مجلسِ سلاطین مبادرت بکلمہ و کلام می نمائی۔[۱]

یعنی حاجی یار محمد نے بادشاہ کی بات کے رد میں گستاخانہ اور غیر مؤدبانہ انداز اختیار کیا اور بادشاہ کے حضور سختی سے گفتگو کی۔ بادشاہ اس سے بہت خفا ہوا، اور فرمایا کیا تم بادشاہ کے غضب سے نہیں ڈرتے، اور تلخ کلامی سے پیش آتے ہو جو کہ بادشاہوں کی آدابِ مجلس کے بالکل منافی ہے۔

مولانا یار محمد چوں کہ نہایت جرأت مند عالمِ دین تھے اور کلمۂ حق کہنے میں کسی کی پروا نہ کرتے تھے، بے جھجک بولے۔

---

۱ ـ منتخب اللباب ج ۲ ص ۶۸۲

حاجی یار محمد در جواب گفت کہ من آرزوئے عطائے چہار چیز از واہب بے منت خود داشتم، اوّل تحصیل علم، دویم حفظ کلام اللہ، سیوم حج، چہارم شہادت۔ الحمدللہ کہ از طرف عطائی سہ نعمتِ الٰہی کامیاب شدہ ام، آرزوئے شہادت باقی ماندہ، امید دارم کہ از توجہ پادشاہ عدالت اساس کامروا گردم [۵۲]

حاجی یار محمد نے جواب دیا کہ میں بارگاہِ خداوندی سے چار چیزوں کی آرزو رکھتا تھا۔ ایک حصولِ علم کی، دوسرے حفظ قرآنِ مجید کی، تیسرے حج بیت اللہ کی، اور چوتھے راہِ خدا میں شہادت کی۔ الحمدللہ! کہ اللہ نے مجھے پہلی تین چیزوں کی نعمت کے حصول میں کامیاب فرما دیا ہے۔ اب آرزوئے شہادت باقی ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ بادشاہ کی مہربانی سے اس نعمت کے حصول میں بھی کامیاب ہو جاؤں گا۔

اس نازک اور اہم مسئلے پر کئی روز تک بحث ہوتی رہی۔ اس اثنا میں تمام لوگ مولانا یار محمد کی حمایت پر اتر آئے اور بادشاہ کے حکم کی برملا مخالفت کرنے لگے۔ منتخب اللباب کا مصنف لکھتا ہے کہ خود بادشاہ کا بیٹا عظیم الشان بھی مولانا ممدوح کا حامی اور بادشاہ کا مخالف ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ نے گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیا اور علما، عوام اور خود بیٹے کو اپنے خلاف پایا تو حکم واپس لے لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ لفظِ "وصی" شامل کرنے سے خطیبوں کو منع کر دیا۔

لیکن حالات کچھ ایسا رُخ اختیار کر گئے تھے کہ اگرچہ بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا تھا مگر لوگ مطمئن نہ ہوئے اور کثیر تعداد میں نمازِ جمعہ میں شریک ہوئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ لفظ پڑھا گیا تو اس کے خلاف احتجاج کیا جائے گا، لیکن جب انھوں نے خطبۂ جمعہ سنا اور لفظِ "وصی" خطبے میں نہ پڑھا گیا تو اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ پھر جب بادشاہ کو یہ اطلاع پہنچی کہ لوگ مسجد

---

۵۲ منتخب اللباب ج ۲، ص ۶۸۲

میں ہجوم کر کے آگئے تھے تو اس نے شدید خفگی کا اظہار کیا اور مولانا یار محمد اور ان کے ساتھی علما کو گرفتار کر کے قلعے میں بند کر دیا۔ اس نے یہ قدم اس لیے اٹھایا کہ اسے شبہ تھا کہ لوگوں کو مسجد میں مولانا یار محمد اور ان کے رفقا نے بھیجا ہے۔ مگر بعد میں صورتِ حال معمول پہ آگئی اور گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔

بہر حال مولانا یار محمد لاہوری اپنے عہد کے مشہور اور نامور عالم و فقیہ تھے۔[۳۵]

۱۰۴۔ شیخ لیسین جون پوری

ارضِ ہند میں علم و فضل اور تصوف و سلوک کے لحاظ سے گزشتہ دور میں صوبہ یوپی کے شہر جون پور کو بڑی خصوصیت حاصل رہی ہے۔ وہاں کے اہلِ علم اور ذی فضل حضرات نے بے حد شہرت پائی اور تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور دیگر اوصاف و کمالات میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ انھی حضرات میں ایک عالم دین شیخ لیسین بن باقر عثمانی جون پوری مازندرانی بھی تھے۔ وہ جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی، اور حصولِ علم کے لیے الٰہ آباد پہنچے۔ وہاں شیخ محمد یحییٰ عباسی (متوفی ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ) اور ان کے لائق بیٹے شیخ محمد طاہر عباسی (متوفی ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ کتبِ درسیہ ان دونو باپ بیٹے سے پڑھیں۔ شیخ محمد یحییٰ عباسی سے اخذِ طریقت بھی کیا اور ایک عرصے تک وہاں رہے، پھر جون پور واپس گئے اور شادی کی۔ کچھ مدت بعد بیوی کا انتقال ہو گیا تو گوشہ گیری کی زندگی اختیار کر لی اور پھر سفرِ حج پر روانہ ہو گئے۔ ۱۱۴۹ھ

۳۵۔ منتخب اللباب کے علاوہ یہ واقعہ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۱۸، ۴۱۹ میں بھی مرقوم ہے۔

میں فریضہ حج ادا کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی (متو
۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ) کی مسندِ تدریس آراستہ تھی، اس میں شریک ہو گئے اور ان سے
حدیث حاصل کیا۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور زندگی کے آخری دو سال فرخ آ
میں گزارے اور وہیں ۵ جمادی الاخریٰ ۱۱۸۳ھ کو وفات پائی۔[۴]

۱۰۱۔ مفتی یعقوب فرنگی محلی لکھنوی

علمائے فرنگی محلی کی طویل فہرست میں مفتی یعقوب بن عبدالعزیز بن اسعد
قطب الدین انصاری سہالوی لکھنوی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ ممدوح کا شمار بار
صدی ہجری کے ممتاز ہندی علما و فقہا میں ہوتا ہے۔ ان کا مولد و منشا لکھنو
اپنے دَور کے معروف عالم مولانا محمد حسن انصاری سہالوی لکھنوی (متوفی ۳
۱۱۹۹ھ) اور اپنے والدِ مکرم کے عمِ محترم اور عالمِ کبیر شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (م
الاولیٰ ۱۱۶۱ھ) سے کسبِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسندِ درس پہ فا
اور علمِ فقہ اور دیگر علومِ متداولہ میں شہرت حاصل کی۔ ان کو یہ شرف حاصل ہے
نظام الدین انصاری سہالوی کی زندگی ہی میں ان کا شمار اپنے عصر کے معرو
کرام میں ہونے لگا تھا۔ ان کی علمی شہرت سے متاثر ہو کر وزیر الممالک صفدر
ابو المنصور خاں نے ان کو لکھنؤ کے منصبِ افتا پر فائز کر دیا تھا۔

مفتی یعقوب علومِ دینیہ کا درس دیتے تھے اور امانت و دیانت میں
مشہور تھے۔ انھوں نے ۶۳ سال عمر پائی اور ۱۱۸۷ھ کو لکھنؤ میں انتقا

---

[۴] تجلی نور، ج ۲ ص ۴۸ تا ۵۱ — تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۹۰
نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۴۱۹، ۴۲۰

[۵] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۰ — تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۵
نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۴۲۲ — احوالِ علمائے فرنگی محل ص ۸۱۳

مراجع و مصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ صحیح بخاری : محمد بن اسماعیل بخاری۔ مطبع اصح المطابع، دہلی۔

۲۔ صحیح مسلم : امام مسلم۔ مطبع اصح المطابع، دہلی۔

۳۔ ابجد العلوم : نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقیہ، بھوپال، ۱۲۹۵ھ

۴۔ اتحاف النبلا : نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور، ۱۲۸۸ھ

۵۔ احوال علمائے فرنگی محل : شیخ الطاف الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی

۶۔ اخبار الصنادید : حکیم نجم الغنی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ

۷۔ ادبیاتِ سرحد : رضا ہمدانی۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۳ء

۸۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ : پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن "ٹیپو سلطان" مضمون غلام رسول مہر

۹۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ : پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن "حافظ رحمت خاں" مضمون بزمی انصاری

۱۰۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ : پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن "برکی" مضمون ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں

۱۱۔ اذکار الابرار : شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ۔ ۱۳۵۷ھ

۱۲۔ ارمغان شاہ ولی اللہ : محمد سرور جامعی۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور

۱۳۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین : شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی

۱۴۔ امداد فی مآثر الاجداد : شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی

۱۵۔ عطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ : شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی

۱۶۔ انفاس العارفین : شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۱۷

۱۷۔ البدور البازغہ : شاہ ولی اللہ دہلوی۔ شاہ ولی اللہ اکیڈیمی، حیدرآباد (سندھ) ۱۹۷۰

۱۸- تاریخ سلطنت خداداد میسور- محمود خاں بنگلوری- پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور- ۱۹۴۷ء

۱۹- بزم تیموریہ : سید صباح الدین عبدالرحمٰن - دار المصنفین، اعظم گڑھ

۲۰- بزم سخن : سید علی حسن خاں - مطبع نامی مفید عام، آگرہ - ۱۸۸۱ء

۲۱- بوستان اخبار : سعید احمد مارہروی - مطبوعہ آگرہ - ۱۳۳۱ھ

۲۲- تاریخ برہان پور : خلیل الرحمٰن برہان پوری - مطبع مجتبائی، دہلی - ۱۳۱۷ھ

۲۳- تاریخ خورشید شاہی : غلام امام خاں ترین - مطبع خورشیدیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۲۸۶ھ - ۱۸۷۰ء

۲۴- تاریخ شیراز ہند جون پور : سید اقبال حسین - ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور - ۱۹۶۴ء

۲۵- تاریخ کشمیر اعظمی : خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری - ناشر، غلام محمد نور محمد، سری نگر

۲۶- تاریخ مشاہیر چشت : خلیق احمد نظامی - ندوۃ المصنفین، دہلی - ۱۹۵۳ء

۲۷- تاریخ معصومی : میر محمد معصوم بھکری - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۹ء

۲۸- تاریخ النوائط : نواب عزیز جنگ بہادر - عزیز المطابع، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۲ھ

۲۹- تجلی نور المعروف تذکرہ مشاہیر جون پور : نور الدین زیدی - مطبع اعظم المطابع، جون پور - ۱۸۸۹ء

۳۰- تحفۃ الکرام : میر علی شیر قانع - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۹ء

۳۱- تحفۂ کشمیر : منشی گنیش لعل دہلوی - مطبع کوہ نور، لاہور - ۱۸۵۳ء

۳۲- تذکرہ آثار الشعرا : سید محمد ممتاز - مطبع شاہ جہانی، بھوپال - ۱۳۰۴ھ

۳۳- تذکرۃ الشعرا : امیر دولت شاہ - مطبع مجیدی، کان پور - ۱۳۲۶ھ

۳۴- تذکرہ صوفیائے سندھ : اعجاز الحق قدوسی - اردو اکیڈمی سندھ، کراچی - ۱۹۵۹ء

۳۵- تذکرۃ العلماء والمشائخ : محمد الدین فوق - گلزار محمدیہ اسٹیم پریس، لاہور - ۱۳۳۸ھ

۱۹۲۰ء

۳۶- تذکرہ علمائے فرنگی محل: مولوی محمد عنایت اللہ۔ مطبوعہ لکھنؤ۔ ۱۹۳۰ء
۳۷- تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی- مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء
۳۸- تذکرہ مشائخ بنارس: ابوالاثر عبدالسلام- ندوۃ المعارف، بنارس-۱۳۷۱ھ
۳۹- تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر- مطبع اصح المطابع، لکھنؤ- ۱۹۲۷ء
۴۰- تذکرہ مصنفین درس نظامی: اختر راہی- مکتبہ رحمانیہ، لاہور- ۱۳۹۸ھ- ۱۹۷۸ء
۴۱- تفہیمات الالٰہیہ: شاہ ولی اللہ- مطبوعہ حیدرآباد (سندھ)- ۱۹۶۷ء
۴۲- تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں مطبوعہ بھوپال- ۱۲۹۸ھ
۴۳- الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند: سید عبدالحی حسنی لکھنوی- مطبوعہ دمشق- ۱۹۵۸ء
۴۴- چمنستان شعرا: رائے لچھمنی نرائن شفیق- مطبوعہ حیدرآباد (دکن)- ۱۹۲۸ء
۴۵- حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہ دہلوی- مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور- ۱۹۷۵
۴۶- حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۳۲۴ھ- ۱۹۰۶ء
۴۷- حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہوری- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۸۷۷ء
۴۸- حکایات کشمیر: محمد الدین فوق- کریمی پریس، لاہور- ۱۳۴۷ھ- ۱۹۲۹ء
۴۹- حیات حافظ رحمت خاں: سید الطاف علی بریلوی- اکیڈیمی آف ایجوکیشنل آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی- ۱۹۶۳ء
۵۰- حیات العلما: سید عبدالباقی سہسوانی- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۳۴۰ھ- ۱۹۲۲ء
۵۱- حیات ولی: مولانا رحیم بخش دہلوی- مکتبہ سلفیہ، لاہور- ۱۹۵۵ء
۵۲- تذکرہ- مولانا ابوالکلام آزاد- مکتبہ احباب، لاہور
۵۳- قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین: شاہ ولی اللہ دہلوی- مکتبہ سلفیہ، لاہور- ۱۳۹۶ھ- ۱۹۷۶ء
۵۴- ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون: اسماعیل پاشا- مکتبہ بہیہ- استنبول-

۱۹۴۵ - ۱۳۶۴ھ

۵۵۔ وارن ہیسٹنگز اور انگریزی راج : از ای۔پی۔موون۔ ترجمہ۔ سید اولاد علی گیلانی۔ ناشر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۱ء

۵۶۔ مومن، حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقید : کلب علی خاں فائق، رام پوری۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۱ء

۵۷۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل : سید طفیل احمد منگلوری علیگ۔ ناشر۔ حماد الکتبی، بیش محل روڈ۔ لاہور۔

۵۸۔ خزانۂ عامرہ : سید غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۵۹۔ خزینۃ الاصفیا : مفتی غلام سرور لاہور۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ۔ موسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ھ

۶۰۔ خلاصۃ التواریخ : لالہ سجان رائے بٹالوی۔ بہ تصحیح ظفر حسن، مطبع جی اینڈ سنز، دہلی۔ ۱۹۱۸ء

۶۱۔ رودِ کوثر : شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۶۲۔ روضۃ الابرار : محمد الدین۔ سراج المطابع، جہلم۔ ۱۳۰۲ھ

۶۳۔ روضۃ الاولیا : غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع اعجاز صفدری، حیدر آباد (دکن) ۱۳۰۱ھ

۶۴۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان : غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی۔ ۱۳۰۳ھ

۶۵۔ سروِ آزاد : غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۹۱۰ء

۶۶۔ سفینۃ الاولیا : دارا شکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۸۴ء

۶۷۔ سید احمد شہید : غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۴ء

۶۸۔ سیر الاولیا : محمد مبارک علوی المعروف امیر خرد کرمانی۔ مطبع محب ہند، دہلی۔ ۱۳۰۲ھ

۶۹۔ سیر المتاخرین : غلام حسین طباطبائی۔ نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۲ھ

۷۰۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل : مولانا ابو الحسنات عبد الحی لکھنوی۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ۔ ۲۱

۷۱۔ فرحت الناظرین (شخصیات) محمد اسلم پسروری۔ ترجمہ و ترتیب، محمد ایوب قادری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۲ء

۷۲- الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا ابو الحسنات عبد الحی لکھنوی، مطبوعہ مصر-۱۳۲۴ھ
۷۳- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد- طبع آگرہ- ۱۳۱۶ھ
۷۴- کلمات طیبات: ابو الخیر محمد بن احمد مراد آبادی- مطبع مجتبائی، دہلی- ۱۳۰۹ھ
۷۵- گل رعنا: سید عبد الحی حسنی لکھنوی: دار المصنفین، اعظم گڑھ- طبع سوم، ۱۹۶۴ء
۷۶- گلزار اولیا: مظفر حسین- مطبع سبحانی، حیدر آباد (دکن)- ۱۳۳۹ھ- ۱۹۲۰ء
۷۷- مآثر الامرا: شاہ نواز خاں- ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ- ۱۸۸۸ء — ۱۸۹۰ء
۷۸- مآثر عالمگیری: محمد ساقی مستعد خاں، نفیس اکیڈیمی، کراچی- ۱۹۶۲ء
۷۹- مآثر الکرام: غلام علی آزاد بلگرامی- مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور- ۱۹۷۱ء
۸۰- محبوب ذی المنن تذکرہ علمائے دکن: عبد الجبار خاں ملکاپوری- مطبع رحمانی و حسن پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۲ھ
۸۱- محبوب ذی المنن تذکرہ شعرائے دکن: عبد الجبار خاں ملکاپوری- مطبع رحمانی، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۹ھ
۸۲- مرآت احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر- مطبوعہ کلکتہ- ۱۹۲۷ء
۸۳- مسلم الثبوت: قاضی محب اللہ بہاری- مطبع انصاری، دہلی- ۱۸۹۹ء
۸۴- مشاہیر ادب اردو: مہیش پرشاد- ناشر نند کشور اینڈ برادرز بنارس- ۱۹۳۲ء
۸۵- معمولات مظہریہ: نعیم اللہ بھرائچی- مطبع محمدی، لاہور- ۱۳۱۰ھ
۸۶- مقامات مظہری: غلام علی علوی مجددی- مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۰۹ھ- ۱۸۹۲ء
۸۷- ملفوظات شاہ عبد العزیز دہلوی: مطبع مجتبائی، میرٹھ- ۱۳۱۴ھ
۸۸- مقالات شبلی (جلد سوم): مرتبہ، سید سلیمان ندوی- دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۳۷۵ھ- ۱۹۵۵ء
۸۹- علمائے ہند کا شاندار ماضی (جلد دوم): مولانا محمد میاں- مکتبہ محمودیہ، لاہور، ۱۳۹۷ھ- ۱۹۷۷ء
۹۰- منتخب اللباب: خافی خاں- ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ- ۱۸۶۹ء

۹۱- نزہۃ الخواطر (جلد ششم): سید عبدالحی حسنی لکھنوی - دائرۃ المعارف الاسلامیہ، حیدرآباد (دکن) ۱۳۷۶ھ - ۱۹۵۷ء

۹۲- نوائے معارک: عطا محمد شکارپوری - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۹ء

۹۳- مصفیٰ و مسوّیٰ شرح موطا: شاہ ولی اللہ دہلوی - جید برقی پریس، دہلی - ۱۳۴۶ھ

۹۴- عملِ صالح (شاہ جہان نامہ): محمد صالح کنبو - مجلس ترقی ادب، لاہور

۹۵- کشف الظنون: (دو جلد) حاجی خلیفہ - مطبعہ بہیہ، استنبول - جلد اوّل طبع ۱۹۴۱ء - ۱۳۶۰ھ، جلد ثانی طبع ۱۹۴۳ء - ۱۳۶۲ھ

۹۶- نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ: (جزء اوّل) ابو محمد عبداللہ بن یوسف حنفی زیلعی - طبع اوّل - ۱۳۵۷ھ - ۱۹۳۸ء

۹۷- واقعاتِ دار الحکومت دہلی: (حصۂ اوّل، دوم، سوم) بشیر الدین احمد دہلوی - شمسی مشین پریس، آگرہ - ۱۳۳۷ھ - ۱۹۱۹ء

۹۸- ہدیۃ العارفین اسماء المؤلفین و آثار المصنفین: (جلد اوّل) اسماعیل پاشا بغدادی مطبعہ بہیہ، استنبول - ۱۹۵۱ء

۹۹- ہدیۃ العارفین اسماء المؤلفین و آثار المصنفین: (جلد ثانی) اسماعیل پاشا بغدادی مطبعہ بہیہ، استنبول - ۱۹۵۵ء

۱۰۰- الیانع الجنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہٹی - مطبع صدیقی، بریلی - ۱۲۸۷ھ -

۱۰۱- شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: خلیق احمد نظامی - ادارہ اسلامیات، لاہور -

۱۰۲- روزنامہ امروز: لاہور، مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۰ء - مضمون، مولانا علم الدین سالک -

۱۰۳- ہفت روزہ الاعتصام: لاہور، مورخہ ۴ و ۱۱ مارچ ۱۹۵۵ء - مضمون فیض الرحمٰن الثوری۔

۱۰۴- ماہ نامہ ترجمان الحدیث، لاہور، بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء - مضمون ارشاد الحق اثری

۱۰۵- ماہ نامہ الحق: اکوڑہ خٹک، بابت ماہ جنوری ۱۹۷۸ء - مضمون ڈاکٹر سید سعید اللہ

۱۰۶- ماہ نامہ الرحیم: حیدرآباد، بابت ماہ اگست ۱۹۶۳ء - مضمون مخدوم امیر احمد